# فقہائے پاک و ہند

## تیرھویں صدی ہجری

### جلد اوّل

محمد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے پاک و ہند کی یہ پہلی جلد ہے ۔ اس میں برِ صغیر کے ۱۰۰ فقہا و علما کے حالات و سوانح معرضِ تسوید میں لائے گئے ہیں اور ان کی علمی و فقہی سرگرمیوں کے رخِ روشن کی نقاب کشائی کی گئی ہے ۔ یہ اس ملک کے سیاسی زوال کا وہ دور ہے جس میں دو آخری مغل بادشاہ باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی برائے نام — ! پھر اسی دور میں یہ ملک انگریزوں کے پنجۂ استبداد میں چلا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں آزادی کی تحریکیں نشو و نما پاتی ہیں ۔ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ع) سے پہلے سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل شہید کی تحریکِ جہاد ارضِ ہند میں ابھرتی ہے ۔ پھر ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد آزادی و حریت کی متعدد کوششیں ایک خاص اسلوب اور تسلسل کے ساتھ سامنے آتی ہیں ، جن میں علمائے کرام ہراول دستے کے طور پر نظر آتے ہیں ۔ مقدمۂ کتاب میں ان تمام مساعی کا مناسب انداز میں ذکر کیا گیا ہے ۔

قیمت : -/35 روپے

# فقہائے پاک و ہند

## تیرھویں صدی ہجری

### جلد اوّل

محمد اسحاق بھٹی

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل ۱۹۸۲

تعداد ۱۱۰۰

مطبع امپرنٹ، ایبٹ روڈ لاہور

ناشر محمد اشرف ڈار (معتمد)
اِدارہ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

ل

# فہرست مضامین

## الف

## ج



## ح

## خ



## د



## ذ



## ر



## ز

## س



## ش



## ص

# مقدّمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحمد اللہ! اب تک "فقہائے ہند" کی مجموعی طور پر سات جلدیں منظرِ اشاعت پر آ چکی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- جلد اوّل: پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک، کے علما و فقہا کے حالات پر مشتمل ہے۔

۲- جلد دوم: نویں صدی ہجری کے فقہائے عالی مقام کے علمی و فقہی کارناموں کو محیط ہے۔

۳- جلد سوم: دسویں صدی ہجری کے فقہائے کرام کے کوائف و سوانح کو محتوی ہے۔

۴- جلد چہارم حصہ اوّل: گیارھویں صدی ہجری کے اصحاب علم اور ارباب فقہ کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

۵- جلد چہارم حصہ دوم: یہ بھی گیارھویں صدی ہجری کے فقہا و علما کے سوانح حیات کا مجموعہ ہے۔

۶- جلد پنجم، حصہ اوّل: بارھویں صدی ہجری کے علمائے ہند کی فقہی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔

۷- جلد پنجم، حصہ دوم: اس میں بھی بارھویں ہجری کے ہندی فقہا کے سوانح حیات معرضِ بیان میں لائے گئے ہیں۔

اس طرح چوتھی اور پانچویں جلد کے دو دو حصوں کو ملا کر کل سات جلدیں ہوئیں، جن میں بغیر کسی مسلکی امتیاز کے ارضِ ہند کے فقہائے عظام کی علمی و فقہی تگ و تاز

کو حیطۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ فقہا کی اس طویل قطار میں برِ صغیر کے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، اہلِ حدیث اور شیعہ سب فقہا شامل ہیں اور ان کی علمی سرگرمیاں اپنی جگہ مسلّم اور لائقِ تحسین ہیں۔

ان میں سے ہر جلد پر مبسوط مقدمہ لکھا گیا ہے، جس میں مناسب انداز سے اس دور کے سیاسی حالات کی نقاب کشائی بھی کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس زمانے کے ملوک و سلاطین ان فقہائے عظام سے کتنے گہرے اور مخلصانہ مراسم و روابط رکھتے تھے اور ان کو کس درجے مستحقِ عزت و احترام گردانتے تھے۔

زیرِ مطالعہ جلد تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے علما و فقہا کے حالات و سوانح کو محتوی ہے۔ اگرچہ یہ پہلے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے، لیکن اس کے نام میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی ہے اور اسے "فقہائے پاک و ہند۔ تیرھویں صدی ہجری" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اب ہجری سنین کی دو صدیاں باقی ہیں، تیرھویں صدی اور چودھویں صدی۔ ان میں سے ہر صدی کے فقہائے عظام کا تذکرہ الگ الگ جلد میں کیا جائے گا۔ زیرِ مطالعہ کتاب تیرھویں صدی ہجری کی جلد اوّل ہے اور حروفِ تہجی کی ترتیب سے حرف الف سے شروع ہو کر حرف ظ پر ختم ہوتی ہے۔

سَو سال میں پھیلے ہوئے اس زمانے کو سیاسی اعتبار سے دورِ زوال اور عہدِ غلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں ہندوستان کی مغل حکومت کا آفتابِ اقتدار غروب ہو جاتا ہے اور اس ملک پر انگریز مسلّط ہو جاتے ہیں لیکن غلامی کے اس شر میں خیر کا ایک پہلو بھی پنہاں تھا، اور وہ یہ کہ اس صدی میں ملک میں بے شمار علما پیدا ہوئے، لاتعداد فقہا نے جنم لیا، جگہ جگہ دینی مدرسے قائم ہوئے، گاؤں گاؤں میں قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہونے لگیں اور پورے برِ صغیر میں اسلامی و دینی مراکز کا جال بچھ گیا۔ یعنی حکومت و اقتدار کے چھن جانے سے جو سیاسی خلا پیدا ہو گیا تھا، اس کو علم و علما کی کثرت نے پُر کر دیا۔

فقہائے ہند کی جلد پنجم کے حصۂ دوم کے مقدمے میں مغل حکمران عالم شاہ ثانی کے تذکرے پر بات ختم ہوئی تھی۔ یہ برائے نام بادشاہ تھا جو ۴ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۳ھ کو تختِ حکومت پر بیٹھا اور ۷ رمضان المبارک ۱۲۲۱ھ (۹ نومبر ۱۸۰۶ء) کو اس دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کو رخصت ہوا۔ اب صرف دو مغل حکمران ہندوستان کے افقِ سیاست پر باقی ہیں۔ ایک اکبر شاہ ثانی اور دوسرا بہادر شاہ ظفر۔ یہ محض نام کے بادشاہ تھے، حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ آئندہ سطور میں ان کے بارے میں مختصر واقعات درج کیے جاتے ہیں:

## اکبر شاہ ثانی

اس کا پورا نام ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی ہے۔ عالم شاہ ثانی کا بیٹا تھا۔ شب چہار شنبہ ۷ رمضان ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) کو پیدا ہوا۔ ماں کا نام مبارک محل تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اڑتالیس برس کی عمر میں ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ (۹ نومبر ۱۸۰۶ء) کو زمامِ اختیار ہاتھ میں لی۔ دورِ آخر میں اس کے باپ عالم شاہ ثانی کی حکومت شہر دہلی تک محدود تھی۔ لیکن بیٹے کا حلقۂ حکمرانی اس سے بھی سمٹ گیا تھا اور فقط قلعۂ معلّٰی کی چار دیواری تک اس کا اقتدار باقی رہ گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے اس وظیفہ خوار بادشاہ کو جو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، وہ بہت کم تھا۔ وظیفے میں اضافے کی درخواست کی، لیکن منظور نہ ہوئی۔ قلعۂ معلّٰی میں بادشاہ کُلّی اختیارات رکھتا تھا۔ اس میں انگریزی حکومت مداخلت نہیں کرتی تھی۔ شہر کے جرائم پیشہ لوگ قلعے میں جمع رہتے تھے، وہ گھروں سے مال چرا کر وہاں لے جاتے اور دھڑلے سے فروخت کرتے، بادشاہ کوئی باز پرس نہ کرتا، اس کے شاہانہ اخراجات پورا ہونے کا یہ بہت بڑا ذریعہ تھا۔ وہ ایک بے بس اور ناکارہ بادشاہ تھا اور اس کے زمانے میں انگریزوں کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

اکبر شاہ ثانی کا ایک بیٹا مرزا جہاں گیر تھا، جس نے ترنگ میں آکر انگریز ریزیڈنٹ

مسٹر آرچی بولڈ سٹین پر گولی چلادی تھی، اتفاق سے ریذیڈنٹ تو بچ گیا، مگر شہزادہ اس جرم میں پکڑا گیا اور الہ آباد میں قید کر دیا گیا، وہیں اس نے انتقال کیا اور اس کی نعش کو دہلی لا کر خواجہ نظام الدین اولیا کے قریب دفن کیا گیا۔

۱۸۰۹ء میں بادشاہ کی ذاتِ خاص اور خاندان کا وظیفہ بڑھا کر انگریزوں نے ایک لاکھ روپے کر دیا، جس سے اس نے شہر کی فصیل اور بعض عمارتوں کی مرمت کرائی۔

اس بادشاہ نے بتیس سال حکومت کی اور اسّی سال کی عمر میں ۲۸ / جمادی الاخریٰ ۱۲۵۳ھ (۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) کو وفات پائی۔ اپنے باپ شاہ عالم ثانی کے پہلو میں دفن ہوا۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی شہر کو بہت سے جلیل القدر علما کے گہوارے کی حیثیت حاصل تھی۔ مثلاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلی، شاہ عبدالقادر دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی، حضرت سید احمد شہید بریلوی، مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور بہت سے اہلِ علم اور اصحابِ فضل و کمال اس کے عہد میں موجود تھے۔

امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی تحریکِ جہاد اسی بادشاہ کے عہد میں شروع ہوئی اور پھر اسی کے عہد میں ان حضرات نے درجۂ شہادت پایا، اس تحریک کے بعد انگریزوں کے خلاف ملک میں یکے بعد دیگرے کئی تحریکیں شروع ہوئیں۔

اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ ظفر جلوہ آرائے تختِ دہلی ہوا، جو آخری مغل بادشاہ تھا۔ لیکن اس کا تذکرہ کرنے سے پہلے سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریکِ جہاد کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری ہے، کیوں کہ اس کی ابتدا اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ہوئی تھی۔

## سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے ہر لحاظ سے تکلیف اور اذیت کا زمانہ تھا۔ مذہبی، دینی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی تھی۔ جو لوگ مسلمانوں کی اس زبوں حالی اور ابتری سے بہت زیادہ متاثر اور پریشان ہوئے، ان میں حضرت سید احمد شہید بریلوی، مولانا محمد اسماعیل دہلوی اور ان کے رفقائے کرام کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ پاک باز لوگ اجتماعی طور سے میدانِ عمل میں نکلے اور پورے ملک میں پھیل گئے۔ انھوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا، ملک کے دیہات اور قصبات و بلاد میں گئے، لوگوں کی خاص قسم کی تربیت کی اور منظم طریقے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان کی ایک باقاعدہ تحریک تھی، جس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ مسلمان بدعات کو ترک کر دیں، ہندوانہ رسوم و رواج سے جو باہمی اختلاط کی وجہ سے ان میں گھر کر چکی تھیں، کنارہ کش ہو جائیں، امورِ شرک سے دست بردار ہو جائیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کی بنیادوں کو استوار کریں۔ نماز روزے کی پابندی کریں اور عقیدہ و عمل میں ہم آہنگی اور یکسانی پیدا کریں۔ کتاب و سنت کے احکام کو مشعلِ راہ بنائیں اور اسی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ دوسرا مقصد اس ملک سے انگریزی اثر و رسوخ کو ختم کرنا اور اس کے لیے باقاعدہ جہاد کرنا تھا۔ یہ دونوں مقاصد نہایت اہم اور بنیادی تھے۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے پوری جدوجہد کی اور برصغیر میں ایک تہلکہ بپا کر دیا۔

یہ اس ملک میں احیائے دین کی پہلی باقاعدہ تحریک تھی، جس کا اساسی نقطۂ نظر خالص کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت تھا اور جس کے ذریعے مسلمانوں کو دعوتِ جہاد دے کر غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان لوگوں نے ملک کو خیرباد کہا اور آرام و آسائش کی زندگی ترک کر کے اپنے

آپ کو بے پناہ تکلیفوں اور مصیبتوں کے حوالے کیا۔ خوشی اور مسرت کے ساتھ جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر، ان نفوسِ قدسیہ نے یہاں سے کوچ کیا اور سرحد پار کے علاقے کو جو انگریزوں کی دسترس اور غیر مسلموں کی عمل داری سے باہر تھا، اپنا مرکز قرار دے لیا۔

پہلا قافلہ جو پانچ اور چھ سو کے درمیان غازیوں پر مشتمل تھا، ۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء) کو امیر المجاہدین سید احمد شہید کی قیادت میں روانہ ہوا۔ ان کے پاس کل پانچ ہزار روپے کی رقم تھی، جسے زادِ راہ کہنا چاہیے۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت کی وجہ سے گزرنا مشکل تھا، لہٰذا یہ لوگ راجستان ہوتے ہوئے سندھ پہنچے، وہاں سے قندھار اور پھر کابل گئے۔ کابل سے روانہ ہو کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوئے اور آزاد قبائل کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس کے بعد برصغیر کے مختلف مقامات سے بکثرت مجاہدین وہاں پہنچنا شروع ہو گئے

مجاہدین کے اس مختصر سے قافلے نے جیسے ہی آزاد مرکز میں پڑاؤ ڈالا سکھوں کی فوج مقابلے کو نکل آئی اور لڑائی کا چیلنج دیا۔ یہ ہنگامی حالات تھے۔ چنانچہ نظم و ضبط قائم رکھنے اور مفتوحہ علاقوں کا انتظام سنبھالنے کے لیے ایک باقاعدہ نظامِ حکومت کی ضرورت محسوس کی گئی، اس لیے ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو ایک عارضی حکومت قائم کر دی گئی۔ سید احمد شہید اس حکومت کے امیر مقرر ہوئے۔ سید صاحب کے ہندوستانی رفقا کے علاوہ مقامی علاقے کے پٹھانوں نے بھی سید صاحب کی بیعت کی اور ان کی قیادت میں شریکِ جہاد ہونے کا اعلان کیا۔

سید صاحب کے رفقائے کرام کی اکثریت علمائے دین پر مشتمل تھی اور سلسلۂ جہاد کی زمامِ قیادت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ علما میں مولانا محمد اسماعیل دہلوی، مولانا عبدالحی، مولانا کرامت علی جون پوری، مولانا سید اولاد حسن قنوجی،

مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا سید محمد علی رام پوری، غرض بہت سے اہلِ علم اور اصحابِ فضل و کمال اس جماعت میں شامل تھے، جو محض اعلاءِ کلمۃ اللہ اور ملک سے انگریز کے اثر و اقتدار کو ختم کرنے کے لیے میدان میں اُترے تھے۔ لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ سکھ ان کے مقابلے میں نکل آئے اور ان سے مسلسل کئی شدید جنگیں ہوئیں، آخری مقابلہ بالاکوٹ کے میدان میں ہوا، جس میں ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو سید احمد بریلوی، مولانا محمد اسماعیل دہلوی اور بہت سے حضرات مرتبۂ شہادت کو پہنچے۔

بہرحال مقابلہ کسی سے ہو، سکھوں سے ہو یا انگریزوں سے، اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں فریق مسلمانوں کے دشمن تھے اور دونوں کا مطمحِ نظر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ معرکۂ بالاکوٹ کے بعد مجاہدین نے ہمیشہ انگریز کی مخالفت کی اور متعدد تحریکیں اس کے خلاف چلائیں۔ آزادی کی ان تحریکوں کی تفصیل ان شاء اللہ اس کتاب کی دوسری جلد میں بیان کی جائے گی۔

مجاہدین کی یہ تحریک ایک منظم اور باقاعدہ تحریک تھی، جس نے پورے سو سال (۱۹۴۷ء) تک انگریزی حکومت کو پریشان کیے رکھا اور بالآخر اس کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔

## شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ

تحریکِ مجاہدین کی بنیاد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا وہ فتویٰ تھا، جو انھوں نے انگریزوں کے خلاف جاری فرمایا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست و حکم رؤسائے نصاریٰ بے دغدغہ جاری است، و مراد از اجراءِ احکامِ کفر اینست کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبست رعایا و اخذِ خراج و باج و عشور اموالِ تجارت و سیاست قطاع الطریق و سراق و فیصل خصومات و سزائے جنایات کفار بطورِ حاکم باشند۔ آرے اگر بعضے احکامِ اسلام رامثل جمعہ، عیدین و اذان و ذبحِ بقر تعرض نکنند

نہ کردہ باشند، لیکن اصل اصولِ دریں چیز ہا نزد ایشاں ہباء و ہدر ست۔ زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمائند و، ہیچ مسلمان یا ذمی بغیر استیمانِ ایشاں دریں شہر و درنواح نمی تواند آمد و برائے منفعت خود از وار دین و مسافرین و تجار مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثلاً شجاع الملک و ولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد و ازیں شہر تا کلکتہ عمل نصاریٰ ممتد ست۔ آرے در چپ و راست مثل حیدر آباد، لکھنؤ و رام پور احکامِ خود جاری نہ کردہ اند، بسبب مصالحت و اطاعتِ مالکان آں[1]

یعنی یہاں رؤسائے نصاریٰ (عیسائی حکام) کا حکم بے جھجک و بے دھڑک جاری ہے اور ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظاماتِ رعیت، خراج و باج، عشر و مال گزاری، اموالِ تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے معاملات، مقدمات کے فیصلوں اور جرائم کی سزاؤں میں یہ لوگ خود ہی حاکم اور مختارِ مطلق ہیں۔ بے شک نماز جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور آزادی کی بنیاد ہے، وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں، عوام کی شہری آزادیاں ختم ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی مسلمان یا غیر مسلم ان کی اجازت و اطمینان کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف و جوانب میں نہیں آسکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی جو اجازت ہے وہ بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے مفاد کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص اور ممتاز و نمایاں حضرات مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتے تک انہی کی عمل داری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ، رام پور میں چوں کہ وہاں کے فرماں رواؤں نے اطاعت

---

[1] فتاویٰ عزیزیہ ج ۱ ص ۱۷

قبول کرلی ہے، براہِ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔

شاہ عبدالعزیز نے اس فتوے کے علاوہ ایک اور فتویٰ بھی جاری کیا تھا، جس میں دلائل سے ثابت فرمایا ہے کہ ہندوستان اب دارالحرب ہوگیا ہے [۵۲]

شاہ صاحب کے یہ دونوں فتوے اپنے مندرجات و مشمولات میں صاف اور واضح ہیں۔ ان کی رو سے بلاشبہ اُس زمانے میں ہندوستان دارالحرب تھا اور اس کی آزادی و حریت کے لیے انگریزی اقتدار سے جہاد ناگزیر تھا۔ چنانچہ سید احمد شہید اور ان کے رفقا نے انگریزوں سے جہاد کا آغاز کیا اور پھر سو سال تک یہ سلسلہ کسی نہ کسی انداز اور صورت میں جاری رہا۔ تاآں کہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی اقتدار ختم ہوگیا اور برصغیر پاک و ہند کو آزادی کی نعمت میسر آئی۔

## بنگال کی فرائضی تحریک

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے چند سال پیشتر بنگال میں "فرائضی" کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی۔ اس کے بانی مولانا شریعت اللہ تھے، جو ضلع فرید پور کے موضع بہادر پور کے رہنے والے تھے اور اٹھارہ سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ وہ بیس سال مکہ معظمہ میں مقیم رہے اور شیخ طاہر مکی شافعی سے استفادہ کیا۔ ۱۸۰۲ء میں وہ ہندوستان آئے اور ۱۸۰۴ء میں فرائضی جماعت کے نام سے بنگال میں مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہوئے اور رسوم و بدعات کی بیخ کنی کی تحریک شروع کی۔ مولانا شریعت اللہ نامور عالم دین اور سرگرم شخص تھے۔ ان کی تحریک کو بھی باقی تحریکوں کی طرح وہابیت کا نام دیا گیا۔ کاشت کاروں اور مزارعوں میں انھوں نے بالخصوص بہت کام کیا۔ وہ پیر اور مرید کے بجائے استاد اور شاگرد کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ الارض للہ ان کا نعرہ تھا، یعنی زمین اللہ کی ہے

---

[۵۲] فتاویٰ عزیزیہ ج ۱ ص ۱۰۵

اور جو شخص اس میں کام کرتا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ مولانا شریعت اللہ نے ۱۸۴۰ء میں وفات پائی۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حاجی محسن میاں نے فرائضی تحریک کی قیادت سنبھالی۔ بنگال کے عام مسلمان ان کو پیار سے دودھو میاں کے نام سے پکارتے تھے۔ باپ کی طرح یہ بھی سرگرم اور فعال کارکن تھے۔ فرائضی تحریک کے مقاصد میں انگریزوں کو بنگال سے نکالنا بھی شامل تھا۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں اور انگریزوں کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔

## نثار علی عرف ٹیٹو میر

جس زمانے میں سید احمد شہید بریلوی آزاد قبائل میں مصروف جنگ و جہاد تھے، اسی زمانے میں بنگال میں ایک شخص نثار علی نمایاں ہو کر اُبھرا، جو ٹیٹو میر کے عُرف سے معروف تھا۔ یہ شخص کاشت کار تھا اور ایک زمیندار کے گھر اس کی شادی ہوئی تھی۔ سید احمد بریلوی کا عقیدت مند تھا۔ ٹیٹو میر کاشت کاروں کا حامی تھا اور ہزاروں کاشت کار اس کے ساتھ تھے، جو ہندو زمینداروں کے جور و ستم سے تنگ آ چکے تھے۔

اسی زمانے (۱۸۳۱ء) میں موضع پورنا کے ایک زمیندار کشن رائے سے لوگ متعارف ہوئے۔ اس نے یہ عجیب و غریب ستم ڈھایا کہ اپنے ہر مسلمان کاشت کار پر جسے وہ وہابی کہتا تھا، ڈھائی روپے کا محصول لگا دیا اور اس میں مزید اشتعال اس طرح پیدا کیا کہ اس محصول کو وہ داڑھی کا ٹیکس کہہ کر وصول کرتا تھا۔ اپنے گاؤں میں تو اس نے یہ ٹیکس بغیر کسی جھگڑے کے وصول کر لیا، لیکن جب اس کے کارندے قریب کے گاؤں موضع سرفراز پور پہنچے تو وہاں اتفاق سے نثار علی عرف ٹیٹو میر اپنے معتقدین کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے کشن رائے کے کارندوں کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد فریقین میں سخت لڑائی ہوئی اور خوں ریزی تک نوبت پہنچی۔ بالآخر کچھ عرصے کے بعد ٹیٹو میر مارا گیا اور اس کی جمعیت منتشر ہو گئی۔

بنگال کی یہ دونوں تحریکیں انگریزوں اور ہندو زمینداروں کے خلاف تھیں۔

## بہادر شاہ ظفر

اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔ بہادر شاہ ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ (۲۵ اکتوبر ۱۷۷۵ء) کو پیدا ہوا تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر چونسٹھ اور پینسٹھ سال کے درمیان تھی۔ یہ تیموری نسل کا آخری بادشاہ تھا۔ ۲۸ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۳ھ (۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء) کو اس نے جو تاجِ شاہی سر پہ رکھا، وہ درحقیقت اس کی غلامی کا پیغام اور سلطنتِ مغلیہ کے اختتام کا اعلان تھا۔

بہادر شاہ ذاتی طور پر بہت اچھا بادشاہ تھا، پڑھا لکھا اور معقول و متوازن آدمی تھا۔ اس نے اپنے دادا شاہ عالم کی نگرانی میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ شاہ عالم کے مکحول البصر اور نابینا ہونے کا حادثہ اس کے سامنے پیش آیا۔ یہ مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور روہیلوں کی عداوت اور چیرہ دستی سے باخبر تھا۔ اس کے دادا نے انگریزوں کی ماتحتی اور سرپرستی قبول کرلی تھی۔ اس کے باپ اکبر شاہ ثانی نے بھی انگریزوں کے اقتدار کو تسلیم کرلیا تھا اور یہ بادشاہ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے، جو صرف نام کے بادشاہ تھے، کسی معاملے میں انھیں کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ ان کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ سال گرہ اور نوروز وغیرہ کے موقعے پر گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے بادشاہ کو جو نذر پیش کی جاتی تھی، وہ ۱۸۴۳ء میں لارڈ ایلن برا نے حکماً بند کردی تھی اور بادشاہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ سکّے پر فرمائے دہلی کا نام نقش ہوتا تھا، وہ اس سے قبل ۱۸۳۵ء میں بند ہوچکا تھا۔ گورنر جنرل کی مہریں "فدوی خاص بادشاہ" کے الفاظ کندہ تھے، وہ مہر سے خارج کیے گئے۔ ہندوستان کے رؤسا و امرا کو بھی ہدایت کردی گئی تھی کہ ان کی مہروں میں بادشاہ کی عزت و تکریم سے متعلق اس قسم کے جو الفاظ درج ہیں، وہ نکال دیے جائیں۔

بہرحال بہادر شاہ ظفر ایک بے بس بادشاہ تھا اور اس کی زندگی مرقع عبرت تھی۔ اس کی داستانِ مظلومیت بہت طویل اور دردناک ہے۔ اس کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی شروع ہوئی جس کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترکہ جدوجہد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جسے ہندوستانیوں کی ناکامی کے بعد انگریزی حکومت نے "غدر" کے نام سے موسوم کیا۔

## ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی اور اس کے اسباب و وجوہ

موقع کی مناسبت سے یہاں اس کے بارے میں چند باتیں بیان کی جاتی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے اسباب و وجوہ کیا تھے اور اہلِ ہند اس خطرناک اور بڑے اقدام پر کیوں مجبور ہوئے؟

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا آغاز میرٹھ سے ہوا۔ ۱۱ مئی کی صبح کو میرٹھ کی دیسی فوج دہلی پہنچی اور بہادر شاہ، مغل شہزادوں اور لال قلعہ کے اربابِ اختیار کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر سے انگریز کو نکالنے کے لیے میدانِ جنگ میں اتریں۔ بہت جلد اس کے اثرات تمام ملک میں پھیل گئے اور اس کی ہمہ گیری و وسعت پذیری نے جہاں ہندوستانی فوج پر بے پناہ اثر ڈالا، وہاں علما، عوام، نواب اور جاگیردار بھی حالات کی رفتار سے مجبور ہو گئے کہ شمشیر بکف ہو کر میدانِ مبارزہ میں نکلیں۔ چنانچہ چند ہی روز میں ہر طبقہ و خیال کے لوگ آمادۂ پیکار ہو گئے اور سب نے ملک کو انگریز کے وجود سے پاک کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔

بے شک ان سب کی تکلیفیں مختلف تھیں اور مصائب و مشکلات جداگانہ تھے لیکن واقعات کے دھارے نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا تھا کہ انگریز کے خلاف سب متفق اللسان اور متحد الخیال تھے۔

دیسی فوج کو مثلاً یہ شکوہ تھا کہ انگریزی فوج کے مقابلے میں ان کی تنخواہیں بہت کم تھیں اور یہ ان تمام مراعات سے محروم تھے جو انگریزی فوج کو حاصل تھیں۔ حالاں کہ اطاعت شعاری، وفاداری اور دشمن سے معرکہ آرائی میں دیسی فوج ہمیشہ

پیش پیش رہتی تھی اور اس کا اعلیٰ انگریزی افسروں کو بھی اعتراف تھا۔ علاوہ ازیں کسی اونچے اور ذمہ دارانہ عہدے پر کوئی ہندوستانی فائز نہیں تھا۔ ہر جگہ انگریز چھائے ہوئے تھے، جب کہ بے شمار ہندوستانی فوجی نہایت قابل تھے۔ ان کی فوجی خدمات بہت پرانی تھیں اور ان کا سابقہ ریکارڈ عمدہ تھا۔ مگر انگریزی حکومت اور انگریز اعلیٰ حاکم ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور ان کو بلند مناصب پر متعین کرنا انھیں منظور نہیں تھا۔ پھر چربی والے کارتوسوں کو استعمال کرنے کا جبری حکم ان کے لیے مزید باعثِ اہانت تھا۔

علمائے کرام اور مذہبی و دینی عناصر انگریزی عمل داری سے اس لیے نالاں تھے کہ انگریز براہِ راست مذہب میں دخیل ہونے لگا تھا۔ پادریوں کا ایک جال ملک میں بچھا دیا گیا تھا جس کا مقصد اہلِ ہند کو وسیع پیمانے پر عیسائی بنانا تھا، تاکہ اس ملک میں عیسائی حکومت کے خلاف کوئی شورش بپا نہ ہو سکے، اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ملک کی بہت بڑی آبادی حلقہ بگوشِ عیسائیت ہو جاتی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے یہاں بڑے بڑے اور معروف پادری بھیجے گئے جنھوں نے اپنے مذہب کی پوری بے باکی اور جرأت سے تبلیغ کی۔ بالخصوص اسلام پر ایسے شدید حملے کیے اور اتنی سخت نکتہ چینی کی کہ کوئی خود دار اور دین دار آدمی اس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

نوابوں اور جاگیرداروں پر یہ مصیبت ٹوٹ پڑی تھی کہ ان کی ریاستیں چھینی جا رہی تھیں اور جاگیروں پر قبضہ کیا جا رہا تھا۔ ان میں سے بعض کو اتنے قلیل اور محدود وظیفے دیے گئے کہ ان کا معمولی گزارا تک مشکل ہو گیا۔ یہ اپنی جگہ بااختیار اور ریاستوں کے مالک تھے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال کسی طرح ان کے لیے موجبِ اطمینان اور باعثِ سکون نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ لوگ اس وقت تک خاموش تھے اور خاموش رہے جب تک حالات سازگار نہیں تھے، جوں ہی حالات نے پلٹا کھایا اور انگریزی حکومت اور اس کی پالیسی کے خلاف ایک عام

حرکت پیدا ہوئی، یہ ہاتھ میں تلوار پکڑ کر میدان میں آگئے۔

برصغیر کے مسلمان بالخصوص انگریز سے بغض و عناد رکھتے تھے۔ کیوں کہ انگریز نے براہِ راست مسلمانوں ہی سے حکومت چھینی تھی اور مسلمان ہی اس کی تیغِ ستم کا اوّلین ہدف تھے۔ اس سے قبل انگریز کے ہاتھوں سراج الدولہ کے بے رحمانہ قتل اور سلطان ٹیپو کی شہادت کا حادثۂ ہائلہ بھی نوکِ شمشیر سے تاریخِ ہند کے صفحات میں نقش ہو چکا تھا، اور اب دلی کے لال قلعے میں تیمور کا وارث انگریز کی مکارانہ اور جابرانہ حکمتِ عملی سے مجبور و بے بس ہوا بیٹھا تھا۔ اقتدار و اختیار کی باگ ڈور مغلوں کے قبضے سے نکل کر کمپنی بہادر کے ہاتھ میں منتقل ہو چکی تھی اور مسلمان اپنی آنکھوں کے سامنے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ اس شدید ضرب کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہیں کیا۔ ان کی حمیّت بیدار ہوئی، غیرت نے جوش مارا اور اپنے اہلِ وطن کے اشتراک سے انگریز کے جبر و قہر سے پنجہ آزمائی شروع کر دی۔

غرض ایک عمومی بے چینی اور ہمہ گیر اضطراب تھا جس نے ملک کے ہر طبقہ و خیال کے لوگوں کو جھنجھوڑا اور ان کو انگریزی حکومت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔

## جہاد کا فتویٰ اور اس کے لائق احترام مفتی

ملک کے عوام و خواص کے ساتھ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں علما نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انگریزی حکومت کے خلاف فتویٰ جاری کیا، جس میں جہاد کو فرض ٹھہرایا گیا۔ یہ فتویٰ ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کے بعد جاری ہوا، جب کہ جنرل بخت خاں دہلی پہنچا۔ اس نے دہلی آنے کے فوراً بعد وہاں کے علمائے کرام کو جامع مسجد میں جمع کیا اور جہاد کا فتویٰ مرتب کرایا۔ یہ فتویٰ اس زمانے کے اخبارات "ظفر الاخبار" اور "صادق الاخبار" میں شائع ہوا۔ اس فتوے کے الفاظ یہ ہیں:

" استفسا: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب انگریز جو دلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں، اس صورت میں اب اس شہر والوں پر

جہاد فرض ہے یا نہیں، اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں ؟ اور وہ لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں، ان کو بھی جہاد کرنا چاہیے یا نہیں ؟ بیان کریں، اللہ آپ کو اجر دے گا۔"

"جواب : درصورتِ مرقوم فرضِ عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے، اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے، چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے بسبب کثرتِ اجتماعِ افواج کے، اور مہیّا اور موجود ہونے آلاتِ حرب کے، تو فرضِ عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرضِ کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرضِ عین ہو جائے گا، اور اسی طرح اسی ترتیب سے سارے اہلِ زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہو جائے گا۔ اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور غارت اور قتل کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا، بشرط ان کی طاقت کے"۔

اس فتوے پر چونتیس[۳۴] علمائے کرام کے دستخط ہیں، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) مولانا نور جمال (۲) مولانا محمد (۳) مولوی عبدالکریم (۴) مولانا سکندر علی (۵) مولانا سید نذیر حسین دہلوی (۶) مولانا رحمت اللہ (۷) مفتی صدر الدین آزردہ (۸) مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی (۹) مولانا محمد ضیاء الدین (۱۰) مولانا عبدالقادر لدھیانوی (۱۱) مولانا شاہ احمد سعید مجددی (۱۲) مولانا محمد منیر خاں (۱۳) مولانا شاہ عبدالغنی مجددی (۱۴) مولانا محمد علی (۱۵) مولانا فرید الدین (۱۶) مولانا محمد سرفراز علی (۱۷) سید محبوب علی جعفری (۱۸) مولانا ابو حامد محمد حامی الدین (۱۹) سید احمد علی (۲۰) مولوی الٰہی بخش (۲۱) مولانا محمد کریم اللہ (۲۲) مولوی سعید الدین (۲۳) مولوی محمد مصطفےٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی (۲۴) مولوی محمد انصار علی (۲۵) مولانا حفیظ اللہ خاں (۲۶) مولانا محمد نور الحق (۲۷) مولوی محمد ہاشم (۲۸) مولوی حیدر علی (۲۹) مولانا سیف الرحمٰن لدھیانوی (۳۰) سید محمد (۳۱) مولوی محمد امداد علی

(۳۲) سید عبدالحمید (۳۳) مفتی محمد رحمت علی خاں (۳۴) قاضی محمد علی حسین[۳۱]
یہی علمائے کرام تھے، جنھوں نے فتوئ جہاد پر دستخط کیے، ان کے علاوہ اور کسی کے دستخط نہیں تھے۔ عبدالشاہد خاں شروانی نے "باغی ہندوستان" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دہلی کی جامع مسجد میں علما کے سامنے یہ فتوی مولانا فضل حق خیر آبادی نے پیش کیا تھا اور مختلف علما نے اس پر دستخط کیے۔ الفاظ یہ ہیں:

علامہ (فضل حق) سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ شورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کر دیے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔[۴۲]

اس سے پہلے صفحے پر لکھتے ہیں کہ علامہ فضل حق اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے دہلی پہنچے۔[۵۲] ڈاکٹر محمد ایوب قادری اپنی تصنیف "جنگ آزادی ۱۸۵۷" میں عبدالشاہد خاں شروانی کی اس "روایت" کو "گھڑی ہوئی روایت" قرار دیتے ہیں۔[۶۲] وہ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالشاہد خاں شروانی نے یہ حکایت معلوم نہیں کہاں سے وضع کی ہے۔ جہاد کے فتوے پر مولانا فضل حق خیر آبادی، قاضی فیض اللہ، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں اور سید مبارک شاہ رام پوری میں سے کسی کے دستخط بھی نہیں ہیں۔ مولوی فضل حق خیر آبادی تو وسط اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے تھے۔ اس وقت یہ فتوی مشتہر ہو چکا تھا، لہٰذا ان کے دستخط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[۷۲]

---

[۳۱] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۴۰۵، ۴۰۶

[۴۲] باغی ہندوستان ص ۱۴۱ [۵۲] ایضاً ص ۱۴۰

[۶۲] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۴۰۳ [۷۲] ایضاً ص ۴۰۴

بہرحال جہاد کے فتوے پر صرف ان چونتیس علما کے دستخط ثبت تھے، جن کے اسمائے گرامی پہلے گزر چکے ہیں۔

جب جنرل بخت خاں اور اس کے ساتھی وارد دہلی ہوئے تو یہ شہر وہابی مجاہدین کا مرکز قرار پاگیا اور وہابی وہاں جمع ہونے لگے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسال دار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبد الغفار اور مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا، اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا سرگرم کارکن اور امام المجاہدین اس کا معاون ہوا۔[۵۵]

## جنگِ آزادی میں علما کا حصہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں علمائے کرام نے بھرپور حصہ لیا اور استخلاصِ وطن کے لیے میدانِ عمل میں نکلے۔ ان علمائے کرام میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جنھوں نے فتویٰ جہاد مرتب فرمایا اور اس پر دستخط کیے۔ وہ بھی ہیں جن کا شمار مرتبین فتویٰ کے تلامذہ و معتقدین میں ہوتا ہے اور وہ بھی ہیں جو ان کے برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ علما کی اس وسیع فہرست میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا عبد الجلیل علی گڑھی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی، مولوی ایوب خاں کیفی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔

ان علمائے کرام میں سے بعض حضرات نے درجۂ شہادت پایا، بعض کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا اور بعض کو کالے پانی بھیجا گیا۔ بعض ہجرت کرکے حجاز مقدس چلے گئے۔ یہ اسلام کے شیدائی، آزادی و حریت کے پروانے اور دین کے سچے جاں نثار

---

۵۵ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ (واقعات و شخصیات) ص ۴۰۸

تھے۔ ملک وملت کے لیے انھوں نے جو مساعیِ جمیلہ انجام دیں وہ ہمیشہ کے لیے تاریخ کے سینے میں محفوظ ہوگئی ہیں۔ ان میں سے ہر عالم کے حالات اس کتاب میں اصل مقام پر بیان ہوں گے، البتہ چند بزرگوں کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے۔

**مولانا فضل حق** : اپنے عصر کی ممتاز شخصیت تھے، جلیل القدر عالم، درس و تدریس میں یگانۂ روزگار اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ معقولات و منقولات میں گہری نظر تھی، سیاسیات سے کنارہ کش رہتے تھے، لیکن ۱۸۵۷ء میں انگریز کی مخالفت کے بعض محرکات و اسباب ان کو بھی میدان میں لے آئے۔ مدلل و مبرہن گفتگو کرتے اور ہندوستان کے مشاہیر علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ گرفتاری کے بعد عبور دریائے شور کی سزا دی گئی اور ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ (۹ اگست ۱۸۶۱) کو وہیں انتقال کیا۔ حاشیہ شرح سلم، الہدیۃ السعیدیہ، رسالہ علم و معلوم، الثورۃ الہندیہ، رسالہ تشکیک ماہیات اور امتناعِ نظیر وغیرہ ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

**مولانا لیاقت علی** : ضلع الٰہ آباد (یوپی) کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کا حلقۂ ارادت بہت وسیع تھا۔ اپنے مریدوں کو ہمیشہ جہاد کی تلقین و ترغیب فرماتے۔ انگریزوں کے خلاف انھوں نے مختلف اشتہارات شائع کیے جو فوج اور عوام میں بہت بڑی تعداد میں تقسیم کیے گئے۔ ان اشتہارات کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف لوگوں میں بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ نہایت دلیر اور جری بزرگ تھے۔ بالآخر گرفتار ہوئے اور انڈمان بھیج دیے گئے، وہاں پہنچنے کے چند روز بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

**مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی** : اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک اور بہت منتظم و قابل شخص تھے۔ ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں اِن کی خدمات ہمیشہ نمایاں رہیں، ان کی بے پناہ سرگرمیوں کا بڑے بڑے انگریزوں نے اعتراف کیا اور انھیں خراجِ تحسین ادا کرنے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے تھے اور ایک عرصے سے انگریز کے خلاف فضا ہموار کر رہے تھے، فوج میں ان کی خفیہ کوششوں،

کا سلسلہ جاری تھا اور یہ اہم ذمے داری انھوں نے متعدد معتبر افراد کے سپرد کر رکھی تھی۔ انگریز مورخین کا بیان ہے کہ یہ ان کے خلاف جگہ جگہ وعظ کہتے اور ان کے اقتدار کی بنیادیں متزلزل کرنے میں کوشاں رہتے۔ کہیں اپنے اصلی لباس اور وضع و ہیئت میں پہنچے اور کہیں فقیروں کے بھیس میں گئے، ہر جگہ انگریز کی مخالفت کی۔ اس مردِ مجاہد کو شاہ جہان پور سے شمال مشرق میں اٹھارہ میل دور راجا پوائیں جگن ناتھ کے بھائی نے گولی مار کر اس وقت شہید کر دیا تھا، جب کہ وہ ہاتھی پر سوار تھے اور اس کی دعوت پر پوائیں گئے تھے۔ اس بزدل اور دغا باز راجا نے خود ہی ان کو اپنے ہاں بلایا تھا، اس میں انگریز کے خلاف جنگ کرنے کی جرأت تو نہ تھی، البتہ اس شجاع و جری مجاہد کو ختم کر دیا۔

**مولانا رحمت اللہ کیرانوی** : کیرانہ ضلع مظفر نگر کے باشندے تھے۔ نیک نفس اور متدین بزرگ تھے۔ انگریزوں سے ان کو عداوت تھی، عیسائی لٹریچر پر بہت عبور تھا۔ بڑے بڑے نامور پادری ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔ ان کا فیصلہ کن مناظرہ مشہور پادری فنڈر سے رجب ۱۲۷۲ھ (مارچ ۱۸۵۶ء) کو آگرے میں ہوا، جس میں پادری مذکور نے شکست کھائی اور اس شکست سے وہ اتنا بددل ہوا کہ اس کے بعد اسے ہندوستان میں رہنے کی جرأت نہیں ہوئی اور انگلستان چلا گیا۔

اضطرابِ میرٹھ کے بعد بغاوت کے آثار مظفر نگر پہنچے تو گرد و پیش کے لوگوں نے مولانا کو اپنا سالار مقرر کر لیا اور انگریز کے خلاف دادِ شجاعت دی۔ انگریز کامیاب ہوئے تو مولانا کی تلاش شروع ہوئی، نہ ملے تو گرفتاری کا اشتہار دیا گیا، سراغ لگانے اور گرفتار کرانے والے کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا، لیکن مولانا ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ ۲۲ رمضان ۱۳۰۸ھ (۲ مئی ۱۸۹۱ء) کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ ہجرت سے کافی عرصہ بعد ۳۰ جنوری ۱۸۶۴ء کو انگریزی حکومت نے ان کی جائیداد ضبط کر لی تھی۔

## نوابوں اور تعلقہ داروں کی شرکت

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں علمائے دین اور فوجیوں کے علاوہ نوابوں، تعلقہ داروں، راجوں اور عام اصحابِ اثر و رسوخ نے بھی شرکت کی اور آزادیِ وطن کے لیے آمادۂ پیکار ہوئے۔ ان حضرات میں مسلمان بھی شامل ہیں اور مرہٹے بھی، اور ان کے مشترکہ عمل و سعی کی داستان بہت طویل ہے۔ یاد رہے اس سے قبل مرہٹے ہمیشہ مغل حکومت کے مخالف رہے تھے، لیکن اب وہ مغلوں کے حامی اور ان کے دشمنوں کے حریف تھے۔ اس گروہِ باہمت میں شہزادہ فیروز شاہ، تانتیا ٹوپے، نواب علی بہادر، نواب تفضل حسین، خان بہادر خاں، ڈھونڈو پنت نانا، عظیم اللہ خاں، رانی لکشمی بائی (جھانسی)، راجا کنور سنگھ اور نواب محمود خاں بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر الفاظ میں یہاں ان کا تعارف کرا دیا جائے۔

۱۔ **شہزادہ فیروز شاہ**: مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا، مذہبی امور کی طرف اس کا زیادہ رجحان تھا، اوراد و وظائف سے بہت شغف تھا۔ ۱۸۵۶ میں وہ حج کے لیے گیا، واپس آیا تو ۱۸۵۷ کا ہنگامہ شروع تھا۔ شہزادے نے بھی اس میں حصہ لیا اور مختلف معرکوں میں مجاہدین کے ساتھ دادِ شجاعت دیتا رہا۔ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، تانتیا ٹوپے، نانا راؤ اور ان کے رفقا کی معیت میں مصروفِ جنگ رہا۔ تحریکِ آزادی کی ناکامی کے بعد اس کے متعلق کئی روایتیں مشہور ہوئیں۔ ایک روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ایران اور روس ہوتا ہوا حجاز پہنچ گیا تھا، وہاں مکہ معظمہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ تھانوی، مولانا محمد یعقوب دہلوی، مولانا محمد اسحاق دہلوی اور مولانا محمد مظہر مجددی وغیرہ نے لوگوں کی اصلاح و ہدایت کی غرض سے ایک جماعت قائم کی تھی، شہزادہ فیروز شاہ بھی اس میں شامل ہو گیا تھا — ایک روایت کے مطابق اپریل ۱۸۶۸ میں جماعتِ مجاہدین کے امیر مولانا عبد اللہ کے ساتھ باج کٹھ (علاقہ بونیر سرحد آزاد) میں مقیم ہوا — ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۰۶ء میں شہزادہ مذکور زندہ تھا۔ غرض شہزادہ فیروز شاہ مردِ مجاہد

اور راسخ عزم و ارادے کا مالک تھا۔

۲۔ تانتیا ٹوپے: ایک بہادر مرہٹہ جرنیل تھا۔ اس کا اصلی وطن تو علاقہ ناسک کے ضلع پٹورہ میں ایک گاؤں تھا، لیکن کان پور کے متصل بٹھور میں ڈھونڈو پنت نانا کے پاس مقیم تھا اور نانا کا مصاحب و ندیم تھا۔ اس بہادر جرنیل نے متعدد مقامات میں انگریز کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، لکشمی بائی رانی جھانسی اور نانا کے ہم رکاب ہو کر شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھائے اور ہر میدان میں انگریزی فوج کو زک پہنچائی۔ رانی جھانسی کے مارے جانے کے بعد وہ بہت سے مقامات میں گھومتا رہا اور انگریزی حکومت گرفتاری کے لیے اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اس اثنا میں گوالیار کے ایک ماتحت رئیس مان سنگھ سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ مان سنگھ کی مہاراجا گوالیار سے چپقلش ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ مہاراجا کے خلاف لڑائی کرنا چاہتا تھا اور جنگل میں چھپا بیٹھا تھا۔ تانتیا بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا اور دونوں میں دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ جب انگریزی حکومت کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو اس نے مان سنگھ سے گفتگو کی اور مہاراجا گوالیار سے اس کی صلح کرا دینے کا وعدہ کیا اور پھر آہستہ آہستہ اس کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ تانتیا کو گرفتار کرا دے گا۔ چنانچہ ۷ اپریل ۱۸۵۹ کو نصف رات کے وقت مان سنگھ نے دھوکے سے تانتیا کو گرفتار کرا دیا۔ انگریزی حکومت کا جو دستہ اسے گرفتار کرنے آیا، مان سنگھ اس کے ساتھ تھا۔ یہ دستہ تانتیا کو گرفتار کر کے ۸ اپریل کی صبح کو فوجی کیمپ میں لے گیا۔ مان سنگھ کو اس "خدمت" کے صلے میں ایک جاگیر عطا کی گئی۔ اسی جاگیر میں انگریزوں کی فوجی عدالت میں تانتیا پر مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸ اپریل ۱۸۵۹ کو سیپری کے مقام پر اس کو پھانسی دے دی گئی۔ اس وقت جنرل تانتیا کی عمر پینتالیس برس کی تھی۔

۳۔ نواب علی بہادر: یوپی کی ایک ریاست باندہ کا نواب تھا۔ جب

کان پور میں انگریزوں کے خلاف ہنگامہ ہوا تو کچھ فوجی اس کے پاس آئے اور انگریزوں کی مخالفت میں لوگوں کو مشتعل کیا۔ خود علی بہادر کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، شرافتِ نفس کی بنا پر ابتدا میں تو ان کے ساتھ جانے سے یہ پس و پیش کرتا رہا لیکن بعد کو باقاعدہ انگریزی حکومت کے خلاف جنگ میں کود پڑا۔ جب انگریزی فوج باندہ پہنچی تو یہ کالپی چلا گیا۔ وہاں تانتیا ٹوپے اور رانی جھانسی کی معیت میں انگریز سے معرکہ آرا ہوا۔ شکست کے بعد رُوپوش ہو گیا۔ ۱۸۵۸ء میں جب انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ نے اعلانِ معافی جاری کیا تو نواب علی بہادر نے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا، لیکن انگریزوں نے اس کو معافی دینے کے بجائے اس کی ریاست چھین لی اور اسے اندور میں نظر بند کر دیا۔ تین سو روپے ماہانہ اس کا وظیفہ مقرر ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں نواب علی بہادر نے اندور ہی میں وفات پائی۔

۴۔ خان بہادر خاں : خاندانی طور پر ریاست کا مالک تھا، لیکن اب ریاست ختم ہو چکی تھی اور بریلی میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھا۔ ۱۸۵۷ء میں پنشن پا رہا تھا اور عمر ستر سال کی تھی۔ روہیل کھنڈ کا علاقہ کسی زمانے میں اس کے خاندان کے زیرِ نگیں رہ چکا تھا، اس لیے وہاں کے باشندے اس کی بہت تکریم کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کے شعلے جب ہر جانب بھڑک اُٹھے تو بریلی بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا اور جنرل بخت خاں کی کوشش سے اس علاقے کے انتظامات اس بوڑھے نواب کے سپرد کر دیے گئے۔ اس کبر سنی میں بھی یہ نہایت منتظم، بہادر اور پُرجوش تھا۔ پورے علاقے کے نظم و نسق کو اس نے مستحکم کر لیا تھا۔ اس کی فوج میں ایک ایسا جیش بھی تھا جس کے سب افراد نے یہ قسم کھا رکھی تھی کہ میدانِ جنگ میں ڈٹے رہیں گے تاوقتیکہ خود مر جائیں یا دشمن کو مار ڈالیں۔ یہ سب بوڑھے فوجی تھے لیکن بڑے وجیہ اور بارُعب تھے۔ ان کی داڑھیاں سفید ہو چکی تھیں، ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں جن پر قرآن کی آیتیں نقش تھیں۔ وہ دشمن پر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حملہ کرتے

تھے، ان کے گھوڑے بہت تیز رو تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ انگریزی فوج کے مددگار پنجابی سکھوں پر ایسا شدید حملہ کیا کہ وہ ان کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے۔

خان بہادر خاں جواں مردی سے لڑا اور دشمن کا یامردی سے مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۹ء میں کوہستانِ نیپال کی ایک لڑائی میں اتفاق سے گھوڑے پر سے گر پڑا اور گرفتار ہوگیا۔ کمشنر لکھنؤ کے سامنے پیش کیا گیا تو زمین پر بیٹھ گیا۔ کرسی پیش کی گئی تو کہا، ہمیشہ کرسی پر بیٹھے، اب قیدی ہیں تو قیدیوں کی جگہ بیٹھنا چاہیے۔ کمشنر لکھنؤ نے بزور کرسی پر بٹھایا۔ فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھانسی دینے کے لیے اسے لکھنؤ سے بریلی لایا گیا۔ منقول ہے کہ جب اس کو پھانسی دینے لگے تو کہا گیا کہ کوئی وصیت کرنی ہو تو کرلو۔ جواب دیا، کوئی وصیت نہیں، اور یہ شعر پڑھا:

بہ جرم کلمہ حق می کشند غوغائیست　　ز مرگ زندگیم می شود تماشائیست

پھانسی کے بعد نعش وارثوں کے حوالے کرنے کے بجائے بریلی کی ڈسٹرکٹ جیل میں دفن کردی گئی۔ خان بہادر کی مہر پر الحکم للہ والملک للہ کے الفاظ کندہ تھے۔

۵۔ عظیم اللہ خاں : ایک باتدبیر اور صاحب الرائے شخص تھا۔ کان پور کا رہنے والا تھا۔ انگریزی کی مخالفت اس کا وظیفہ حیات تھا۔ ڈھونڈو پنت (نانا راؤ) کا معتمد علیہ اور مشیر تھا۔ اس کی وکالت کے سلسلے میں انگلستان بھی گیا تھا۔ انگریز سے دشمنی کی آگ اس کے سینے میں ہمیشہ مشتعل رہی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف ترکوں نے قسطنطنیہ میں جو محاذ جنگ قائم کر رکھا تھا، اس نے بھی دلچسپی کے ساتھ دیکھا تھا اور یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ ہندوستان میں ہم بھی انگریز کو شکست دے سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران کئی محاذوں پر لڑا اور انگریزی فوج کو ہزیمت سے دوچار کیا۔ لکھنؤ میں مولانا احمد اللہ

شاہ مدراسی کے ساتھ بھی رہا۔ تحریکِ آزادی کی ناکامی کے بعد نیپال چلا گیا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں وہیں انتقال کیا۔

۶۔ ڈھونڈو پنت نانا: ایک دلیر اور ہمت ور مرہٹہ تھا۔ ریاست کا مالک تھا جسے انگریزوں نے ضبط کر لیا تھا اور کان پور سے متصل بٹھور میں سکونت پذیر تھا۔ ریاست کی واپسی کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں شرکت کی اور انگریزوں سے لڑا۔ عظیم اللہ خاں اور تانتیا ٹوپے اس کے خاص مشیر و مصاحب تھے۔ جنگ کے متعدد محاذ قائم کیے، کہیں شکست کھائی اور کہیں فتح یاب ہوا۔ آخر میں حضرت محل کے پاس لکھنؤ گیا، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی بھی وہیں تھے۔ حضرت محل نے اس کا شاہانہ استقبال کیا اور بہت عزت و احترام سے جگہ دی۔ تسخیرِ لکھنؤ کے بعد نیپال چلا گیا تھا اور فقیرانہ اور درویشانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔

۷۔ کنور سنگھ: صوبہ بہار کے ضلع جگدیش پور کا راجپوت رئیس تھا۔ انگریزوں نے اس پر مالیے کے بعض مقدمات دائر کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے زمانے میں اس کی عمر اسّی سال کی تھی۔ آزادیِ وطن کی خاطر اس بوڑھے بہادر نے تلوار ہاتھ میں لی اور تادمِ مرگ اُسے سنبھالے رکھا۔ باتدبیر اور فہیم شخص تھا۔ انگریز جرنیل اس کی جنگی تدبیروں سے خوف زدہ رہتے تھے۔ ایک دفعہ اپنی فوج کے ساتھ دریائے گنگا عبور کر رہا تھا کہ انگریزی فوجیں آ پہنچیں اور گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ایک گولی اس کی کلائی پر لگی۔ زخم بہت شدید تھا، لیکن میدانِ جنگ میں علاج کی کوئی صورت نہ تھی۔ جب گنگا پار کر چکا تو زخمی کلائی پر زور سے تلوار ماری اور اسے کاٹ ڈالا۔ کلائی کو دریائے گنگا میں پھینکتے ہوئے گنگا سے مخاطب ہو کر کہا ــــ "ماتا! اپنے سپوت کی اس آخری قربانی کو شرف قبول عطا کر۔"

اسی حالت میں تین روز تک لڑتا رہا اور آرہ کے معرکے میں فتح یاب ہوا۔

لیکن کلائی کے زخم کی تکلیف نے اتنی شدت اختیار کرلی تھی کہ تین روز بعد میدانِ جنگ میں اس کا انتقال ہوگیا۔

بہرحال ۱۸۵۷ء کی جنگِ حریت عوامی اور ملک گیر تھی۔ اس میں سکھوں کے سوا سب نے حصہ لیا۔ سکھ نہ صرف خاموش اور الگ رہے، بلکہ ناکامی کے بعد انگریز کے ساتھ مل کر انھوں نے قتل و غارت کی انتہا کردی، پنجاب کی سکھ ریاستوں کے سربراہوں نے جن میں پٹیالہ، نابھہ، جیند اور فرید کوٹ کے سکھ رئیس شامل تھے، دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

بعد کو ہندوؤں نے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی تھی، تنہا مسلمان میدان میں رہ گئے تھے اور پھر یہی انگریز کا نشانۂ ستم بنے۔ ہندو آخر میں چوں کہ انگریزی حکومت کے معاون ہوگئے تھے، اس لیے فتح دہلی کے بعد جب لوگوں کو دوبارہ ان کے گھروں میں بسانے کا مسئلہ پیش آیا تو پہلے ہندوؤں کو جگہ دی گئی۔ مسلمانوں کی باری بہت بعد میں آئی۔

## جنگِ آزادی اور وہابی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن علمائے دین نے حصہ لیا، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق "وہابیوں" سے تھا اور سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد سے اُن کا گہرا رشتہ تھا۔ جنرل بخت خاں اور اس کے ساتھی بھی "وہابیت" سے منسلک تھے۔ چنانچہ مولوی ذکاء اللہ رقم طراز ہیں:

دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسرِ اعلیٰ بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبد الغفار اور مولوی سرفراز علی آئے تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا، اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا[۵۹]

---

۵۹ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) ص ۴۰۸

اسی طرح مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب ۱۸۵۷ء میں تحریر کرتے ہیں کہ بہادر شاہ کے مقدمے میں حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے بیان میں کہا تھا:

"اس ہنگامے میں "وہابیوں" نے بھی نمایاں حصہ لیا اور نہ صرف ٹونک سے بلکہ ہر جگہ سے آئے۔ بخت خاں خود وہابی تھا۔ اس کے علاوہ محمد شفیع رسال دار، مولوی امام خاں رسال دار، سرفراز علی جسے بخت خاں نے غازیوں کا سالار بنایا، انھوں نے فتویٰ بھی چھاپا کہ مسلمان مذہبی جنگ کے لیے میدان میں آجائیں۔ جے پور، بھوپال، ہانسی، حصار وغیرہ سے بھی وہابی آئے"[۱۱۰]

دوسری جگہ یہ لفظ بھی ہیں کہ "بخت خاں کی آمد پر بہت سے وہابی شامل ہوئے"[۱۱۱]

انگریز نے لفظِ وہابی کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اسے باغی کے مترادف قرار دیا۔ یعنی جو لوگ انگریزی اقتدار کی مخالفت کرتے تھے، انھیں وہابی کے نام سے موسوم کیا اور بغاوت اور وہابیت انگریز کی ڈکشنری میں ایک ہی معنی میں استعمال ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے والوں کو بھی وہابی کہا گیا اور جن لوگوں پر اس کے بعد بغاوت کے مقدمات دائر کیے گئے اور پھر انھیں پھانسی دیا گیا یا کالے پانی بھیجا گیا، انھیں بھی وہابی قرار دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے مقدماتِ بغاوت کی مناسب تفصیلات ان شاء اللہ اس کتاب کے دوسرے حصے کے مقدمے میں بیان کی جائیں گی۔

## بخت خاں کا مخلصانہ کردار

اُس دور کے فوجی افسروں میں جنرل بخت خاں سراپا خلوص افسر تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء میں ماہِ جون کے آخر میں دہلی پہنچا۔ ایک باقاعدہ اور منظم فوج اس کے ساتھ تھی، جس کو وہ چھ مہینے کی پیشگی تنخواہ ادا کر چکا تھا۔ اس کی فوج ہر قسم کے

---

۱۱۰ ۱۸۵۷ء ص ۲۰۵

۱۱۱ ایضاً ص ۱۲۳

جنگی سازو سامان سے لیس تھی۔ اچھی خاصی رقم بھی اس نے سرکاری خزانے میں جمع کرادی تھی۔ ذاتی طور پر وہ بہت قابل منتظم اور جنگ جو تھا، جرأت اور شجاعت کے تمام اوصاف اس میں پائے جاتے تھے اور ہر نوع کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھا۔ لیکن اس کے ورودِ دہلی سے پہلے ہی مغل شہزادے انتظامی امور پر قابض ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے بے شک اختیارات بخت خاں کو تفویض کر دیے تھے، لیکن شہزادے اسے برداشت کرنے کو تیار نہ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ دوسرا شخص دہلی کی زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے۔ وہ قدم قدم پر رکاوٹ پیدا کرتے اور اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی انتظام صحیح نہ ہو سکا اور حالات لمحہ بہ لمحہ خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ بادشاہ پچاسی[۸۵] سال کی عمر کو پہنچ گیا تھا اور یاس و نا امیدی نے اس کو گھیر رکھا تھا۔ شہزادے نااہل تھے اور کوئی اہم قدم اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، جو لوگ صلاحیت و اہلیت کے جوہر سے آراستہ تھے، ان کو آگے نہیں بڑھنے دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا، یعنی انگریزوں کی پوزیشن مضبوط ہوتی گئی اور ان کے قدم جمتے گئے۔ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دوپہر کے بعد ان کی فوج لال قلعے میں پہنچ گئی اور سپہ سالار ولسن نے دیوانِ خاص کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ انگریزوں کے لیے یہ نہایت خوشی کا موقع تھا۔ انھوں نے دیوانِ خاص میں شراب کی بوتلیں کھولیں اور ملکۂ وکٹوریہ کا جامِ صحت نوش کیا ـــــ یہاں یہ یاد رہے کہ دہلی کا لال قلعہ ۱۶۴۸ء کو تعمیر ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء میں اس کی تکمیل پر دو سو نو سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اس اثنا میں اس کے پُرہیبت در و دیوار نے پہلی مرتبہ ایک اجنبی حکمران کا جامِ صحت تجویز ہونے کی صدا سُنی۔

۱۹ ستمبر کو شہر کے اکثر حصے پر انگریز قابض ہو گئے تھے اور قلعے پر گولیاں برس رہی تھیں۔ بادشاہ اپنے آپ کو سخت خطرے میں گھرا ہوا محسوس کرتا تھا، اس لیے وہ قلعے کی سکونت ترک کر کے باہر آ گیا تھا۔ سپہ سالار بخت خاں نے بادشاہ کی خدمت

میں عرض کیا کہ انگریزوں نے اگر دہلی کو فتح کر لیا ہے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے ہندوستان کی سرزمین کھلی پڑی ہے، میرے ساتھ تشریف لے چلیے، ہم جان کی بازی لگا دیں گے اور پامردی سے انگریزوں کا مقابلہ کریں گے۔ جنگی نقطۂ نظر سے شہروں کو لڑائی کے لیے موزوں نہیں سمجھا جاتا، دہلی شہر تو موقع و محل کے لحاظ سے بالخصوص لڑائی کے لیے مناسب نہیں، شہر نشیب میں ہے اور انگریزی فوج پہاڑی پر اونچی جگہ مورچے سنبھالے ہوئے ہے۔ اب تک ہم نے انگریزی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا ہے۔ بخت خاں نے بادشاہ سے یہ بھی کہا کہ آپ نے مرزا مغل بہادر کو سپہ سالار بنا دیا تھا، جسے فنونِ حرب کا کوئی تجربہ نہیں، باہر سے رسد لانا بھی آسان نہ تھا۔ ان حالات میں اگر ہم دہلی سے باہر چلے جائیں گے تو کامیابی کی بہت امید ہے۔

بادشاہ نے بخت خاں کی یہ باتیں غور سے سنیں اور متاثر بھی ہوا، لیکن فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کہا کہ آج تو ہم ہمایوں کے مقبرے میں جاتے ہیں، کل وہاں آ کر ملو، پھر مستقبل کے لیے کوئی آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

### بہادر شاہ کی حوالگی

بادشاہ اب چھیانوے [96] افراد کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے میں جا بیٹھا تھا۔ اس کی چہیتی بیگم زینت محل بھی ساتھ تھی۔ مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی انگریزوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ خود کو انگریزوں کے حوالے کر دے۔ مرزا الٰہی بخش انگریزوں کا تنخواہ دار تھا اور اس کی ایک بیٹی بہادر شاہ ظفر کے دوسرے ولی عہد فخر الدین فتح الملک عرف مرزا فخرو کے نکاح میں تھی۔ منشی رجب علی کو ارسطو جاہ کا خطاب دیا گیا تھا۔ یہ شخص جگراؤں ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کا باشندہ تھا اور انگریزوں کا ایجنٹ اور مخبر تھا۔ ان دونوں نے بیگم زینت محل سے اس طرح باتیں کیں کہ وہ ان کے فریب میں آ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اگر بادشاہ خود کو انگریزوں کے حوالے کر دے تو وہ ضرور اس کو معاف کر دیں گے۔

بھولا بادشاہ ان کے سامنے جھک گیا اور ان کو اپنے بہی خواہ اور محسن سمجھنے لگا۔

بادشاہ نہایت پریشانی میں تھا۔ ۱۹ ستمبر کی رات کو قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں گیا تھا۔ ۲۰ ستمبر کو بخت خاں وہاں پہنچا اور اس سے گفتگو کی۔ لیکن اس اثنا میں زینت محل، رجب علی اور الٰہی بخش اس کو باغی فوج سے علیحدگی اختیار کرنے اور خود کو انگریزوں کے حوالے کر دینے پر آمادہ کر چکے تھے۔ بخت خاں سے بات ہوئی تو اسے انتہائی تکلیف پہنچی۔ ایک مرتبہ تو بخت خاں نے غصے میں آکر تلوار میان سے نکال لی اور مرزا الٰہی بخش کو قتل کرنے پر اتر آیا۔ لیکن بادشاہ نے اسے روکا اور کہا کہ "آپ کی رائے درست ہے، انگریزوں سے لڑنا چاہیے، لیکن میں یہ نہیں کر سکتا، میرے جسم کی توانائی جواب دے چکی ہے، میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں، آپ ہر صورت میں جہاد جاری رکھیں، تاکہ ہندوستان کی آبرو رہ جائے"[۱۲]

## گرفتاری

بہرحال تیمور کے وارث بہادر شاہ ظفر نے اپنے آپ کو انگریزی فوج کے حوالے کر دیا، اس نے ہتھیار ڈال دیے اور میجر ہوڈسن نے اس کو گرفتار کیا۔ بادشاہ نے صرف اپنی بیگم زینت محل، شہزادہ جواں بخت (جو زینت محل کے بطن سے تھا) اور خود اپنی جان کی امان طلب کی، جو دے دی گئی۔ باقی بیٹوں، پوتوں اور خاندان کے دیگر شہزادوں اور افراد کی جان بخشی کا وعدہ نہیں لیا۔ بادشاہ کے اس طرز عمل کو بہرحال تعجب انگیز اور افسوس ناک قرار دیا جائے گا۔

## بخت خاں

اب دہلی فتح ہو چکی تھی، بادشاہ انگریزوں کی حراست میں تھا، باشندگان شہر کے قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور بخت خاں نہایت افسوس کے

---

۱۲؎ ۱۸۵۷ء ص ۱۳۸ بحوالہ میلی سن ج ۴ ص ۵۴

ساتھ دہلی سے نکل گیا تھا۔ وہ ایک بہادر اور مخلص جرنیل تھا، جو حسرت و ملال کے ساتھ دہلی سے رخصت ہوا۔ ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو فرخ آباد پہنچا۔ اوائل نومبر میں وارد لکھنؤ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ فروری ۱۸۵۸ء تک وہیں رہا۔ اودھ کے حکمران واجد علی شاہ کی بیوی اور برجیس قدر کی والدہ حضرت محل نے جو لکھنؤ میں انگریزوں سے برسرِ پیکار تھی، بخت خاں کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا اور اسے تسلّی دی۔ لکھنؤ اور اس کے نواح کی بعض جنگوں میں اس کی شرکت کا پتا چلتا ہے۔ جب وہ لکھنؤ پہنچا تو دہلی اور فرخ آباد کے بہت سے لوگ اس کے ساتھ تھے تین سو عورتیں بھی اس کے قافلے میں شامل تھیں۔ پانچ ہزار فوجی اس کے ہم رکاب تھے۔

جب لکھنؤ پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو بخت خاں کے غم و افسوس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب وہ مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کی معیت میں شاہ جہان پور کی طرف چلا گیا۔ پھر مختلف مقامات سے ہوتا ہوا نیپال میں داخل ہوا، باقی زندگی وہیں بسر کی، لیکن کس حالت میں بسر کی اور کب وفات پائی؟ اس کا کسی کو علم نہیں۔ جب انگریزوں نے ملک فتح کر لیا اور ہنگامہ ختم ہو گیا تو اس کی بہت تلاش کی گئی، لیکن نہ وہ کہیں ملا، نہ کسی سے اس کے متعلق کچھ سنا گیا، وہ کسی لڑائی میں مارا بھی نہیں گیا۔

## شہزادوں کی گرفتاری اور قتل

بادشاہ کے زیرِ حراست آجانے کے بعد منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کی اطلاع اور مخبری پر میجر ہوڈسن نے ہمایوں کے مقبرے سے بادشاہ کے دو بیٹوں، مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان، اور ایک پوتے ابو بکر مرزا کو گرفتار کیا۔ خضر سلطان بہت اچھا شاعر بھی تھا اور غالب کا شاگرد تھا۔ غالب نے ایک غزل میں اس کے متعلق کہا ہے:

خضر سلطان کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز  شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

شہزادوں کے ساتھ ان کے متعلقین و متوسلین بھی خاصی تعداد میں موجود تھے جو مقبرۂ ہمایوں میں چھپے بیٹھے تھے اور جنھیں رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کی مخبری پر

گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری کے وقت رجب علی اور الٰہی بخش انگریزی فوج کے ساتھ تھے۔ یہ بہت بڑے غدّار تھے، جنھوں نے دہلی میں انگریزی فوج کا ساتھ دیا اور بادشاہ کی گرفتاری، شہزادوں کے قتل اور بے شمار لوگوں کی موت کا باعث بنے۔ غدّاری میں یہ کسی صورت میں بھی بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق سے کم نہیں ہیں، جنھوں نے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے مقابلے میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان دونوں حکمرانوں کو دھوکے سے قتل کرایا۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ جب انگریزی فوج میجر ہوڈسن کی قیادت میں شہزادوں کو گرفتار کرنے آئی تو شہزادوں نے اپنے رفقا سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ رفقا نے جواب دیا، تیموری خاندان کے لوگوں کی روایت یہ ہے کہ وہ خود بخود قید نہیں ہوتے اور کسی طاقت سے خوف زدہ ہو کر پیچھے قدم نہیں ہٹاتے۔ وہ تلوار اٹھا کر میدان میں اُترتے اور دشمن سے معرکہ آرا ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی تیمور کے خون کی لاج رکھنی چاہیے اور بہادروں کی طرح میدانِ محاربہ میں نکلنا چاہیے۔ مرنا ہی ہے تو پھر جرأت مند لوگوں کی طرح کیوں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ مریں۔

افسوس ہے شہزادوں نے اپنے مخلص اور جاں نثار ساتھیوں کا یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ ان پر بزدلی چھا گئی تھی اور غیرت و حمیّت کی دولت سے وہ تہی دامن ہو چکے تھے، یا پھر مرزا الٰہی بخش اور رجب علی نے ان کو تحفظ و صیانت کے فریب میں مبتلا کر دیا تھا اور انھیں یقین دلا دیا تھا کہ انگریز معاف کر دیں گے اور ہر صورت میں ان کی جان بخشی ہو جائے گی۔ حالاں کہ حالات ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ عفو و درگزر کی ہرگز کوئی گنجائش نہ تھی۔ بلکہ ہوڈسن خود بیان کرتا ہے کہ دو گھنٹے کی لفظی نزاع اور امید و بیم کی اضطراب انگیز حالت کے بعد شہزادے مقبرۂ ہمایوں سے نمودار ہوئے اور پوچھا "کیا ہماری جان بخشی کا وعدہ کرتے ہو؟" میں نے جواب دیا "قطعاً نہیں" اور انھیں پہرے کی حفاظت میں شہر کی جانب روانہ کر دیا۔

بہرحال شہزادوں نے ہتھیار ڈال دیے اور سائبان والی بیل گاڑی میں وہ ہمایوں کے مقبرے سے باہر نکلے، میجر ہوڈسن نے ان کو انگریزی فوج کے گھیرے میں لے لیا۔ انگریز کی بارگاہ سے ان کی جان بخشی کی درخواست مسترد ہو چکی تھی۔ شہزادوں کی گاڑی مقبرے سے باہر نکلی اور شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ ہوڈسن گھوڑے پر سوار تھا اور ان کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ ایک بڑا ہجوم بھی ساتھ تھا جو شہزادوں کا انجام دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ انگریز کے مخالف اور شہزادوں کے حامی تھے، لیکن بے بس اور مجبور تھے، کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ابھی تھوڑا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ہوڈسن کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، وہ بہت بپھرا ہوا اور غصے میں تھا۔ گھوڑا دوڑا کر بیل گاڑی کے قریب پہنچا۔ شہزادوں کو گاڑی سے نیچے اُترنے اور اوپر کا لباس اتارنے کا حکم دیا۔ اب شہزادے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے تند و تلخ لہجے میں، اپنے سواروں سے مخاطب ہو کر کہا، تاکہ ہجوم بھی سن لے۔

یہ قیدی وہی قصاب ہیں جنھوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کرایا۔ حکومت انھیں موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتی ہے۔"

ہوڈسن کے یہ الفاظ انتہائی سخت لب و لہجے میں فضا میں گونجے اور خاموشی چھا گئی۔ اس نے فوراً اپنے ایک سوار سے قرابین لی اور یکے بعد دیگرے بے دست و پا تینوں شہزادوں کو گولی سے اڑا دیا۔ مجمع کے اداس اور مجبور لبوں پر اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور دہشت زدہ مسلمان خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ منتشر ہو گئے۔

## شاہی خاندان کے افراد کا قتل، پھانسی اور قید

دہلی اور اس کے اطراف و جوانب میں شاہی خاندان کا جو فرد ملا، انگریزوں نے اسے پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دیا۔ اس میں بوڑھوں، بچوں اور جوانوں کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی گئی۔ چھوٹے بڑے جو شہزادے گرفتار کیے گئے، ان کی تعداد انتیس[۲۹] بیان کی جاتی ہے، جن میں لنگڑے، بیمار، بوڑھے سب شامل تھے اور سب کو پھانسی دی گئی۔ تمام شہزادوں سے بڑی عمر کا شہزادہ قیصر تھا، جو شاہ عالم ثانی کا

بیٹا اور اکبر شاہ ثانی کا بھائی تھا، اسے بھی پھانسی کی سزا دی گئی۔ پھر اکبر شاہ ثانی کا پوتا مرزا محمود شاہ وجع المفاصل کا مریض تھا اور چلنے پھرنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتا تھا، اس کو بھی تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ وجع المفاصل کی بیماری کی وجہ سے اس کا جسم گٹھڑی بنا ہوا تھا اور پھانسی کی حالت میں گولا سا معلوم ہوتا تھا۔

نواب احمد قلی خاں کبیر السن اور ضعیف آدمی تھا۔ زینت محل کا باپ اور بہادر شاہ کا خسر تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی اولاد سے تھا، انگریزی فوج فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوئی تو یہ بھاگ گیا، لیکن جھجر میں پکڑا گیا۔ بے چارا بوڑھا آدمی قید کی اذیتیں برداشت نہ کر سکا اور قید خانے ہی میں وفات پا گیا۔

ولیم موراس زمانے میں انگریزوں کے محکمۂ مخابرت کا سربراہ تھا۔ ۱۸۵۷ کے بعد اس نے اپنے محکمے کی دستاویزیں دو جلدوں میں مرتب کی تھیں۔ ان میں شہزادوں کی اذیت اور قید و بند کے بارے میں بعض تاریخ وار معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس ضمن میں مختصر الفاظ میں اس کا بیان یہ ہے :

۱۔ ۱۳ اکتوبر ۱۸۵۷ء : بہادر شاہ کے بیٹوں مرزا مینڈھو اور مرزا بختاور شاہ پر مقدمہ چلایا گیا۔

۲۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۵۷ء : مرزا مینڈھو اور مرزا بختاور شاہ کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

۳۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۵۷ء : بادشاہ کے تینوں بیٹوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ دو مجرم قرار پائے اور انھیں گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔ تیسرے کے خلاف مقدمہ جاری ہے۔

۴۔ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء : چوبیس شہزادوں کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ ان میں دو بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ دو سالے۔ باقی بھتیجے، بھانجے وغیرہ۔

جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی، ان کی حالت انتہائی دردناک اور اذیت انگیز تھی۔ عام قاعدے کے مطابق ان سے مشقت لی جاتی تھی، لیکن وہ جیل کی مشقت نہیں کر سکتے تھے، ان سے چکی پسوائی جاتی تھی، نہ پیس سکتے تو کوڑے مارے جاتے۔ اس،

حالت میں شاہی خاندان کے کتنے ہی افراد چند روز میں موت کا لقمہ بن گئے۔

## دہلی میں لوٹ مار اور قتل و غارت

۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دہلی کو نشانۂ ستم بنایا اور پھر اس میں لوٹ مار، قتل و غارت، آتش زنی اور پکڑ دھکڑ کا جو سلسلہ شروع کیا، اس کو الفاظ کا جامہ پہنانا اور قلم کی زبان سے بیان کرنا ممکن نہیں۔ فتح دہلی کے بعد انھوں نے باشندگانِ شہر پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص جو مظالم ڈھائے اس کی تفصیل کا اظہار انتہائی الم انگیز اور زہرہ گداز ہے۔ کئی مہینے آتشِ ستم مشتعل رہی جس میں مسلمانوں کا سرمایۂ جان و مال اور متاعِ عزت و آبرو خس و خاشاک کی طرح جل کر خاکستر ہوتے رہے۔ دہلی برصغیر کا وہ شہر ہے جس کو سیکڑوں سال تک دنیوی جاہ و جلال کی نشان دار بہاریں دیکھنے کے مواقع بھی میسر آئے اور آتش و خون کے خوف ناک طوفانوں میں غوطہ زنی بھی کرنا پڑی۔ بہت سے بے رحم فاتحین نے اس کے باشندوں سے انتہائی وحشت ناک سلوک روا رکھا اور اس کے در و دیوار پر جور و دہشت کے ہیبت ناک نقوش ثبت کیے۔ لیکن انگریزوں نے اس بلدۂ مظلوم کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ ایسا خوں چکاں مرقع تھا کہ دہلی کے چرخِ نیل گوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ محلوں کے محلے بے آباد کر دیے گئے، مکان جلا دیے گئے یا منہدم کر دیے گئے، اصحابِ عز و جاہ کو شہر سے نکال دیا گیا اور وہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بہت سے علما و صلحا اور شعرا و فضلا کو یا تو جیلوں میں ڈال دیا گیا، یا قتل کر دیا گیا اور یا پھر شہر بدر کر دیا گیا۔ مستورات کی حالت نہایت تکلیف دہ تھی، جن خواتین نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا، انھیں بے پردگی کی حالت میں پیادہ پا چلنا پڑا، پاؤں میں چھالے پڑ گئے، ٹانگیں سوج گئیں۔ صحرا نوردی اور ایسی مسافت جس کی منزل کا کوئی علم نہیں اور کچھ معلوم نہیں کہ کہاں جانا اور کہاں رُکنا ہے۔ عصمت و عفت کی حفاظت بہت بڑا مسئلہ تھا، اس لیے بے شمار عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں اور زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

پھر ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی، بہت سی جانیں اس کی نذر ہوگئیں۔ متعدد عورتیں اس لیے کنوؤں میں کود پڑیں کہ در بدر کی خاک چھاننے سے مرجانا ہی بہتر ہے۔ کئی سال بعد جب کنوئیں صاف کیے گئے تو بہت سے کنوؤں سے عورتوں کی لاشیں نکلیں۔ دور دور تک ہر طرف پناہ گیروں کے قافلے ہی قافلے نظر آتے تھے، جو اَن جانی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ کوئی خاندان کسی گاؤں میں چلا گیا، کسی نے کسی شہر میں جاکر پناہ لی، کوئی جنگل میں جا بیٹھا، کسی نے کھنڈر میں گھس کر جان بچائی، کسی نے گڑھے میں ڈیرہ جمالیا اور کوئی دور دراز مقام میں جا بسا — بہر حال ایک افراتفری کا عالم تھا اور انتہائی اذیت ناک حالات تھے۔ دہلی میں سناٹا چھا گیا، ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی دیتی تھیں۔ پورا شہر، شہرِ خموشاں بنا ہوا تھا۔ انگریزی فوج کے گھوڑوں کے سموں کی آواز کے سوا کسی سمت سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چاروں طرف اتنی انسانی لاشیں بکھری پڑی تھیں کہ انھیں کھا کھا کر کُتّے اور گِدھ بھی اکتا گئے تھے۔

## مسلمانوں کی بربادی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی

اس ہنگامے میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا، ان کی بربادی کے بہت سے اسباب تھے۔ بے شمار لوگ مارے گئے، ان کے گھروں کو لوٹا گیا، مال و اسباب تباہ ہوا، غربت اور جلاوطنی کی مصیبتیں برداشت کیں، جاگیریں ضبط ہوئیں، ریاستیں چھنیں، پنشنیں ختم ہوئیں، جائدادیں لٹیں اور معزز لوگ ذلت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کا نقصان یا تو کئی علاقوں میں ہوا ہی نہیں یا ہوا تو بہت کم — پھر ایک عرصے کے بعد جب دہلی آباد ہونے لگی اور بے گھر لوگ واپس آئے تو مسلمانوں کے جو مکان ضبط ہو کر نیلام ہوئے تھے، وہ ہندوؤں کے قبضے میں چلے گئے۔ ان کوچوں کہ مسلمانوں سے بہت پہلے آباد کیا گیا تھا، اس لیے مسلمانوں کا وہ مال جو انگریزوں نے ضبط کرلیا تھا، نیلام ہونے لگا تو ہندوؤں نے خرید لیا اور نہایت سستے داموں خریدا۔ بہت سی حویلیاں ہندوؤں کی ملکیت قرار پائیں، مثلاً کلاں محل، نواب جھجر کی حویلی،

مرزا خجستہ بخت کی حویلی، شیش محل، نواب منصور خاں کی حویلیاں، ان میں سے ایک ایک عمارت ایک ایک محلے کے برابر تھی۔ یہ سب نیلامی میں ہندوؤں نے خریدلیں اور وہ ان پر قابض ہوگئے۔

پھر کاروبار کی بھی سب سے پہلے ہندوؤں کو اجازت دی گئی اور انھوں نے ضرورت مندوں سے خوب پیسے کمائے۔ مسلمانوں کو بعد میں کاروبار کی اجازت ملی۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہی مال جو مسلمانوں کا تھا اور ہندوؤں نے نیلامی میں لیا تھا، اب یہی مال ہندو دکان دار ضرورت مند مسلمانوں کو بیچنے لگے اور اس میں انھوں نے بے حد نفع کمایا۔ مسلمانوں کا جو مال انگریزی سپاہیوں نے لوٹا تھا، وہ بھی مسلمان خریدنے لگے۔ یعنی اس طرح انہی کا لوٹا ہوا مال، انہی کو دوبارہ قیمتاً خریدنا پڑا، اور اس حالت میں خریدنا پڑا کہ جب اُن میں کوئی مالی سکت نہ رہی تھی اور غربت و افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا جنونِ انتقام یہاں تک بڑھ گیا کہ مذہبی مقامات کے تقدس کا بھی کوئی خیال نہیں رکھا۔ دہلی کی کئی مسجدیں یا توڑھا دی گئیں یا سکھوں کو دے دی گئیں یا گھوڑوں کے اصطبل میں بدل دی گئیں یا فوج کی بارکیں بنادی گئیں۔ مثلاً جامع مسجد سکھوں کی بارک بنی اور اس کی انتہائی توہین کی گئی۔ پانچ سال بعد ۲۴ نومبر ۱۸۶۲ء کو یہ مسجد واگزار ہوئی اور مسلمانوں کے قبضے میں آئی۔ دس آدمیوں کی ایک کمیٹی مسجد کے انتظام و انصرام کے لیے بنادی گئی۔ زینت المساجد کو گوروں کا مسکن بنادیا گیا۔ نواب حامد علی خاں کی مسجد شیعہ حضرات کی سب سے بڑی مسجد تھی، اس میں گدھے باندھے گئے۔ ایک بڑی مسجد سکھوں کے گوردوارے کے قریب تھی، یہ مسجد مہاراجا جیند کو دے دی گئی اور مہاراجا نے اس کو گوردوارے میں شامل کرلیا۔ اکبر آبادی مسجد، دہلی کی مشہور مسجد تھی اور یہ وہی مسجد تھی جس میں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی مدت تک درس دیتے رہے، اسے بھی شہید کردیا گیا۔ اورنگ آبادی مسجد

بھی دہلی کی خوب صورت اور بڑی مسجدوں میں سے تھی ۔ اس کے امام مولوی عبدالخالق تھے جو شمس العلما مولوی نذیر احمد کے خُسر تھے ۔ شیخ الکل میاں سیّد نذیر حسین محدث دہلوی نے پہلے پہل اسی مسجد میں سلسلۂ درس شروع کیا تھا ، یہ مسجد بھی انگریزوں نے منہدم کرادی ۔ اس مسجد کے انہدام کے بعد حضرت میاں صاحب پھاٹک حبش خاں میں چلے گئے تھے ۔ قلعے کے اندر ایک مسجد، چوبی مسجد کہلاتی تھی ، انگریزوں نے جوش غضب میں اس مسجد کو بھی ڈھا دیا ۔ غرض بہت سی مشہور اور بڑی بڑی مسجدیں انگریزوں کے انتقام کا نشانہ بنیں ۔ اندازہ کیجیے جن لوگوں نے مسجدوں اور مکانوں کو برداشت نہیں کیا ، وہ مسلمانوں کا وجود کیوں کر برداشت کرسکتے تھے ۔

دہلی صدیوں سے علما اور فضلا کا مرکز تھا اور علم و کمال کی ایک تاریخ اس سے وابستہ تھی ۔ اس میں مختلف اہلِ علم کے بہت بڑے بڑے کتب خانے تھے ، جو نادر و نایاب کتابوں پر مشتمل تھے ۔ صرف مفتی صدرالدین آزردہؔ کا کتب خانہ تین لاکھ روپے کا تھا ۔ باقی کتب خانوں کو اسی پر قیاس کرلینا چاہیے ۔ پھر ایک شاہی کتب خانہ تھا ، جو صدیوں سے قائم تھا ۔ یہ سب کتب خانے یا تو جلا دیے گئے ، یا ضائع کردیے گئے یا لوٹ لیے گئے یا پھر انھیں اٹھا کر لندن بھیج دیا گیا ، اب وہ انڈیا آفس لائبریری کی زینت ہیں ۔

ان تمام امور کی تفصیلات دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں جو بہت دردانگیز اور افسوس ناک ہیں ۔ بلکہ ان تفصیلات کا ایک ایک پہلو غم و اندوہ کا ایک سیلاب اپنے اندر لیے ہوئے ہے ، ہم اس کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر رہے ہیں ۔

## بہادر شاہ کا مقدمہ اور فیصلہ

بادشاہ بہادر شاہ ظفر ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لال قلعے سے ہمایوں کے مقبرے میں گیا ۔ ۱۱ مئی کو بغاوت کا آغاز ہوا اور آزاد حکومت کا قیام عمل میں آیا ۔ اس طرح

دہلی میں یہ حکومت چار مہینے آٹھ دن رہی۔ اس کے تمام کاغذات، بادشاہ کے فرمان، عرض داشتیں، دستخطی احکام، شہزادوں، سرکاری اہل کاروں، امیروں اور رئیسوں کے نام جو فرامین جاری ہوئے یا اس اثنا میں جو درخواستیں اور عرض داشتیں بادشاہ کے حضور پیش ہوئیں اور بادشاہ نے ان پر جو احکام جاری فرمائے، لال قلعے سے نکلتے وقت وہ سب وہیں رہ گئے۔ پھر یہ بادشاہ اور اس کے عمال و حکام کے خلاف استعمال ہوئے۔ یہ یقینی اور قطعی شہادتیں تھیں، جن میں کسی نوع کا شک یا اشتباہ نہیں تھا۔ بادشاہ کو چاہیے تھا کہ وہ نکلتے وقت انھیں ضائع کر دیتا۔ لیکن جلدی میں ایسا نہ ہو سکا اور بادشاہ ان کاغذات کی وجہ سے مقدمہ ہار گیا۔

بادشاہ باختلافِ روایات ۲۱ یا ۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو گرفتار ہوا تھا، لیکن اس کے خلاف مقدمے کا آغاز ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو ہوا۔ اس اثنا میں بادشاہ انگریزوں کی قید میں رہا اور وہ لال قلعہ جو کئی پشتوں سے اس کا مسکن تھا، اب اس کے لیے قید خانہ تھا۔ پنجاب کے چیف کمشنر جان لارنس کی ہدایات کے مطابق جنرل پنی (PENNY) نے ایک فوجی کمیشن بادشاہ کے مقدمے کی سماعت کے لیے مقرر کیا، جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھا۔

۱۔ لفٹیننٹ کرنل ڈاز (DAWES) صدر
۲۔ میجر پلمر (PALMER) ممبر
۳۔ میجر ریڈمنڈ (REDMOND) ممبر
۴۔ میجر سائرس (SAWYERS) ممبر
۵۔ کپتان رادنی (ROTHNEY) ممبر

مسٹر جیمز مرفی (JAMES MURPHY) کو ترجمان مقرر کیا گیا اور میجر ہریٹ (HARRIAT) کو ڈپٹی جج ایڈووکیٹ بنایا گیا۔

مقدمہ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو شروع ہوا، اور فوجی کمیشن کے اجلاس دیوانِ خاص میں ہونے لگے۔ یہ وہی دیوانِ خاص ہے، جس میں بادشاہ کے اذن کے سوا کوئی شخص

داخل نہیں ہو سکتا تھا، اور جو وہاں جاتا، وہ بھی عجز و نیاز کا پیکر بن کر جاتا۔ لیکن آج خود بادشاہ کو بھی اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، اور اگر داخل بھی ہوا تو فوج کے پہرے میں اور ایک قیدی اور ملزم کی حیثیت سے! کوئی وقت تھا کہ خاندانِ مغلیہ کے حکمرانوں کی عظمت و برتری کے حضور کابل سے راس کماری تک عقیدت و احترام کی گردنیں جھکی رہتی تھیں۔ آج اس کی تذلیل و تحقیر کا آخری منظر بھی لوگوں کے سامنے تھا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ کو ابتدائی رسمی کارروائی کے بعد جج ایڈووکیٹ جنرل نے کمیشن کے سامنے استغاثہ پیش کیا، جس میں بادشاہ پر چار الزامات عاید کیے گئے۔ جو مختصر الفاظ میں یہ تھے۔

۱۔ بہادر شاہ ظفر نے برطانیہ کی حکومتِ ہند کا وظیفہ خوار ہونے کے باوجود ۱۰ مئی ۱۸۵۷ سے یکم اکتوبر ۱۸۵۷ تک محمد بخت خاں صوبے دار توپ خانہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے متعدد کمیشن یافتہ افسروں اور سپاہیوں کو بغاوت اور سرکشی پر اکسایا، اس میں امداد دی اور حصہ لیا۔

۲۔ بہادر شاہ نے اپنے بیٹے مرزا مغل کو جو برطانوی حکومت کی رعایا تھا، دہلی میں اور ممالکِ غربی و شمالی کے غیر معلوم باشندوں کو حکومت سے بغاوت اور جنگ آزمائی پر آمادہ کیا، اس میں امداد دی اور حصہ لیا۔ حالاں کہ وہ سب لوگ برطانوی رعایا تھے۔

۳۔ بہادر شاہ نے برطانوی حکومتِ ہند کی رعایا ہونے کے باوجود ۱۱ مئی یا اس کے قریب اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ اور حکمران ہونے کا اعلان کیا اور دہلی پر دھوکے سے قبضہ کر لیا۔ انگریزی حکومت کی بربادی کے لیے جو سازشیں کی گئیں ان میں شریک رہا اور حکومت سے جنگ کی۔

۴۔ بہادر شاہ ۱۶ مئی ۱۸۵۷ کو لال قلعے کی حدود میں، یورپی نسل کے انچاس[۴۹] افراد کو، جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے، بے دردی سے قتل کرا دینے کا موجب بنا اور اس فعل میں معاون رہا۔ قاتلوں کو ملازمتیں، ترقیاں اور اعزازات دیے

یا ان سے اس کے وعدے کیے۔ نیز مختلف دیسی حکمرانوں کے نام عیسائیوں اور انگریزوں کو قتل کر دینے کے احکام صادر کیے۔ یہ سب امور ایکٹ ۱۶ مصدرہ ۱۸۵۷ء کی رو سے جرم ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ میرٹھ کی سپاہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ کی صبح کو دہلی پہنچی تھی اور بادشاہ ۲۲ ستمبر کو گرفتار ہوا، اور اسی وقت انگریزی حکومت کی حراست میں لے لیا گیا، لیکن اس پر جو الزامات عاید کیے گئے، ان میں بادشاہ کے جرائم کی ابتدا ۱۰ مئی سے کی گئی اور پھر یکم اکتوبر کو اس کا آخری دن قرار دیا گیا۔ یعنی "جرائم" کے ارتکاب میں دس گیارہ دن کا اضافہ کیا گیا۔

بہرحال مقدمہ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ سے شروع ہوا اور ۹ مارچ تک جاری رہا۔ کل اکیس [21] پیشیاں ہوئیں۔ ۹ مارچ ۱۸۵۸ کو فیصلہ سنا دیا گیا۔

ان الزامات کی تصدیق میں اور بہادر شاہ کے خلاف شہادتیں بھی ہوئیں اور تحریریں بھی پیش کی گئیں۔ لیکن بہادر شاہ نے اُن الزامات کی جو اس کے خلاف عائد کیے گئے، تردید کی۔ بالآخر ۹ مارچ ۱۸۵۸ کو ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت میں طویل تقریر کی، جس میں الزامات کو ثابت شدہ قرار دیا۔ کمیشن نے تھوڑی دیر میں یہ فیصلہ سنایا:

عدالت اس شہادت کے مطابق جو اس کے سامنے ہے، اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ قیدی محمد بہادر شاہ سابق شاہِ دہلی کے خلاف جو الزامات لگائے گئے، وہ سب کلّی اور جزوی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں۔

میرٹھ ڈویژن کے کمان آفیسر میجر جنرل پنی (PENNY) نے جو فوجی کمیشن تشکیل دینے کا ذمے دار تھا، ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ کو کمیشن کا فیصلہ منظور کر لیا اور اس کی تصدیق کر دی۔

## جلاوطنی

انگریزوں سے بہادر شاہ کی جان بخشی کا وعدہ ہو چکا تھا، اس لیے سزائے موت

نہیں دی گئی۔ گوروں کے سنگین پہرے میں بہادر شاہ اور اس کے رفقا کو کلکتے بھیجا گیا۔ قیدیوں کا یہ قافلہ ۲۹ ربیع الاوّل ۱۲۷۵ھ (۶ نومبر ۱۸۵۸ء) کو دہلی سے روانہ ہوا۔ یہ قافلہ جن افراد پر مشتمل تھا، ان کی تعداد سولہ تھی اور وہ یہ افراد تھے:

۱۔ نواب زینت محل: بہادر شاہ کی بیوی۔

۲۔ بیگم تاج محل: بہادر شاہ کی بیوی۔

۳۔ خیرن بائی۔

۴۔ ظہورن بائی۔

۵۔ شہزادہ جواں بخت بن بہادر شاہ۔

۶۔ مرزا عباس بن بہادر شاہ۔

۷۔ مرزا قیصر شکوہ موسوم بہ غلام قنبر بن سلیمان شکوہ۔

۸۔ نواب شاہ بادی: بیوی شہزادہ جواں بخت۔

۹۔ شہزادہ جواں بخت کی ساس۔

۱۰۔ شہزادہ جواں بخت کے سالے۔

۱۱۔ بہادر شاہ کے فرزند مرزا عبداللہ کی بیگم (خیرن بائی کے بطن سے)

۱۲۔ احمد بیگ آب دار۔

۱۳۔ باسط علی۔

ان کے علاوہ کچھ ملازم بھی تھے۔ کل سولہ افراد پر یہ قافلہ مشتمل تھا — چھ سو گورے پہرے دار تھے اور توپ خانہ ساتھ تھا تاکہ کوئی خطرہ پیش آئے تو مقابلہ کیا جاسکے۔ جب بادشاہ ڈولی میں سوار ہو کر گوروں کے پہرے میں دہلی سے روانہ ہوا تو ان لوگوں کے گھر میں ماتم بپا تھا، جو اس کے باپ دادا کی دی ہوئی زمین سے اب تک گزر اوقات کر رہے تھے۔

بادشاہ کی سواری کلکتے پہنچی تو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو جہاز میں سوار کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ مرزا غالب کے ایک مکتوب میں بتایا گیا ہے کہ بادشاہ کے ساتھ

اپنی مرضی سے اس کے ساتھ نہیں گئے تھے، بلکہ انھیں قیدی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ۱۸۵۸ء کے ختم ہونے سے قبل ہی مظلومین کا یہ کارواں رنگون پہنچ گیا تھا۔ جہاز سے اتار کر فوراً ہی ان لوگوں کو صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں لے جایا گیا، جو گھڑ دوڑ کے پرانے میدان کے قریب تھا۔ جس سڑک پر یہ بنگلہ واقع تھا، آج کل اسے "وائل روڈ" کہتے ہیں[۱۳]

بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ تھا اور انگریزی حکومت کی طرف سے صرف چھ سو روپے ماہوار ان قیدیوں کو خرچ کے لیے ملتے تھے۔ بہادر شاہ نے اس رقم میں اضافے کی کوئی درخواست نہیں دی اور اس کی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ اس حالت میں انگریزوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ اس کی بیوی زینت محل کے پاس کچھ زیورات موجود تھے، انھیں فروخت کر کے یہ لوگ گزر بسر کرتے رہے۔ بہادر شاہ نے زمانۂ اسیری میں کچھ نظمیں بھی کہیں، جو بہت دردناک تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب خود بادشاہ کا وجود ایک الم ناک مرثیہ اور درد انگیز نوحہ بن کر رہ گیا تھا۔

## وفات

رنگون میں بہادر شاہ نے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ لیکن وہاں کے حکام اور عام باشندے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ شہزادے اکثر گاڑی پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے جاتے مگر بادشاہ کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا زیادہ وقت اللہ کی یاد اور تسبیح و استغفار میں گزرتا۔ اس نے ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۹ھ (۷ نومبر ۱۸۶۲ء) کو انتقال کیا اور قیدِ حیات اور قیدِ فرنگ دونوں سے نجات پائی ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

منقول ہے کہ موت کے وقت بہادر شاہ ظفر کے پاس زینت محل، جواں بخت، اس کی بیوی اور ایک کم عمر بچی کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ وفات کے بعد حکامِ رنگون

---

[۱۳] بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص ۱۳۲، ۱۳۳

کو اطلاع دی گئی اور دفن کی اجازت طلب کی۔ لیکن کچھ پتا نہیں کہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے اس آخری وارث کی تجہیز و تکفین کس طرح ہوئی اور جنازے میں کن لوگوں نے شرکت کی۔ البتہ اس کو اسی بنگلے کے احاطے میں، جہاں وہ قید تھا، سپردِ خاک کر دیا گیا۔

## قبر

بادشاہ کی قبر کچی تھی، اس کے قریب بیری کا ایک درخت تھا۔ اسی درخت کو بالآخر قبر کا نشان سمجھا گیا۔ بہادر شاہ کی بیوی زینت محل نے اس سے کوئی چوبیس سال بعد ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء کو وفات پائی۔ اسے بھی شوہر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ شہزادہ جواں بخت ماں سے دو سال پہلے مولمین (جنوبی برما) میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کی قبر کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔

بہادر شاہ کے بعد زینت محل کچھ مدت اسی بنگلے میں رہی۔ اسے برطانوی حکومت کی طرف سے پانچ سو روپے ماہوار ملتے تھے اور پانچ سو شہزادہ جواں بخت کے لیے مقرر تھے۔ پھر اسے دوسرے مکان میں منتقل کر دیا گیا۔ جس احاطے میں بہادر شاہ اور زینت محل کی قبریں تھیں، وہ ایک یورپین کو ٹھیکے پر دے دیا گیا، جس کا نام ڈاسن تھا اور ڈاسن بینک کمپنی سے اس کا تعلق تھا۔ ڈاسن کے اس مکان میں آنے سے پہلے بعض لوگ فاتحہ خوانی کے لیے قبر پر جاتے تھے اور خادم چراغ بھی جلا آتے تھے، لیکن جب ڈاسن آیا تو اس نے آمد و رفت کا راستہ بند کر دیا۔ قبر کے ایک طرف اس نے ٹینس کھیلنے کا میدان بنالیا، دوسری طرف گھوڑے سدھانے کا چکر۔! چند روز میں قبر کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک شخص جس کا نام عبدالسلام تھا، قبر کی ٹوہ لگاتا ہوا، اس جگہ پہنچا اور بیری کے درخت سے جو وہاں موجود تھا، قبر کا سراغ لگایا۔ اس نے اخباروں میں مضمون لکھے اور حکومتِ برما سے خط و کتابت کی تو اس جگہ پر ایک کتبہ لگایا گیا کہ دہلی کا معزول بادشاہ بہادر شاہ ۷ نومبر ۱۸۶۲ کو رنگون

میں فوت ہوا، وہ اس مقام کے قریب اسے دفن کیا گیا۔ بعد کو زینت محل کی قبر پر بھی تاریخِ وفات کی تختی نصب کر دی گئی۔ پھر دونوں قبروں کو ملا کر ایک تعویذ بنا دیا گیا، ارد گرد لوہے کا کٹہرہ ہے اور اوپر ٹین کا سائبان۔ بہادر شاہ کا پوتا سکندر بخت وہاں مجاور بن کر بیٹھ گیا۔[۱۴]

بہادر شاہ ظفر نے غریب الوطنی میں وفات پائی اور ایک قیدی کی حیثیت سے مرا۔ اس کی قبر بھی بادشاہوں کی قبروں سے الگ اور بہت دور ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۵۲ء میں ایک معزز شہزادے خدا بخش نے قلعے میں مشاعرہ شروع کیا تھا اور حضور (بہادر شاہ ظفر) سے بھی غزل کا وعدہ لے لیا تھا۔ دوسرے شعرا کے علاوہ ذوق مرحوم بھی شہزادے کے اصرار پر اس میں شریک ہوئے۔ حضور بالا بالا آئے اور پس پردہ بیٹھے۔ ایک خواص نے حضور کی غزل سنائی۔ آزاد فرماتے ہیں، ایک شعر اس کا مجھے اب تک نہیں بھولا اور نہ بھولے گا۔ وہ شعر یہ ہے:

ہم بے کسوں کو گورِ غریباں پسند ہے — شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو

آزاد کہتے ہیں، یہ غزل بہادر شاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی، لیکن جب یہ شعر مجھے یاد آتا ہے تو دیدۂ عبرت سے لہو ٹپکتا ہے۔

بہادر شاہ مر گیا، اس نے کوئی کارنامہ بھی انجام نہیں دیا، وہ برائے نام بادشاہ تھا، مگر اس کے ساتھ مغلوں کی ایک تاریخ وابستہ تھی۔ وہ مظلومیت کی حالت میں گرفتار ہوا، اس کو ذلیل کیا گیا، قید میں ڈالا گیا، ملک بدر کیا گیا مگر لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ رہیں۔ اس کو سب نے ستم زدہ قرار دیا اور لائقِ احترام گردانا۔ اس کی یاد لوگوں کے دل میں رہی اور روح و جگر میں اضطراب و بے چینی پیدا کرنے کا موجب بنی۔ مولانا غلام رسول مہر، مولانا راشد الخیری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۲ء میں

---

[۱۴] بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص ۱۳۴، ۱۳۵

مغرب کی نماز (دلّی کی) شاہی مسجد کے اندر ادا ہوئی۔ اس میں نواب سعید احمد خاں، حکیم عبدالمجید خاں، شہزادہ سلیمان جاہ وغیرہ شریک تھے۔ بہادر شاہ کی وفات پر بیس برس گزر چکے تھے۔ اس کے لیے مغفرت کی دعا کی گئی تو سب کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے[۱۵]

دوسری عالم گیر جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے زمانے میں سبھاش چندر بوس نے ہندوستان کی آزادی کے لیے برما سے آزاد ہند فوج تیار کی تھی۔ جب اسے ہندوستان کی طرف کوچ کا حکم دیا تو اس ضمن میں ایک رسم بہادر شاہ کے مزار پر بھی ادا کی گئی، جس میں سبھاش چندر بوس نے حلف اٹھایا تھا کہ ہم ہندوستان کو آزاد کرائیں گے تو اے مغلوں کی آخری یادگار! اے غریب الوطن بادشاہِ دہلی!! ہم تیری میت کو خاکِ غربت سے نکال کر وطنِ محبوب کی سرزمین میں سلائیں گے تاکہ تیری روحِ مظلوم آسودگی سے ہم کنار ہو[۱۶]

بہرحال برصغیر کے ہر شخص نے بہادر شاہ کو ہمیشہ یاد رکھا اور عزت و احترام سے اس کا نام لیا۔ وہ پڑھا لکھا، بہت اچھا شاعر، عبادت گزار، ہمدردِ خلائق اور عمدہ خصال بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں بہت سے علما و فقہا دہلی اور اس کے گرد و نواح میں موجود تھے، وہ ان سب کی تکریم کرتا اور سب اس کا احترام بجا لاتے تھے۔

## بہادر شاہ ظفر — ولادت سے وفات تک

بہادر شاہ ظفر کی ولادت سے وفات تک کی مختلف تاریخوں پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

۲۵ اکتوبر ۱۷۷۵ء کو پیدا ہوا۔

---

۱۵ ۱۸۵۷ء ص ۲۱۳

۱۶ ایضاً

65526

۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تاجِ شاہی سر پر رکھا۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جنگِ آزادی شروع ہوئی، جس کو انگریزوں نے "غدر" قرار دیا۔

۲۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہوا۔

۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو اس کے خلاف دہلی کے لال قلعے میں فوجی عدالت میں بغاوت کا مقدمہ شروع ہوا۔

۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو اس کے خلاف فیصلہ سنایا گیا۔

۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو فوجی عدالت کے فیصلے کی برطانوی حکومتِ ہند نے توثیق کی۔

۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ اور اس کے ساتھی قیدیوں کا قافلہ دہلی سے کلکتے کو روانہ ہوا۔

۱۸۵۸ء کے اختتام سے پہلے ہی یہ قافلہ کلکتے سے جہاز کے ذریعے رنگون پہنچا۔

۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو بہادر شاہ نے رنگون میں وفات پائی۔

## سلطنتِ مغلیہ کا آغاز اور انجام

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے آغاز اور انجام کی تفصیل جو ہمارے موضوع سے تعلق رکھتی تھی، فقہائے ہند کی گزشتہ جلدوں اور زیرِ نظر جلد میں مناسب الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے۔ ظہیر الدین محمد بابر پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی سے مقابلہ کر کے اس ملک کو فتح کیا اور آخری بادشاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تھا، جس سے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں انگریزوں نے یہ ملک چھینا۔ اس طرح قمری حساب سے تین سو اکتالیس (۳۴۱) برس اور شمسی حساب سے تین سو اکتیس (۳۳۱) برس مغلوں نے اس ملک پر حکومت کی۔ سوری خاندان کا پندرہ سالہ (۹۴۷ھ تا ۹۶۲ھ / ۱۵۴۰ء تا ۱۵۵۵ء) عہدِ حکومت بھی اس میں شامل ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں یہ بہت طویل عرصہ ہے جس

میں ایک ہی خاندان برسرِ اقتدار رہا۔ اس اثنا میں کل انیس (19) مغل بادشاہ تختِ ہند پر متمکن ہوئے، جن میں بعض کا عہدِ حکومت بہت طویل اور شان دار تھا، بعض کا بہت مختصر اور نہایت عبرت ناک۔!

ان بادشاہوں سے متعلق ضروری واقعات "فقہائے ہند" کے معزز قارئین کے علم و مطالعہ میں آچکے ہیں۔ یہاں ترتیبِ زمانی سے ان کے نام دوبارہ درج کیے جاتے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) بابر (۲) ہمایوں (۳) اکبر (۴) جہاں گیر (۵) شاہ جہان (۶) اورنگ زیب عالم گیر (۷) شاہ عالم بہادر شاہ اوّل (۸) جہاں دار شاہ (۹) فرخ سیر (۱۰) رفیع الدرجات (۱۱) رفیع الدولہ (۱۲) نیکوسیر۔ اس نے چند روز حکومت کی۔ (۱۳) ابراہیم۔ صرف ایک مہینہ آٹھ دن حکومت کی۔ (۱۴) محمد شاہ رنگیلا (۱۵) احمد شاہ (۱۶) عالم گیر ثانی (۱۷) عالم شاہ ثانی (۱۸) اکبر شاہ ثانی (۱۹) بہادر شاہ ظفر۔

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۱۱۸ھ - ۱۷۰۷ء) تک یہ حکومت نہایت مضبوط اور مستحکم رہی۔ اس کے بعد اس پر زوال طاری ہوگیا اور ۱۸۵۷ء میں ختم ہوگئی۔ لیکن اس ملک پر مغلوں کا اس قدر رعب اور اثر تھا کہ مرتے مرتے بھی ڈیڑھ سو سال ان کی حکومت قائم رہی۔ بلکہ آخر میں تو پورے ملک کی ہمدردیاں اس کے ساتھ وابستہ ہوگئی تھیں۔ مرہٹے جو مغل سلطنت کے ہمیشہ حریف اور مخالف رہے، اس کے زبردست حامی اور معاون ہوگئے تھے۔ یہ تمام باتیں اس کتاب کی پہلی جلدوں میں معرضِ بیان میں آچکی ہیں۔

## کچھ اس کتاب کے بارے میں

زیرِ نظر جلد کا نام جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا "فقہائے پاک و ہند، تیرھویں صدی ہجری" ہے اور یہ اس کی جلد اوّل ہے، جو حروفِ تہجی کے اعتبار سے حرفِ الف سے لے کر حرف ظ تک ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ العزیز اس کی جلد دوم آئے گی جو حرف ع سے لے کر حرف ی تک ہوگی۔

اس جلد میں نام کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ بھی کیا گیا ہے کہ جن فقہائے برصغیر کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے اور تذکرہ نگاروں نے ان کو فقیہ قرار دیا ہے، ہر ردیف کے بعد نمبروار ان کا الگ ذکر کر دیا گیا ہے۔ باقاعدہ عنوان کے ساتھ انہی حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کے زیادہ حالات وکوائف میسر آسکے ہیں۔

اگر زندگی نے وفا کی اور قلم و قرطاس سے رابطہ قائم رہا تو چودھویں صدی ہجری تک کے فقہا کے حالات پر یہ سلسلہ اختتام پذیر ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز۔ اللّٰھمّ یسّر ولا تعسّر وتمّم بالخیر۔

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

۲ شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ

۲۶ مئی ۱۹۸۲ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# الف

## ۱- مولانا آدم مدراسی

مولانا آدم بن ابو آدم مدراسی اپنے زمانے کے شیخ، عالم و فقیہ اور متقی و صالح بزرگ تھے۔ علومِ حدیث و فقہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ "الزواجر"[۱] کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مدراس اور اس کے گرد و نواح کے لوگ ان سے مستفید ہوئے۔ اس عالم دین نے ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ کو وفات پائی۔[۲]

## ۲- سیّد آل احمد سہسوانی

سیّد آل احمد بن نظر محمد بن ابو محمد حسینی نقوی سہسوانی نیک سیرت علما میں سے تھے۔ سہسوان میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ بچپن ہی سے اپنے والدِ گرامی سید نظر محمد سہسوانی سے منسلک رہے اور ان سے حصولِ علم کیا۔ تصوّف و طریقت میں بھی ان سے فیض یاب ہوئے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے۔ پرہیزگار اور نامور

---

[۱] الزواجر، شیخ ابن حجر مکّی کی تصنیف ہے، جس میں کبیرہ گناہوں کا ذکر ہے، تذکیر و ترہیب کے سلسلے کی یہ بہترین کتاب ہے۔

[۲] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱

فقیہ تھے۔ وحدت الوجود کے قائل اور ابنِ عربی سے متاثر تھے۔ چنانچہ ابن عربی کی فصوص الحکم کی شرح بسر فرقلم کی، جسے "البیان المخصوص فی شرح الفصوص" کے نام سے موسوم کیا۔ ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی بنا پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان کی بہت تکریم کرتے تھے۔ ایک دفعہ دہلی گئے اور شاہ صاحب کے ہاں پہنچے تو انھوں نے اپنی مسند چھوڑ دی اور اصرار کر کے اس پر بٹھایا۔ دہلی سے رخصت ہونے لگے تو شاہ صاحب کچھ دور تک ساتھ گئے۔ مراد آباد، رام پور، بریلی، سنبھل اور پیلی بھیت وغیرہ شہروں میں ان کے بہت سے ارادت مند رہتے جو حاضرِ خدمت ہوتے اور استفادہ و استفاضہ کرتے۔

سید آل احمد سوانی نے اسی سال عمر پا کر ۱۲۵۹ھ میں اس دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کا سفر اختیار کیا۔[۳۱]

## ۳۔ سید آل حسن موہانی

سید آل حسن بن غلام سعید بن وجیہ الدین حسینی رضوی موہانی، تیرھویں ہجری کے فحول علمائے برصغیر میں سے تھے۔ ۱۲۰۲ھ میں ہندوستان کے شہر موہان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ مولانا جعفر علی کسمنڈوی (کسمنڈ، نواح لکھنؤ میں اس زمانے میں ایک قریہ تھا) اور دیگر علمائے عصر سے استفادہ کیا۔ پھر الہ آباد چلے گئے اور انگریزی حکومت کے اصحابِ منصب سے تقرب پیدا کیا اور جہاں آباد کوڑہ کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ایک مدت تک وہاں مقیم رہے۔ بعد ازاں "بندکی" میں تبادلہ ہو گیا۔ وہاں کافی عرصے تک خدمتِ قضا انجام دیتے رہے۔ اسی اثنا میں ان کے بعض دوست نما حریفوں نے ان پر رشوت کا الزام عائد کیا، جس کے نتیجے میں عہدۂ قضا سے معزول کر دیے

---

۳۱۔ حیات العلماء ص ۲۲، ۲۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲، ۳

گئے۔ چودہ سال اسی طرح گزر گئے۔ پھر سر سیّد احمد خاں نے ان کو دہلی بلالیا۔ کئی سال دہلی میں قیام رہا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مراد آباد چلے گئے، مراد آباد سے حیدر آباد پہنچے تو وہاں کے منصب قضا پر مامور ہوئے۔ خاصا عرصہ اس منصب پر متعین رہے۔ کبر سنی کو پہنچے تو واپس اپنے شہر "موہان" آ گئے اور وہیں وفات پائی۔

سیّد آل حسن موہانی اپنے عہد کے عالم، مناظر اور متکلم تھے۔ فقہ اور اصول فقہ میں درک رکھتے تھے، لیکن علم حدیث سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ تصنیف و تالیف کا اچھا خاصا ذوق تھا اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ عیسائیوں سے ان کی بحثیں رہتی تھیں۔ چنانچہ ردِّ عیسائیت میں "استفسار" اور "استبشار" کے نام سے دو مبسوط اور مدلّل کتابیں تصنیف کیں، جو مناظرہ و خلافیات کے نقطۂ نظر سے اہم کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ بعض مسائل میں مناظرانہ انداز کے اور بھی متعدد رسالے تحریر کیے۔

اس عالم و فقیہ نے ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ کو پچاسی ۸۵ سال کی عمر پا کر موہان میں وفات پائی۔[۴۷]

## ۴۔ شیخ ابراہیم باعکظہ سورتی

شیخ ابراہیم بن عبدالاحد سورتی، عالم کبیر اور فاضل اجلّ تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ قبیلہ "باعکظہ" سے تعلق رکھتے تھے۔ ولادت اور نشو و نما سورت میں ہوئی۔ اپنے والدِ بزرگ وار قاضی عبدالاحد سورتی (متوفی ۷ جمادی الاُخریٰ ۱۲۲۵ھ) اور دیگر علمائے وقت سے تحصیلِ علم کی۔

---

۴۷ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳، ۴۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۲۔ اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۶۱۔

پھر بمبئی کی جامع مسجد میں خطابت اور وہاں کے مدرسۂ محمدیہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ بمبئی کے ممتاز علما میں سے تھے اور علما کی کثیر تعداد ان سے مستفید ہوئی۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں دسترس رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب "تحفۃ الاخوان" ہے جو فقہ شافعی سے متعلق ہے۔ ایک کتاب کا نام "نعم الانتباہ" ہے۔ ۲۷ رجب ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی۔[۵]

## ۵۔ شیخ ابو تراب جعفری پھلواروی

شیخ ابو تراب بن نعمت اللہ بن مجیب اللہ ہاشمی جعفری، مرد پارسا اور فقہ و تصوّف کے ممتاز عالم تھے۔ ۲۷ شوال ۱۱۹۲ھ کو پھلواری میں پیدا ہوئے اور مولانا احمدی بن وحید الحق پھلواروی (متوفی غرّہ شعبان ۱۲۵۲ھ) سے کسبِ علم کیا اور اپنے والد مولانا نعمت اللہ پھلواروی (متوفی ۲۹ شعبان ۱۲۴۷ھ) سے طریقت و تصوّف کا درس لیا اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود مسندِ درس و افاضہ آراستہ کی اور خلقِ کثیر کو راہِ حق کی تعلیم دی۔

شیخ ابو تراب جعفری نے ۷۸ برس عمر پائی اور ۷ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو اپنے وطن پھلواری میں انتقال کیا۔ اپنے والد کے جوار میں آسودۂ لحد ہیں۔[۶]

## ۶۔ مولانا ابو الحسن فرنگی محلی

مولانا ابو الحسن بن عبد الجامع بن عبد النافع بن بحر العلوم عبد العلی بن

---

[۵] تذکرہ علمائے ہند ص ۵ ۔۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۵۔

[۶] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۹، ۱۰ بحوالہ شجرہ شیخ بدر الدین۔

نظام الدین بن قطب الدین انصاری فرنگی محلی، درسِ نظامیہ کے بانی مولانا نظام الدین انصاری سہالوی کی اولاد سے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ وہیں شیخ عبدالحکیم لکھنوی (متوفی ۲۴ صفر ۱۲۸۶ھ) اور دیگر علما سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ شیخ عبدالوالی لکھنوی (متوفی ۲۲ شعبان ۱۲۷۹ھ) سے اخذِ طریقت کیا۔ پھر خود درس و افادہ میں مصروف ہوئے اور مدتِ دراز تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ فرنگی محل لکھنؤ کے فقہائے حنفیہ میں بڑی عزت و تکریم کے مالک تھے۔ حیوانات کی حلّت و حرمت کے موضوع پر "تمییز الکلام فی بیان الحلال والحرام" کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا۔ اپنے زمانے کے جیّد عالم تھے۔ ۷ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ کو لکھنؤ میں فوت ہوئے۔[۵۷]

## ۷۔ مولانا ابوالحیات پھلواروی

مولانا ابوالحیات بن نعمت اللہ بن مجیب اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی شیخ ابوتراب پھلواروی کے بھائی تھے۔ فقہ اور تصوف کے نامور عالم تھے۔ غرۂ ذی قعدہ ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور مولانا احمدی بن وحیدالحق پھلواروی سے تحصیل کی۔ اپنے والدِ گرامی مولانا نعمت اللہ پھلواروی سے اخذِ طریقت کیا اور طویل عرصے تک ان سے مستفیض ہوتے رہے۔ علوم ظاہری و باطنی سے فارغ ہوئے تو خود درس و افادہ کی طرح ڈالی اور بہت سے لوگوں کو نعمتِ علم سے آراستہ کیا۔ ۲۶ رمضان ۱۲۷۶ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔[۵۸]

---

۵۷۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۱۱۲۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۴۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۱

۵۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۳ بحوالہ شجرہ شیخ بدرالدین۔

# ۸- شیخ ابوسعید مجددی دہلوی

برصغیر کے جلیل القدر علما اور رفیع المرتبت فقہا میں شیخ ابوسعید مجددی دہلوی کا نامِ نامی قابلِ ذکر ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابوسعید بن صفی القدر بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن محمد معصوم بن حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی۔!

شیخ ابوسعید کا خاندان علم و طریقت اور فضیلت و کمال کے اعتبار سے ہندوستان کا مشہور ترین خاندان ہے۔ کئی پشتوں تک اس کو گہوارۂ علم کی حیثیت حاصل رہی۔ اس خاندان میں جن نامور شخصیتوں نے جنم لیا، ان میں صاحبِ ترجمہ شیخ ابوسعید بھی شامل ہیں۔

شیخ ابوسعید مسلکاً حنفی تھے اور حدیث و فقہ میں اپنے عصر کے یگانۂ روزگار تھے۔ ۲ ذیقعدہ ۱۱۹۶ھ کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ صغرسنی میں قرآن مجید حفظ کیا اور تجوید سیکھی۔ بعد ازاں مفتی شرف الدین رام پوری (متوفی ۵ شعبان ۱۲۶۸ھ) سے درسی کتابیں پڑھیں۔ بعض کتابوں کی تکمیل شاہ رفیع الدین دہلوی (متوفی ۶ شوال ۱۲۳۳ھ) سے کی، جن میں قاضی مبارک کی شرح سلّم اور صحیح مسلم شامل ہیں۔ پھر اپنے خالو شیخ سراج احمد رام پوری (متوفی ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ) سے حدیث کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۷ شوال ۱۲۳۹ھ) سے سند و اجازۂ عام کا شرف حاصل کیا۔ بعض دیگر علمائے عصر سے بھی مستفید ہوئے اور سندِ حدیث لی۔ تصوّف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس کے لیے شاہ غلام علی سے بیعت کی اور ان کی وفات کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسندِ دعوت و ارشاد بچھائی۔ ہزاروں بندگانِ خدا ان سے فیض یاب ہوئے۔ حج و زیارت کا شرف بھی حاصل

کیا۔ مکہ مکرمہ گئے تو ان کی شہرتِ علمی سن کر شافعی اور حنفی علما نے ان کا شاندار استقبال کیا اور خندہ پیشانی سے ملے۔ ان کی تصانیف میں ایک کتاب "ہدایۃ الطالبین" ہے اور فارسی میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا نور احمد نے کیا۔ مع ترجمہ کے یہ کتاب ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۶ء) میں امرتسر میں شائع ہوئی۔

شاہ ابو سعید کے علم و فضل کے بارے میں مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

جامع بود میانِ علوم ظاہری و باطنی و فقہ و حدیث و تفسیر۔

علوم ظاہری و باطنی کے ماہر اور تفسیر، حدیث و فقہ کے جامع۔

قرآن مجید کے حافظ تھے، اور آواز نہایت مؤثر اور شاندار تھی۔ سرسید لکھتے ہیں:

علم قرآن میں یکتائے روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور کمالِ قرأت سے پڑھتے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے تھے۔

اتباعِ سنت کا خاص طور سے اہتمام کرتے، لوگوں کو بھی یہی تلقین فرماتے۔ نورانی شکل تھے۔ طبیعت میں بے حد انکسار اور تواضع تھی۔ متحمل مزاج اور نرم دل تھے۔ اللہ نے حسنِ اخلاق کی دولت سے خوب نوازا تھا، ہر شخص سے نہایت متواضع ہو کر ملتے۔ وقت کا زیادہ حصہ دینی علوم کی تعلیم و تدریس میں صرف کرتے۔ اس سے فارغ ہوتے تو تلاوتِ قرآن میں مصروف ہو جاتے۔ شاہ غلام علی کی وفات کے بعد نو یا دس سال تک، ان کے سجادہ پر متمکن رہے اور ہمیشہ لوگوں کو اتباعِ سنت کی تلقین فرماتے رہے۔

آخرِ عمر میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹونک کے مقام پر پہنچے تو عید الفطر کے روز ۱۲۴۹ کو وہیں انتقال کر گئے۔ نمازِ جنازہ میں امیر ٹونک نواب وزیر الدولہ اور بہت سے امرائے مملکت اور شہریوں نے شرکت کی۔ جنازے کی نماز ٹونک کے قاضی مولانا خلیل الرحمٰن رام پوری نے پڑھائی۔

شیخ ابو سعید کے ایک صاحبزادے شاہ عبدالغنی مجددی (متوفی محرم ۱۲۹۶ھ) تھے جو برصغیر پاک و ہند کے مشہور فاضل اور علامۂ عصر تھے، وفات کے وقت وہ ان کے پاس موجود تھے۔ وہ والد کی میت ٹونک سے دہلی لے گئے اور وہاں انھیں شاہ غلام علی اور مرزا مظہر جان جاناں کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ ۹؎

## ۹۔ حکیم ابو علی امروہوی

حکیم ابو علی بن غلام علی امروہوی شیعہ تھے۔ ۱۲۰۲ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ایک شیعہ عالم سید محمد عبادت امروہوی سے حدیث، فقہ اور علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ طب کی کتابیں رضی الدین امروہوی (متوفی ماہِ رمضان ۱۲۰۳ھ) سے پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پچیس سال تک "باندہ" شہر میں درس دیتے رہے۔ چند کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں ھادی المخالفین فی الرد علی تحفۃ المسلمین، حجیۃ الایمان، کشف الرین فی اثبات العزاء علی الحسین، تعلیقات علی طب اکبر اور فوائد الحسینیہ شامل ہیں۔ آخری دو کتابیں علم طب سے متعلق ہے۔

حکیم ابو علی امروہوی نے ۲۱ صفر ۱۲۷۲ھ کو رحلت کی۔ ۱۰؎

---

۹؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۴ —— حدائق الحنفیہ ص ۴۷۱، ۴۷۲ —— واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۳۹۳، ۳۹۴ —— آثار الصنادید ص ۲۱۳، ۲۱۴ —— خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۷۰۱ تا ۷۰۳ —— نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۳، ۱۴ —— تاریخی مقالات ص ۲۱۸ تا ۲۲۰۔

۱۰؎ تکملہ نجوم السماء، ص —— نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۷۔

## ۱۰۔ سیّد ابوالقاسم تستری نواب میر عالم خاں

سیّد ابوالقاسم بن رضی حسینی الجزائری تستری، نواب میر عالم خاں کے لقب سے ملقب تھے اور ارکانِ سیاست و حکومت میں سے تھے۔ مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے والد سیّد رضی تستری جو ممتاز شیعہ عالم تھے، حیدرآباد (دکن) آئے اور اربابِ حکومت سے تقرب پیدا کیا۔ مختلف خدمات کے صلے میں حیدرآباد کے قریب "پٹن چیرو" کے مقام میں حکومت حیدرآباد کی طرف سے ان کو جاگیریں عطا کی گئیں، جن سے اس زمانے میں ان کو تین ہزار روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔

سیّد رضی تستری کے دو بیٹے تھے۔ ان میں ایک ابوالقاسم تھے، جنھوں نے اپنے علم و فراست کی بنا پر حیدرآباد کی سیاست و امارت میں بڑی شہرت حاصل کی۔ ابوالقاسم کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی، تربیت اور نشوونما بھی وہیں پائی۔ ان کے والد سیّد رضی فاضل آدمی تھے، بیٹے نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔ لغت، تاریخ اور معقولات میں بھی ماہر ہوئے اور اپنے اقران و معاصرین میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ تکمیلِ علم کے بعد ایوانِ حکومت سے وابستگی اختیار کی اور والیِ ریاست سے قرب پیدا کیا۔

اس زمانے میں سلطنتِ حیدرآباد کا حکمران نظام علی خاں آصف جاہ تھا، جس نے ۱۷۶۲ سے ۱۸۰۳ تک کم و بیش بیالیس سال حکومت کی اور اکہتر سال برس عمر پاکر انتقال کیا۔ ریاست کا وزیرِ اعظم ارسطو جاہ تھا۔

تاریخ ہند میں اس عہد کو سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کے عہدِ زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ مغلوں کی مرکزی حکومت دم توڑ رہی تھی اور ملک میں کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں۔ انگریز کو اسی زمانے میں یہاں قدم جمانے اور حکومت قائم کرنے کا موقع ملا۔ حیدرآباد کے

پڑوس میں میسور کی سلطنتِ خداداد بھی اسی زمانے میں معرضِ قیام میں آئی جس کا بانی حیدر علی تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ٹیپو سلطان اس کا حکمران ہوا۔ یہ باپ بیٹا دونوں انگریزوں کے خلاف تھے، لیکن حیدر آباد کے اربابِ سلطنت ٹیپو کے مخالف اور انگریزوں کے حامی تھے۔[1]

سید ابوالقاسم تستری نے جو حیدر آباد کی سرکار میں اچھے منصب پر فائز تھے، ہر موقع پر انگریز کی حمایت کی۔ چنانچہ ٹیپو کے خلاف انگریزوں نے جو آخری جنگ لڑی اور اس کے غدار ساتھیوں سے ساز باز کر کے بے خبری میں اس پر حملہ کیا تو حیدر آباد کی فوج بھی اس میں انگریزوں کی معاون تھی اور اس کی کمان یہی سید ابوالقاسم میر عالم خاں کر رہے تھے۔ یہ ٹیپو کو اپنا حریف اور شدید دشمن قرار دیتے تھے۔ ٹیپو کی شہادت کے بعد جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ پیش آیا تو میر عالم خاں نے بھی حیدر آباد کی فوج کے لیے حصہ طلب کیا، لیکن جنرل ہارس نے ان کو یہ جواب دیا کہ جس قلعے میں ٹیپو محصور تھا، وہ انگریزی فوج نے فتح کیا ہے، حیدر آباد کی فوج کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں دیا جا سکتا۔[2]

اس ضمن میں تاریخ نظام علی خاں میں مرقوم ہے کہ وزیر اعظم ارسطو جاہ اور میر عالم نے لارڈ ولزلی سے جنرل ہارس کے اس رویے کی شکایت کی۔ لیکن جب انگریز تمام مالِ غنیمت تقسیم کر چکے اور باقی کچھ نہ رہا تو سلطان کے ان کثیر التعداد شیروں پر نظر پڑی جو محل میں زنجیروں میں جکڑے ہوتے تھے۔ جنگ کی ہلاکت آفرینیوں کے باعث ان کی حفاظت و پرداخت کی ذمے داری کوئی شخص قبول کرنے کو تیار نہ تھا اور وہ کئی روز کی بھوک پیاس

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے فقہائے ہند جلد پنجم حصہ دوم ص ۸۳ تا ۹۵
[2] تاریخ سلطنت خداداد، ص ۴۳۶۔

سے بے تاب ہو کر وحشت ناک صورت حال سے دو چار تھے۔ لارڈ ولزلی اس مشکل میں پھنسا ہوا تھا کہ اس "مالِ غنیمت" کو کس کے حوالے کیا جائے۔ چنانچہ میر عالم سپہ سالارِ افواجِ حیدر آباد سے کہا گیا کہ اگر وہ چاہے تو ان تمام شیروں کو لے جا سکتا ہے۔ مگر میر عالم نے ان کو قبول کرنے سے اظہارِ معذرت کیا۔ اس کے بعد سلطان کے ان محبوب شیروں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔[۱۳]

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد حیدر آباد کے حکمران اور وزیر اعظم ارسطو جاہ اور میر عالم نے اس کے بیٹوں کی بھی مخالفت کی۔ چنانچہ جب سلطنت خداداد کے حصے بخرے کیے جا رہے تھے اور مختلف فریق اس میں سے اپنے اپنے حصے کے لیے انگریز کے حضور کاسۂ گدائی پیش کر رہے تھے تو یہ سوال سامنے آیا کہ ٹیپو کے بیٹوں کا مستقبل کیا ہو؟ اور ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے۔ اس کے لیے جو کمیشن مقرر کیا گیا، اس میں انگریزوں نے مشورے کے لیے ریاست حیدر آباد کی طرف سے میر عالم خاں کو منتخب کیا۔ میر عالم خاں کا موقف یہ تھا کہ نظام علی خاں والیٔ حیدر آباد اس جنگ میں انگریزوں کا حلیف ہے اور ٹیپو کے بیٹوں کو میسور کا تختِ سلطنت دینے کے خلاف ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے کمیشن کے سامنے حیدر آباد کے وزیر اعظم ارسطو جاہ کا ایک خط پیش کیا، جس میں ارسطو جاہ نے میر عالم کو مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کیے تھے:

ٹیپو سلطان کے فرزندوں اور پسماندگان نے انگریزی کمپنی کے ذریعے جو یہ استدعا کی ہے کہ ان کی پرورش اور اخراجات کے لیے انھیں نصف حصۂ ملک اور نصف خزانہ ملنا چاہیے، صحیح نہیں۔ تم کیوں یہ نہیں کہتے کہ قلعہ ہم نے فتح کیا ہے اور ٹیپو کے بیٹے اور

---

[۱۳] تاریخ سلطنتِ خداداد ص ۳۳۶، ۳۳۷۔

پسماندگان اسیرانِ جنگ ہیں سے ہیں۔ ان کو صرف اتنا ہی دینا چاہیے جو قوت لایموت ہو، اور جس سے ان کا معمولی گزارا ہو سکے۔[۱۴]

پھر اسی خط میں ارسطو جاہ نے کمیشن کو خطاب کرتے ہوئے لکھا:

ہمیں یقین ہے کہ ٹیپو سلطان کے بیٹوں اور پسماندگان کو اسی قدر دیا جائے گا، جس قدر کہ سرکار حیدر آباد چاہتی ہے اور جس کا اظہار میر عالم نے کر دیا ہے۔ نصف ملک ان کو ہرگز نہ دیا جائے۔[۱۵]

کمیشن نے اپنے دلائل پیش کرنے اور حیدر آباد کی رائے سے مطلع ہونے کے بعد اس سلسلے میں سلطان کے امراء و وزرا سے بھی رائے لی تو میر غلام علی لنگڑے نے اس فارسی میں محاورے میں جواب دیا:

"افعی را کشتن و بچہ اش را نگاہ داشتن کارِ خردمنداں نیست"

سلطنتِ میسور کے مستقبل سے متعلق تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کمیشن نے سلطان ٹیپو کے بیٹوں کو تخت سے محروم کر دیا اور لارڈ ولزلی سے سفارش کی کہ اگر یہ سلطنت اس کے سابق حکمران ہندو خاندان کو تفویض کر دی جائے تو یہ فیصلہ عین مصلحتِ وقت کے مطابق ہوگا۔ اس سے وہ سب خدشات رفع ہو جائیں گے جن کا شہزادوں کو تخت دینے کی بنا پر پیدا ہو جانے کا کسی وقت بھی امکان ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے طرزِ عمل، انسانیت اور فیاضی کا بھی یہی تقاضا ہے۔

یہ فیصلہ پڑھنے کے بعد ولزلی نے سلطنتِ خداداد کو درج ذیل طریقے سے تقسیم کر دیا:

۱۔ تمام اضلاع کرناٹک، پائیں گھاٹ اور ساحلی علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی

---

[۱۴] سوانح میر عالم ص ۸۹۔

[۱۵] ایضاً

کو دے دیا گیا۔

۲۔ ضلع اننت پور، کڑپہ کرنول اور بلاری نظام حیدر آباد کو دیے گئے۔

۳۔ تنگ بھدرا سے شمال تک کا سارا علاقہ اس شرط پر مرہٹوں کے لیے محفوظ رکھا گیا کہ وہ آئندہ انگریزوں کی پالیسی پر عمل کریں گے۔

۴۔ ملک کا باقی حصہ (جو بعد میں ریاست میسور کے نام سے موسوم ہوا) میسور کے قدیم ہندو خاندانِ راجگان کے حوالے کیا گیا۔

۵۔ سرنگاپٹم کا جزیرہ انگریزوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔

۶۔ طے کیا کہ سالانہ خراج سات لاکھ پگوڈا (سکۂ رائج الوقت) ادا کیے جائیں۔

۷۔ ریاست کے نظم و نسق کی نگرانی کے لیے ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا۔

اس کے بعد ۱۸ جون ۱۷۹۹ کو سلطان ٹیپو مرحوم کے بارہ بیٹوں، ایک بیٹی اور خاندان کے تمام افراد کو انگریزوں نے جبراً میسور سے نکال کر ویلور بھیج دیا۔ ان کے اخراجات کے لیے دو لاکھ چوبیس ہزار پگوڈا سالانہ رقم مقرر کی گئی، جو اُس زمانے میں سات لاکھ بیس ہزار روپے کے برابر تھی — ٹیپو کے خاندان کا کوئی فرد اپنی سابق سلطنت میں باقی نہیں رہنے دیا گیا پھر ۱۸۰۷ء میں اس خاندان کو ویلور سے نکال کر کلکتے منتقل کر دیا گیا۔

سلطنتِ خداداد کی تقسیم وغیرہ کے مراحل طے کرنے کے لیے ایک عہد نامہ لکھا گیا، جس پر نظام حیدر آباد نے ۱۳ جون ۱۷۹۹ء کو اور لارڈ ولزلی نے ۲۶ جون ۱۷۹۹ کو دستخط کیے۔

سلطان ٹیپو کے خاندان اور شہزادوں کو رخصت کرنے کے بعد ۳۰ جون ۱۷۹۹ کو نئے راجہ کو میسور کے تختِ حکومت پر بٹھا دیا گیا۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جنرل ہارس اور حیدر آباد کی طرف سے بھی سیّد ابوالقاسم میر عالم اعزاز کے ساتھ نئے راجہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر لائے اور تختِ حکومت پر بٹھایا۔

ان تمام امور سے فارغ ہو کر سید ابو القاسم واپس حیدر آباد آئے تو ان کی طرف سے وزیر اعظم ارسطو جاہ کی آنکھیں بدل چکی تھیں اور اس کے دل میں ان کے بارے میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ اس کو الگ کر کے خود حیدر آباد کے منصب وزارت پر متمکن ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ریاست کی خدمت اور ٹیپو کے خلاف تلوار اٹھانے کا صلہ انھیں یہ ملا کہ اپنے عہدے سے معزول کر دیئے گئے اور گھر جا کر بیٹھ گئے۔ ایک عرصے تک یہی صورتِ حال رہی۔ پھر جب ارسطو جاہ اور والیِ حیدر آباد نظام علی خاں وفات پا گئے اور ۱۸۰۳ء میں نظام علی خاں کا بیٹا سکندر جاہ حیدر آباد کا والی بنا تو انگریزوں کی سفارش سے سید ابو القاسم کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

چونکہ سید ابو القاسم انگریزوں کے حامی اور بہی خواہ تھے، اس لیے انگریز ان سے بہت خوش تھے اور چاہتے تھے کہ یہ اقتدار میں رہیں۔ سکندر جاہ ان کو وزیر اعظم بنانا نہیں چاہتا تھا، اس کے علاوہ ریاست کے باشندے جن میں عوام و خواص سب شامل تھے، ان کو عہدۂ وزارت تفویض کرنے کے حق میں نہ تھے۔ اس سلسلے میں ان کے خلاف ہنگامے بھی ہوئے اور یہ ہنگامے اتنے شدید اور ہمہ گیر تھے کہ انھیں ریزیڈنسی میں پناہ لینا پڑی۔ لیکن اس وقت کا انگریز ریذیڈنٹ ان کا حامی تھا اور وہ ہر صورت میں ان کو وزیر اعظم بنانا چاہتا تھا، لہٰذا سکندر جاہ کو مجبوراً ابو القاسم کے بعض بڑے بڑے مخالفوں کو کاروبارِ حکومت سے الگ کر کے انھیں وزیر اعظم مقرر کرنا پڑا۔

بہرحال سید ابو القاسم تستری اپنے دور کے ممتاز شیعہ عالم اور فقیہ تھے۔ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں حیدر آباد جن سیاسی حالات و کوائف سے دوچار تھا، اس میں ان کی مساعی کا ذکر تاریخِ دکن میں خاصی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ انھوں نے خود بھی حدیقۃ العالم کے نام سے دکن کی تاریخ دو جلدوں میں قلم بند کی ہے۔

## ۱۱- مفتی احسان علی پھلواروی

مفتی احسان علی بن امان علی پھلواروی، فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ مولانا احمدی بن وحید الحق جعفری پھلواروی کے شاگرد تھے۔ خاصی مدت ان کی خدمت میں رہے اور تحصیل علم کی۔ فراغت کے بعد خود مسندِ درس بچھائی اور افتا کا سلسلہ شروع کیا۔ بہت سے اہلِ علم نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۵ رمضان ۱۲۶۷ھ کو فوت ہوئے [۱۶]

## ۱۲- مولانا احسان غنی دلموی

مولانا احسان غنی بن جعفر دلموی، حنفی المسلک فقیہ تھے۔ مضافاتِ لکھنؤ میں موضع "دلمؤ" کے باشندے تھے۔ عالم باعمل اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ اپنے علاقے اور زمانے کے نامور مفتی تھے۔ ہر وقت درس و افادہ میں مشغول رہتے۔ گھر اور مسجد کے علاوہ کہیں آنا جانا نہ تھا۔ ماہِ رجب ۱۲۸۱ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا [۱۷]

## ۱۳- شیخ احمد سندیلوی

شیخ احمد بن عبداللہ حسینی سندیلوی، احمد بخش کے نام سے معروف تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ مولد و منشا سندیلہ ہے جو صوبہ یوپی میں واقع ہے۔ اپنے والد ماجد شیخ عبداللہ سندیلوی، شیخ اعزالدین سندیلوی (متوفی ۸ اصفر ۱۲۵۶ھ) اور شیخ حیدر علی صدیقی سندیلوی (متوفی ۶ رجب

---

[۱۶] نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۲۰ بحوالہ تاریخ الکملا۔

[۱۷] تذکرہ علمائے ہند، ص ۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۲۱

۱۲۲۵ھ) سے اخذ علم کیا۔ طریقت و تصوّف کا درس اپنے والدِ مکرم شیخ عبداللہ سندیلوی سے لیا جو اپنے وقت اور علاقے کے شیخ طریقت تھے۔ پھر ان کی مسندِ مشیخت پر بیٹھے۔ کچھ وقت کے لیے طالبانِ علم کو درس بھی دیتے تھے تیرھویں صدی ہجری کے یہ عالم و فقیہ سندیلہ میں مدفون ہیں [۱۸]

## ۱۴- شیخ احمد گجراتی

شیخ احمد بن محمد گجراتی سورتی، اہل علم و فضل بزرگ تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں ممتاز تھے۔ ولادت و نشو و نما سورت میں ہوئی۔ اپنے زمانے کے نامور عالم سید محمد ہادی سورتی سے تحصیل علم کی اور طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر درس و تدریس کا منصب سنبھالا اور علماء و طلبا کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۵۵ھ کو وفات پائی۔[۱۹]

## ۱۵- شیخ احمد بھنھانی اصفہانی

شیخ احمد بن محمد باقر بھنھانی اصفہانی، مشہور شیعہ عالم اور معروف فاضل تھے۔ محرم ۱۱۹۱ھ میں کرمان شاہ میں پیدا ہوئے اور بہت سے اہل علم سے استفادہ کیا۔ اپنے والدِ گرامی شیخ محمد باقر سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ پھر نجف گئے، وہاں کے متعدد شیعہ فضلا سے اخذِ علم کیا۔ نجف سے مسقط روانہ ہوئے پھر ۱۲۲۳ھ میں ہندوستان آئے اور حیدر آباد (دکن) میں قیام کیا۔ اس زمانے میں حیدر آباد میں سید ابوالقاسم تستری حکومت کے اچھے منصب پر فائز تھے اور نامور شیعہ عالم تھے [۲۰] شیخ احمد بھنھانی انہی کے ہاں مقیم ہوئے۔

---

[۱۸] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۷

[۱۹] حدیقۃ احمدیہ ص — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۲

[۲۰] سید ابوالقاسم تستری کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

حیدر آباد سے فیض آباد چلے گئے اور پھر نواب سعادت علی خاں (متوفی ماہِ رجب ۱۲۲۹ھ) کے عہد میں لکھنؤ کا عزم کیا۔

لکھنؤ کے نواب اور حکمران چونکہ شیعہ تھے اس لیے بہت سے شیعہ اہل علم نے اس عہد میں لکھنؤ کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ شیخ احمد کھنھانی نے فیض آباد اور لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں، اس سے پہلے بھی وہ کچھ کتابیں لکھ چکے تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں :

۱- المحمودیہ حاشیۃ الصمدیہ : یہ کتاب انھوں نے صرف پندرہ سال کی عمر میں تصنیف کی۔

۲- نور الانوار : یہ کتاب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر ہے۔

۳- الدرر الغرویہ فی اصول الاحکام الالٰھیہ۔

۴- شرح المختصر النافع الیٰ مبحث الغسل۔

۵- قوت لایموت : یہ ایک رسالہ ہے جو نماز اور روزے کے احکام سے متعلق ہے۔

۶- مخزن القوت : یہ قوت لایموت کی شرح ہے، جو قیام فیض آباد کے زمانے میں سپردِ قلم کی۔

۷- تحفۃ المحبین فی فضائل الائمۃ الطاہرین : یہ کتاب بھی فیض آباد میں تصنیف کی۔

۸- اثبات الخلافہ : یہ ایک رسالہ ہے جس میں مصنف نے اس مسئلے کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے کہ حضرت علی خلیفہ بلا فصل تھے۔ یہ رسالہ بھی فیض آباد میں لکھا۔

۹- نیک و بد ایام : یہ تاریخ کی کتاب ہے جو فیض آباد میں تصنیف کی۔

۱۰- تحفۃ الاخوان : یہ بھی تاریخ سے متعلق ہے اور حیدر آباد میں تصنیف کی۔

۱۱- عقد الجواہر الحسان : یہ بھی حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں تصنیف کی۔

۱۲- تنبیہ الغالین : یہ کتاب لکھنؤ میں تحریر کی گئی۔

۱۳- کشف الرین والمین عن حکم صلوٰۃ الجمعۃ والعیدین

۱۴- مرآۃ الاحوال۔

۱۵- کشف الشبہہ عن حکم المتعہ۔

شیخ احمد بہبہانی اصفہانی ممتاز شیعہ فقیہ اور مصنف تھے۔ ان کتب و رسائل کے علاوہ انھوں نے اور بھی بعض رسالے تصنیف کیے[۱۲۱]

## ۱۶- شیخ احمد رام پوری

شیخ احمد بن محمد سعید افغانی رام پوری، فقہ و اصول کے مشہور افاضل میں سے تھے۔ عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ خلق کثیر نے ان سے کسب علم کیا۔ ان کی تصنیفات میں سے "متفرقاتِ احمدیہ" ہے جو عربی زبان میں ہے اور دو جلدوں میں ہے۔ یہ در اصل ان کے فتوے ہیں، جو انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے سوالات کے جواب میں لکھے۔ یہ مجموعہ ان کی فقاہت اور مسائل میں درک و انہماک کی نشان دہی کرتا اور فقہ میں ان کی وسعتِ نظر کا پتا دیتا ہے۔

شیخ احمد رام پوری نے فارسی زبان میں شرح تہذیب المنطق بھی لکھی۔ علاوہ ازیں طب کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی۔ وراثت کے بارے میں بھی ایک کتاب قلم بند کی۔

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے اس ہندی فقیہ

---

[۱۲۱] نجوم السماء ص۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۲، ۳۳۔

نے رام پور (یوپی) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے[۲۲]

## ۱۷- شیخ احمد کشمیری

شیخ احمد بن مصطفیٰ رفیقی کشمیری کی کنیت ابوالطیب تھی۔ فقہ و اصول کے نامور فاضل تھے۔ علم حدیث میں بھی بہرۂ وافر حاصل تھا۔ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے والدِ محترم شیخ مصطفیٰ رفیقی کشمیری (متوفی ۱۴ ربیع الاول ۱۲۹۴ھ) سے علم حاصل کیا۔ ان کے نانا شیخ عبداللہ کشمیری اور ماموں شیخ نورالہدیٰ بیسوی کشمیری بھی دیارِ کشمیر کے جلیل القدر علما میں سے تھے، ان سے بھی اخذِ علم کیا۔ یہاں تک کہ حدیث، فقہ، سیرت اور تصوّف و شعر وغیرہ میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ پھر خود مسندِ تدریس پر بیٹھے اور علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے روحانی اور علمی فیض حاصل کیا۔ سلوک و طریقت میں بھی درک رکھتے تھے اور ایک متقی اور پارسا بزرگ کی حیثیت سے معروف تھے۔[۲۳]

## ۱۸- شیخ احمد کشمیری

کشمیر کی سرسبز و شاداب وادی میں جن علما و فقہا نے شہرتِ دوام حاصل کی اور تاریخ علم و فضل کے اوراق پر ہمیشہ کے لیے اپنا نام ثبت کر گئے ان میں شیخ احمد بن نعیم بن نعیم کشمیری کا نام قابلِ ذکر ہے۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے اس صاحبِ کمال فقیہ کا مولد و منشا سری نگر ہے۔ سنِ شعور کو پہنچے تو قاضی جمال الدین کشمیری (متوفی ۲۶ شعبان ۱۲۴۳ھ) سے حصولِ علم کیا۔ دل میں قرأت و تجوید کا شوق ابھرا تو قاری عباد اللہ کی خدمت

---

۲۲- نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۳۵۔

۲۳- حدائق الحنفیہ ص ۶۳۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۳۵۔

یں گئے اور ان سے اس فن کی تکمیل کی۔ پھر طریقت وسلوک کا جذبہ بیدار ہوا تو اپنے ہم وطن شیخ محمد اکبر کشمیریؒ (متوفی ۱۲۷۲ھ) سے منسلک ہوئے۔ مدتِ دراز تک ان کی صحبت وملازمت اختیار کیے رکھی۔ بعد ازاں خود مسندِ دعوت و ارشاد پر متمکن ہوئے اور بلادِ کشمیر میں اللہ نے ان کو قبولِ عام اور ہمہ گیر شہرت سے نوازا۔

حنفی المسلک تھے اور شریعتِ حنفہ کی تبلیغ و اشاعت کے بارے میں نہایت متصلب ومتشدد تھے۔ اہلِ بدعت اور اصحابِ اہوا وشرک کو سختی سے ہدفِ تنقید ٹھہراتے۔ دین کا معاملہ آتا تو کسی کی پروا نہ کرتے اور ناروا رسوم ورواج کی شدت سے تردید فرماتے۔ تجرید وسلوک کے موضوع سے متعلق چند رسائل بھی تحریر کیے۔

وادیٔ کشمیر کے اس عالم وفقیہ نے ۱۷ رجب ۱۲۷۸ھ کو اس جہانِ فانی سے رختِ سفر باندھا اور جنت الفردوس کی راہ لی[۲۴]

## ۱۹۔ مفتی احمد فرنگی محلی

نواحِ لکھنؤ میں سہالی کے اربابِ علم کا خاندان جس نے بعد میں فرنگی محل کا قالب اختیار کیا، فضل وکمال میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس خاندان کا ہر فرد آسمانِ علم کا روشن ستارہ تھا۔ اس کے ایک فرد مفتی احمد بن یعقوب بن عبدالعزیز بن محمد سعید بن قطب الدین انصاری سہالوی تھے جو لکھنؤ کے فرنگی محل میں اقامت گزین تھے، لہٰذا فرنگی محلی لکھنوی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کی کنیت ابوالرحیم تھی۔ ولادت لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں علم وفضل کی گود میں تربیت پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور اپنے والدِ مکرم شیخ محمد یعقوب فرنگی محلی (متوفی ۱۱۸۷ھ)

---

[۲۴] تاریخ کشمیر ص

— نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۸۔

سے تحصیل کی۔ مگر فاتحۃ الفراغ اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالقدوس فرنگی محلی لکھنوی سے پڑھا۔ کتبِ فقہ سے بالخصوص مزاولت رکھتے تھے اور اس موضوع کی جزئیات پر عبور حاصل تھا۔ نواب سعادت علی خاں نے ان کی فقہی شہرت سے متاثر ہو کر قضا و افتا کا منصب ان کے سپرد کر دیا تھا۔ تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ قضا و افتا کے فرائض بڑی دیانت داری کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ نواب موصوف ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ وہ ان کے کام سے ہمیشہ خوش رہا۔[۲۵]

## ۲۰۔ سید احمد حسن عرشی قنوجی

سید احمد حسن قنوجی، نواب سید صدیق حسن خان کے برادرِ کبیر تھے اور ان سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔ حسینی بخاری سید تھے۔ مسلک اہلِ حدیث کے عالم تھے۔ ۱۹ شعبان ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ کچھ بڑے ہوئے تو تکمیلِ تعلیم کے لیے کان پور، فرخ آباد، بریلی اور علی گڑھ کے مدارس میں حاضری دی اور وہاں کے جید علما کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ علی گڑھ میں شاہ عبدالجلیل کا غلغلۂ درس بلند تھا، اس میں شامل ہوتے۔ یہ وہی شاہ عبدالجلیل علی گڑھی ہیں جو حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے تلمیذ رشید اور بلند پایہ عالمِ دین تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ۷ محرم ۱۲۷۴ھ کو جامِ شہادت نوش کیا۔

شاہ عبدالجلیل کے علاوہ سید احمد حسن قنوجی نے شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی

---

۲۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۵ — تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۳۷ — احوال علمائے فرنگی محل ص ۱۶ — آثار الاول من علمائے فرنگی محل ص ۷ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۹۔

سے سندِ حدیث حاصل کی۔

سیّد احمد حسن قنوجی مروّجہ علومِ عربیہ میں کامل اور حدیث و فقہ میں یگانہ تھے۔ ذکاوت و فطانت میں مشہور، قوتِ حفظ میں منفرد، ذہانت میں بے مثل اور جودتِ طبع میں اپنے معاصرین سے فائق تر تھے۔ علوم معقول و منقول میں مرتبۂ کمال حاصل تھا۔ حدیث و سنت کے شیدائی اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر سختی سے پابند تھے۔ تقلیدِ شخصی کے خلاف اور اس پر تنقید کرتے تھے، چنانچہ ابتدائے عہد ہی میں ردِّ تقلید میں ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام "شہاب ثاقب" رکھا۔ اس میں حدیث و فقہ کی روشنی میں تقلید کی تردید کی ہے اور اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے نامور فقیہ اور جلیل القدر عالم تھے۔ چند اور کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن ان کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

بہت بہادر اور جری تھے۔ مجاہدانہ طبعیت کے مالک اور فنونِ سپاہ گری میں ماہر تھے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ عربی، فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے، اور عرشی تخلص کرتے تھے تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی اور اردو میں مرزا غالب سے مشورۂ سخن حاصل تھا۔ ایک شعر میں خود فرماتے ہیں:

مغلوب ہیں سب اہلِ جہاں میرے سخن سے ۔۔ ہوں زلّہ رُبا غالبِ اعجاز رقم کا

ذیل میں ان کے چند عربی، فارسی اور اردو کے اشعار درج کیے جاتے ہیں:

| | |
|---|---|
| نسیم الصبا وا فی سحیر امطیبا | فقلت له اهلاً وسهلاً و مرحبا |
| کانك انفاس المسیح بعینها | فاحییت صبا لم ینل قط مطلبا |
| فدیتك یا نعم الصبا خیر مقدم | فکل حمام حین اقبلت رحبا |
| تعاکی لك الاغصان بالوجد رافصًا | تضاهی لك الاطیار بالسجع مطربا |
| تنفخ فی الاشجار روحا تمیلها | فیالك ما ازهاك ضنعا و اعجبا |

اھل جئت من تلك الربی برسالۃ فان الحیا نعم الرسول لمن حیا

اب فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یارب چہ کنم جوہر شمشیر زباں را کز معرکہ پرداختہ دیدیم جہان را
عرشی صفت اندازہ شناسی بہ بیاں نیست ناساز کنم زمزمۂ مرغ جناں را
ہر موج بیانے کہ مرزبانے دلم خاست تا ساحل لب آمدہ برتافت عناں را
خون گشتہ ام اسالبِ من نالہ سرائیست چوں لالہ بدل سوختم آہنگ فغاں را

---

گرمیٔ عشق سوخت حاصلِ ما آتشی شیشہ است یا دلِ ما
نتواند کشید تیغ نظر چہ قدر نازک است قاتلِ ما

اب اردو کلام ملاحظہ ہو :

مجھے خوشی ہے ترے عشوہ ہائے پیہم کی رہے نہ کوئی ستم عذر امتحان کیلئے

---

شعلۂ عشق وہ ہے جس سے زمانہ جل جائے یوں تو پتھر کے بھی سینہ میں شرر ہوتا ہے

---

کیا اک بات میں جامہ سے باہر شب وصل اُس نے جب مجھ سے حیا کی
خود آرائی نہ چھوڑیں گے یہ کافر خدائی یوں تو برحق ہے خدا کی

---

سحر جو میں نے کہا قصور شب کا معاف تو ہنس کے بولے کہ چل دور ہو، ہوا سو ہوا

---

اب تو ہم شائستۂ آغوشِ دلبر ہو گئے ناتوانی میں جو گُل کھائے "مشجر" ہو گئے
جب سے ہم وابستۂ زلفِ معنبر ہو گئے آہ کے شعلے شرارِ عودِ مجمر ہو گئے
عشق سے چمکا ستارہ ہر بُتِ بے مہر کا آتشِ خورشید سے یہ سنگ جوہر ہو گئے
غش ہوئے پوشاک پر اس غیرتِ یوسف کی ہم دیکھ کر خورشید پہ شبنم کو ششدر ہو گئے

عرض کی میں نے جو وہ اصلاح بنوانے لگے
اب رقیب رُو سیہ حجّام اکثر ہو گئے
دل کو آئینہ بنایا ہم نے عشقِ یار سے
ہم بھی اب شایانِ اورنگِ سکندر ہو گئے

---

اک عمر سے ہے در پئے تکلیف رسانی
مُدّت سے یہ پھرتا ہے مرے خون کا پیاسا
اک قطرۂ سودا ہے مری آنکھ کی پُتلی
افسردگیِ پنجۂ غم سے ہے یہ نقشا
دریا ہیں اگر ہو مرے اشکوں کی حرارت
پیدا ہو حبابوں کی طرح موج سے شعلا
نیساں مرے مانند اگر گرم ٹپکا ہو
ہو جائے گہر سینہ کے اندر کا پھپھولا
اس درجہ میں اب فکر و تردد میں گھلا ہوں
اک نقطۂ وہمی ہے مرا جسم سراپا
ہر شکل سے تحصیل مطالب ہیں نظر کی
لیکن کبھی حاصل نہ ہوا کوئی نتیجا
بہتر نہیں تصریح پریشانیِ خاطر
کہتے ہیں کہ تصریح سے ابلغ ہے کنایا
کر ختم سخن عرشیؔ دلخستہ دعا پر
ہے جملہ مطالب کے لیے انسب و اولیٰ

سیّد احمد حسن عرشیؔ نے دو تین مرتبہ حجِ بیت اللہ کا ارادہ کیا لیکن اس زمانے میں پورے ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے جاری تھے، اس لیے ہر بار ان کی والدہ ماجدہ یہ کہہ کر روکتی رہیں کہ تھوڑے دن ٹھہر جاؤ، یہ ہنگامے ختم ہوں گے تو سب اکٹھے حج کو جائیں گے۔ کچھ دن تو وہ رُکے رہے، بالآخر غلبۂ شوق نے زیادہ شورش بپا کی تو تنہا ہی قنوج سے حج کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ بڑودہ (گجرات ہندوستان) پہنچے اور مولانا غلام حسنین بن مولانا رستم علی قنوجی کے مکان پر اترے۔ وہیں تپِ اسہالی میں مبتلا ہو کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ ان کی وفات کا سانحہ جمعۃ المبارک کے روز ۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۳ نومبر ۱۸۶۰ء) کو پیش آیا۔ وہیں دفن ہوئے۔

اس ذہین و فطین عالم و فقیہ نے صرف تیس سال سات مہینے بیس دن عمر پائی۔ یعنی عین عالمِ جوانی میں فوت ہوئے۔

مولانا غلام حسنین قنوجی نے اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع بذریعہ خط نواب

صدیق حسن خاں کو دی۔

سید احمد حسن قنوجی کی وفات کی تاریخ مولانا محمد عباس رفعتؔ نے اس قطعے میں کہی:

عرشیؔ عالی گہر احمد حسن ۔۔۔ در طفیل مصطفیٰ مغفور باد
رخت بر بست از جہاں سوئے بہشت ۔۔۔ زیر طوبیٰ ہم نشینِ حُور باد
گفت رفعت از پئے تاریخ او ۔۔۔ با امام المتقین محشور باد
۱۲۷۷ھ

سید احمد حسن عرشی قنوجی متعدد اعتبارات سے اپنے علاقے اور عصر کی ممتاز شخصیت تھے۔[۲۶]

## ۲۱- مولانا احمد سعید مجددی دہلوی

مولانا احمد سعید مجددی دہلوی کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے اکابر مشائخ اور فحول علمائے برصغیر میں ہوتا ہے۔ مولانا ابو سعید مجددی دہلوی کے بیٹے اور حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد سے تھے۔ غرہ ربیع الثانی ۱۲۱۷ھ میں بمقام رام پور پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی شیخ ابو سعید مجددی دہلوی اور مولانا سراج احمد رام پوری سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بعض کتب درسیہ کی تکمیل مفتی شرف الدین رام پوری سے کی۔ مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ کا عزم کیا، وہاں کچھ کتابیں شیخ محمد اشرف لکھنوی سے اور کچھ مولانا نور الحق لکھنوی کے حلقۂ درس میں مکمل کیں۔

لکھنؤ سے دہلی کا قصد کیا، وہاں مولانا فضل امام خیر آبادی اور مولانا

---

[۲۶] ابجد العلوم ص ۹۳۵، ۹۳۶ — التاج المکلل ص ۲۹۴، ۲۹۵ — اتحاف النبلاء ص ۲۲۲ تا ۲۳۰ — مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والاجاہی ج ۱ ص ۴۷ تا ۱۱۰ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۲۲ تا ۲۵ — تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۷۴ تا ۲۷۶۔

رشید الدین دہلوی کے درس میں شرکت کی اور ان سے استفادہ کیا۔ دہلی میں اس زمانے میں بہت سے اصحابِ کمال کے تعلیم و تدریس کے حلقے قائم تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزندانِ گرامی ــ شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز ــ مصروفِ درس و افادہ تھے۔ مولانا احمد سعید طلبِ علم کے لیے ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ کبھی تحقیقِ مسائل کے لیے اور کبھی سماعِ درس کے لیے۔ ان سے انھوں نے کسی نہ کسی انداز میں کافی استفادہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز سے تو صحاح ستہ، حصنِ حصین، دلائل الخیرات اور قول الجمیل، وغیرہ کا باقاعدہ شرفِ اجازہ بھی حاصل کیا۔

اس اثنا میں انھوں نے شیخ غلام علی کے بابِ تصوف و طریقت پر بھی دستک دی اور ان سے رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف، احیاء علوم الدین، نفحات الانس، رشحات عین الحیات، مثنوی مولانا روم اور مکتوباتِ مجدد الف ثانی کا درس لیا اور ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔

شیخ غلام علی ان پر بہت شفقت فرماتے اور ان سے نہایت لطف و کرم سے پیش آتے تھے۔ شیخ غلام علی کا رویہ مولانا احمد سعید سے بالکل وہی تھا جو باپ کا بیٹے سے ہوتا ہے۔ وہ انھیں تحصیل علم کی تلقین کرتے، قول و عمل میں ہم آہنگی اختیار کرنے کا درس دیتے اور ہمت و ثبوت اور جذبۂ صادقہ کے ساتھ تقویٰ و تدین کی راہ پر گامزن رہنے کی تاکید فرماتے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا احمد سعید مجددی معرفت و ادراک کے مرتبۂ بلند پر فائز ہوئے، تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز ہندی علما و فقہا کی صف میں انھیں نمایاں جگہ عطا ہوئی اور اپنے نامور والد مولانا ابوسعید مجددی دہلوی کی وفات کے بعد ان کی مسندِ مشیخت کو رونق بخشی۔ شیخ غلام علی سے اس عالی مرتبت عالم نے جو فیض حاصل کیا تھا، اس کی لوگوں کو خوب تلقین کی۔

مولانا ممدوح کو اللہ نے بے حد عزت و تکریم سے نوازا، عوام و خواص

میں حُسنِ قبول عطا فرمایا اور دور دراز سے حصولِ علم و فیض کے لیے کثیر تعداد میں لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ جب وہ ستاونؔ سال کی عمر کو پہنچے تو ان کا سلسلۂ رشد و ہدایت دُور دُور تک پھیل گیا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب رمضان ۱۲۷۳ھ (مئی ۱۸۵۷ء) میں ہندوستان ایک زبردست ہنگامے سے دوچار ہوا۔ دہلی کا شہر جو فضل و کمال کا مرکز تھا، انقلاب و تغیر کی بے پناہ لہروں کی زد میں آگیا اور تمام اقطارِ ہند میں جگہ جگہ بلوے ہونے لگے۔ خون ریزی، غصب و نہب، لوٹ کھسوٹ اور ہلاکت آفرینی کی کوئی حد نہ رہی۔ یوں تو پورے ملک کو ہلاکت آفرین ہنگاموں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، لیکن شہر دہلی بالخصوص ان کی زد میں تھا۔ پھر انگریزوں نے اس پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد جو ظلم و ستم کیا، اس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ قتل و غارت، لوٹ مار، تخریب کاری اور پھانسیاں، غرض یہ نہایت اذیت ناک اور الم انگیز دور تھا اور بڑے بڑے لوگوں کے دل دہل گئے تھے۔

لیکن اس تمام مدت میں مولانا احمد سعید مجددی نہایت اطمینان سے اپنی خانقاہ میں بیٹھے رہے۔ نہ دل میں گھبراہٹ پیدا ہوئی، نہ کسی قسم کے اضطراب کا اظہار ہوا، نہ چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے گئے۔ کامل دل جمعی اور سکون کے ساتھ رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

یہ وہ عالم دین تھے، جن کو تفسیر، حدیث اور فقہ میں درجۂ کمال حاصل تھا اور اسی کی روشنی میں مسائل شرعیہ کی وضاحت کرتے اور فتوے جاری فرماتے۔

مولانا ممدوح وقتی اور ہنگامی سیاست سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا محور صرف خدمتِ دین اور اشاعتِ اسلام تھا۔ سیاست سے ملوّث ہونے کی صورت میں خدمتِ دین میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے انھوں نے ۱۸۵۷ء کے ملک گیر ہنگاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا اور اپنے آپ کو صرف اشاعتِ علم اور تبلیغِ دین کے لیے وقف کیے رکھا۔ یہ ان کے

نزدیک کام کا ایک خاص دائرہ تھا، جس سے وہ قدم باہر نکالنے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگوں نے ان پر الزام عائد کیا کہ انھوں نے انگریزوں کو سرزمینِ ہندوستان سے باہر نکال دینے کا فتویٰ جاری کیا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی حکومت حالات پر قابو پانے کے بعد مولانا احمد سعید مجددی اور ان کے اہل و عیال کو گرفتار کرنے اور پھر انھیں سخت ترین سزا دینے کی تدبیریں سوچنے لگی، مگر بعد میں حالات میں کچھ تبدیلی آئی تو معاملہ ختم کر دیا گیا اور مولانا ممدوح اپنے اہل و عیال سمیت حجازِ مقدس چلے گئے۔

وہ آخر محرم ۱۲۷۴ھ کو دہلی سے روانہ ہوئے اور نو مہینے کے بعد شوال ۱۲۷۴ھ کو مکہ مکرمہ پہنچے۔ حج کے بعد مدینہ منورہ آئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے۔

مولانا احمد سعید مجددی اپنے دور میں برصغیر پاک و ہند کے جید عالم، نامور فقیہ اور معروف مدرس تھے۔ سلوک و طریقت میں بھی کامل تھے کئی کتابوں کے مصنف، تھے۔ ان کی تصنیفات میں "الفوائد الضابطہ فی اثبات الرابطہ"، تصحیح المسائل فی ردّ علی مائۃ مسائل اور الانہار الاربعہ شامل ہیں۔

تذکرہ کاملانِ رام پور میں مرقوم ہے کہ انھوں نے ایک کتاب اہلِ حدیث کے رد میں لکھی، جس کا نام "حق المبین فی الرد الوھابیین" ہے۔

مولانا ممدوح نے منگل کے دن نماز ظہر کے بعد ۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مرقد کے قریب دفن کیے گئے۔[۷۶]

---

[۷۶] واقعات دارالحکومت دہلی ج ۳ ص ۳۹۴، ۳۹۵ — آثار الصنادید ص ۲۱۵ — تذکرہ اولیائے دہلی ص ۱۳۴ — حدائق الحنفیہ ص ۴۷۹، ۴۸۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۴۰ تا ۴۲ — تذکرہ کاملانِ رام پور ص ۳۰ — تاریخی مقالات ص ۲۲۰ تا ۲۲۲۔

# ۲۲۔ مولانا احمد علی سہارن پوری

یو۔ پی کے شہر سہارن پور کی خاکِ مردم خیز سے تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں جن حضراتِ علما نے جنم لیا اور فضل و کمال میں شہرتِ دوام حاصل کی ان میں مولانا احمد علی سہارن پوری کا نام نامی خاص طور سے لائقِ تذکرہ ہے، وہ انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سنِ ولادت تقریباً ۱۲۲۵ھ (۱۸۰۸ء) ہے۔

مولانا احمد علی کی ابتدائی عمر کھیل کود اور کبوتر بازی وغیرہ میں گزری۔ پڑھنے لکھنے کی طرف مطلق توجہ نہ تھی۔ ایک روز مولانا سعادت علی فقیہ سہارن پوری نے جن کا سہارن پور میں معرکۂ درس جاری تھا، ایک شخص کے ذریعے ان سے چند الفاظ کے معانی پوچھے اور ایک مسئلہ دریافت کرایا۔ احمد علی اس وقت سولہ سترہ سال کے تھے اور کبوتر اڑانے میں مشغول تھے۔ سائل ان کے گھر آیا، آکر آواز دی اور مولانا سعادت علی فقیہ کی ہدایت کے مطابق سوالات کیے۔ احمد علی کوئی جواب نہ دے سکے، کیوں کہ انھیں کسی چیز کا علم ہی نہیں تھا۔ اس پر سائل نے کہا۔ تم ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہو، لیکن علم سے محروم اور کبوتر بازی میں مشغول ہو۔ یہ بات تمھیں زیب نہیں دیتی۔ اس سے ان کے دل پر چوٹ لگی، سب مشغلے چھوڑ دیے، گھر سے نکلے اور میرٹھ جا پہنچے۔ وہاں اٹھارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ میرٹھ سے سہارن پور آئے، وہاں چند کتابیں مولانا سعادت علی فقیہ سے پڑھیں۔ صحیح بخاری کا اکثر حصہ مولانا وجیہ الدین صدیقی سہارن پوری سے پڑھا۔ سہارن پور سے کاندھلہ گئے اور مفتی الٰہی بخش سے استفادہ کرنے لگے۔ مفتی صاحب ممدوح کی وفات کے بعد کاندھلہ سے دہلی کا عزم کیا۔ وہاں مولانا مملوک علی (متوفی ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ، ۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، طویل

عرصے تک وہاں قیام رہا اور مولانا مملوک علی سے خوب استفادہ کیا۔ قیام دہلی کے زمانے میں حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی (مہاجر مکی) بھی وہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حاجی صاحب موصوف نے اس دور میں مولانا احمد علی سے گلستان پڑھنی شروع کی تھی۔

اس کے بعد مولانا مملوک علی اور مولانا احمد علی ۲۶ رجب ۱۲۵۹ھ (۲۴ اگست ۱۸۴۳ء) کو دہلی سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے اور یکم ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ (اواخر دسمبر ۱۸۴۳ء) کو مکہ معظمہ پہنچے اور حج کی سعادت حاصل کی۔

اس سے کچھ عرصہ پیشتر دیارِ ہند کے ممتاز و نامور محدث حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (متوفی ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ) جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے اور تلمیذ تھے، اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی (متوفی ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ) کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں اقامت گزین ہو گئے تھے اور وہاں جا کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ مولانا احمد علی نے شاہ محمد اسحاق کے حلقۂ درس میں شمولیت کی۔ وہاں مولانا احمد علی کا معمول یہ تھا کہ فجر سے ظہر تک حدیث کی قلمی کتابیں نقل کرتے اور ظہر کے بعد شاہ محمد اسحاق کی مجلسِ درس میں حاضر ہوتے۔ اس طرح ان سے صحاح ستہ کی تکمیل کی اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔

مکہ مکرمہ سے واپس آئے تو دہلی میں مستقل قیام کا فیصلہ کیا اور حدیث کی قلمی کتابوں کی تصحیح و تحشیہ میں مصروف ہو گئے، ان کی طباعت و اشاعت کے لیے مطبع احمدی کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔ صحیح بخاری، جامع ترمذی اور مشکوٰۃ کی تصحیح کی اور ان کے حواشی لکھے۔ صحیح مسلم کی بھی تصحیح کی اور اسے پہلی مرتبہ شرح نووی کے ساتھ شائع کیا۔ سنن ابی داؤد کے کئی نسخے سامنے رکھ کر صحیح نسخہ تیار کیا، جسے ان کے ایک شاگردِ خاص مولانا محمد حسین فقیر دہلوی نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔

مولانا احمد علی سہارن پوری کا بہت بڑا علمی کارنامہ صحیح بخاری کی تصحیح اور اس کا

حاشیہ ہے۔ یہ خدمت انھوں نے نہایت محنت اور کاوش سے انجام دی۔ متعدد علمائے کرام سے اس میں مدد لی اور دس سال سے زیادہ عرصہ اس میں صرف کیا۔ اس کی طباعت کا آغاز ۱۸ جمادی الاخری ۱۲۶۴ھ (۲۳ مئی ۱۸۴۸ء) کو سر سیّد احمد خاں کے بھائی سید عبدالغفور کے مطبع سید الاخبار میں ہوا۔ اس پریس میں صرف ایک سو چوراسی (۱۸۴) صفحات چھپے تھے کہ مولانا نے طباعت کا کام اپنے مطبع احمدی میں منتقل کر لیا۔ پھر اس سے آگے کے صفحات سے دونوں جلدیں مطبع احمدی سے شائع ہوئیں۔ جلد اوّل کی طباعت ۲۷ رجب ۱۲۶۷ھ (۵ مئی ۱۸۵۱ء) کو مکمل ہوئی اور جلد دوم ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں تکمیل کو پہنچی[۲۸]۔ اس ایڈیشن کے کل تین سو چھبیس نسخے شائع ہوئے اور فی نسخہ بارہ روپے خرچ آئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی مطبع احمدی میں ملازم تھے اور تصحیح کا کام کرتے تھے۔ صحیح بخاری کے آخری پانچ پاروں کا حاشیہ مولانا احمد علی نے مولانا محمد قاسم سے لکھوایا۔

اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع عبدالغفور دہلی سے محرم ۱۲۷۲ھ (ستمبر، اکتوبر ۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔ اس طباعت کے بعد بھی مولانا احمد علی نے صحیح بخاری کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ پہلی طباعت میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں، ان کی تصحیح کی اور بعض مقامات پر حواشی میں کچھ اضافہ کیا۔ اہم اضافہ رجال کے انساب اور کنیتوں میں ہوا۔ اس نسخے کی طباعت ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں شروع ہوئی اور ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں تکمیل کو پہنچی۔

---

۲۸ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں کتب حدیث سب سے پہلے مولانا احمد علی سہارن پوری نے طبع کرائیں، اس سے قبل ان دیار میں کتب حدیث کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات درست نہیں۔ برصغیر میں کتب حدیث میں سے سب سے پہلی کتاب مطبع سلطانی قلعہ معلّی دہلی سے ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں سنن نسائی شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۲۶۲ھ میں موطا امام محمد شائع ہوا۔ پھر ۱۲۶۵ھ میں کلکتے سے صحیح مسلم شائع ہوئی۔

صحیح بخاری کی اشاعتِ اوّل کے خاتمۃ الطبع میں مولانا ممدوح نے صحیح مسلم کی طباعت کا کام شروع کرنے کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے اس کی طباعت جلد مکمل ہو گئی ہو، لیکن یہ ایڈیشن تھوڑے عرصے میں نایاب ہو گیا تھا، اس ایڈیشن کے ختم ہونے کے بعد صحیح مسلم کا دوسرا ایڈیشن مولانا محمد حسین فقیر اور شیخ ظفر علی کے اہتمام میں مطبع افضل المطابع شاہدرہ دہلی سے شائع ہوا۔

مولانا ممدوح نے جامع ترمذی کی تصحیح بھی کی اور اس پر حاشیہ لکھا۔ مولانا کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ترمذی کا پہلا ایڈیشن ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں مطبع العلوم دہلی سے اشرف علی واسطی کے اہتمام میں چھپا۔ دوسرا ایڈیشن رمضان ۱۲۸۲ھ (جنوری ۱۸۶۶ء) کو مولانا کے اپنے پریس مطبع احمدی دہلی میں شائع ہونا شروع ہوا، اور ۱۲۸۳ھ (نومبر ۱۸۶۶ء) میں تکمیل کو پہنچا۔

حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ پر بھی انھوں نے حاشیہ لکھا اور بڑی محنت سے اپنے پریس مطبع احمدی دہلی میں چھاپا۔ لیکن اس کے باوجود انھیں ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ مشکوٰۃ کی پوری خدمت نہیں ہو سکی۔

مشکوٰۃ کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ دوسرا ایڈیشن مطبع احمدی دہلی سے ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن مفت تقسیم کرنے کے لیے شائع کیا گیا تھا۔ اس کی پہلی جلد کے سرورق اور صفحہ اول پر جلی قلم سے "الوقف للّٰہ الکریم" اور دوسری جلد کے متعدد صفحات پر الوقف چھپا ہوا ہے۔

کتبِ حدیث کی تصحیح اور حواشی کے علاوہ ان کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ بھی ہے، جو بہت سے اہم علمی اور فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔

ان کی ایک مستقل تصنیف بھی ہے جس کا نام "الدلیل القوی علی ترک قراۃ المقتدی" ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے جو مولوی محمد شاہ لدھیانوی کے اصرار پر لکھی گئی۔ اس میں امام کے پیچھے مقتدی کے سورہ فاتحہ پڑھنے کے بارے

میں علمائے احناف کا نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب شعبان ۱۲۷۰ھ (مئی ۱۸۵۴ء) میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوئی۔ بعض احباب کے اصرار سے خود مصنف علام نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ ترجمہ اسی نام سے رجب ۱۲۹۵ھ (جولائی ۱۸۷۸ء) میں مطبع رحیمی واقع سرائے نواب علی محمد خاں (؟) سے شائع ہوا۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (رمضان ۱۲۷۳ھ) تک مولانا احمد علی دہلی میں اقامت گزیں رہے۔ قیامِ دہلی کے دوران انھوں نے بہت سی اہم کتابوں کی تصحیح کی، اور انھیں اپنے پریس (مطبع احمدی) سے شائع کیا۔ کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

جنگِ آزادی میں جب دہلی پر آفت ٹوٹی اور مطبع احمدی لُٹ گیا تو مولانا اپنے وطن سہارن پور آ گئے اور گھر میں طلبا کو درسِ حدیث دینے لگے۔ دو برس سہارن پور میں قیام رہا۔ اس کے بعد میرٹھ جا کر شیخ الٰہی بخش کے ہاں ملازم ہو گئے۔

شیخ الٰہی بخش اور شیخ عبدالکریم دو حقیقی بھائی تھے اور شیخ مدار بخش کے بیٹے تھے۔ موضع اربن ضلع الٰہ آباد (یوپی) کے ایک نو مسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ مدار بخش الٰہ آباد کی سکونت ترک کر کے میرٹھ آ گئے تھے اور یہاں تجارت اور ٹھیکے داری شروع کر دی تھی، جس میں بہت ترقی ہوئی۔ پشاور سے کلکتے تک تمام چھاؤنیوں میں ضروری سامان پہنچانے کا ٹھیکہ شیخ الٰہی بخش اور شیخ عبدالکریم کے پاس تھا۔ کلکتہ اور اس کے اطراف کی چھاؤنیوں میں سامان بھجوانے کی ذمے داری اور اس نواح میں شیخ الٰہی بخش کے کاروبار کی نگرانی مولانا احمد علی کے سپرد ہوئی۔ اس ملازمت سے انھیں پانچ سو روپے ماہانہ آمدنی ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں دس سال سے زیادہ عرصے تک کلکتے میں قیام رہا۔ شیخ الٰہی بخش کی اجازت سے نمازِ فجر سے لے کر نو بجے تک مولانا موصوف مسجد خیرالدین میں طلبا کو حدیث کا درس دیتے تھے۔ درسِ حدیث کا سلسلہ انھوں نے ہر جگہ جاری رکھا۔

کلکتے میں قیام اور ملازمت کے دس بارہ سال بعد مولانا احمد علی اور شیخ عبدالکریم

حج کے لیے گئے۔ اس زمانے میں حضرت حاجی امداد اللہ مکہ معظمہ میں سکونت پذیر تھے، وہ مولانا کی اس ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ملازمت ترک کر کے تمام وقت درسِ حدیث میں صرف کریں۔ چنانچہ مولانا موصوف اور شیخ عبدالکریم کی ملاقات حاجی امداد اللہ صاحب سے ہوئی تو انھوں نے صاف لفظوں میں مولانا سے ملازمت چھوڑ دینے اور اپنے آپ کو درس حدیث کے لیے وقف کر دینے کی تلقین فرمائی، یہ بھی کہا کہ آپ میرے استاد ہیں، دہلی میں مولانا مملوک علی نے میرا گلستان کا سبق آپ کے سپرد کیا تھا۔ مولانا احمد علی نے حضرت حاجی صاحب کی بات توجہ سے سنی اور فرمایا کہ آپ حرم شریف میں میرے لیے دعا فرمائیں۔

اس سے کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں مولانا احمد علی ملازمت چھوڑ کر کلکتے سے سہارن پور آ گئے۔ اور گھر میں درسِ حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے کثیر تعداد میں اہلِ علم مستفید ہوئے اور حلقۂ درس روز بروز بڑھتا گیا۔ اس سے آٹھ سال قبل رجب ۱۲۸۳ھ (نومبر ۱۸۶۶ء) کو سہارن پور میں ایک مدرسہ قائم ہو چکا تھا، یہ وہی مدرسہ ہے جس کے منصبِ اہتمام و تدریس پر مولانا سعادت علی فقیہ فائز تھے اور جس کو ۱۲۹۶ھ میں مولانا احمد علی نے مدرسہ مظاہر علوم کے نام سے موسوم کیا اور آج تک بہتر طریقے سے دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔

مدرسہ مظاہر علوم کو شروع ہی سے مولانا احمد علی کا تعاون حاصل تھا۔ وہ اس کے تمام معاملات سے واقف اور اس کی تدریسی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ نقد روپے کی صورت میں اس کی امداد بھی کرتے تھے جو ایک سو روپے سے تین سو روپے سالانہ تک ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ درسی کتابیں بھی دیتے اور طلبا کی وظائف اور طعام وغیرہ کی شکل میں معاونت کرتے تھے۔

مولانا موصوف ۱۲۹۱ھ میں کلکتے سے سہارن پور آئے، ایک سال تو گھر پر ہی درس دیتے رہے۔ لیکن ۱۲۹۲ھ سے باقاعدہ مدرسے میں سلسلۂ تدریس

شروع کیا۔ مدرسے کے طلبا اور ارکانِ انتظامیہ اس سے نہایت خوش ہوئے اور ان کی تشریف آوری سے طلبا کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ۱۲۹۲ھ میں مدرسہ مظاہر علوم میں جو پڑھائی ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صحیح مسلم دو دفعہ پڑھائی گئی، سنن ابو داؤد کا بھی تکرار ہوا۔ صحیح بخاری ایک بار مکمل کر کے گیارہ پارے مزید پڑھے گئے۔ جامع ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، موطا امام محمد، جامع صغیر، ترجمہ قرآن مجید، تفسیر جلالین وغیرہ کی تدریس مکمل ہوئی۔ شمائل ترمذی اور مقدمۂ ترمذی کی تکمیل ہوئی۔ احیاء علوم الدین کا ایک ربع پڑھا گیا، درمختار صفحہ ۲۳ تک اور شرح مُلا صفحہ ۳۲ تک پڑھی گئیں۔ قدوری پوری پڑھی گئی[۲۹]

مدرسہ مظاہر علوم کے پہلے مدرس و مہتمم مولانا سعادت علی فقیہ کی وفات (۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء) کے بعد سے منصبِ اہتمام خالی تھا۔ مولانا احمد علی کے سہارن پور تشریف لانے کے بعد مدرسے کے جلسۂ عام میں اتفاق رائے سے یہ منصب ان کے سپرد کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند سے بھی مولانا احمد علی کو خاص تعلق رہا۔ دارالعلوم دیوبند کے دَورِ آغاز کے بہت سے ارکان اور اساتذہ ان سے نسبتِ شاگردی رکھتے تھے۔ دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت کا سنگِ بنیاد بھی انھی کے ہاتھ سے رکھا گیا۔ دارالعلوم کی ۱۲۹۲ھ کی روداد میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اوّل پتھر بنیاد کا جناب مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب و مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی[۳۰]

---

[۲۹] الفرقان، لکھنؤ، بابت اگست، ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۳۶، بحوالہ روداد مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور ۱۲۹۲ھ ص ۵۔

[۳۰] سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۲۵ بحوالہ روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۲ھ ص ۱۰

برصغیر پاک وہند کے علمائے احناف ہیں مولانا احمد علی سہارن پوری فاضل اجل، متقی و پارسا اور فقیہ ذی مرتبت تھے۔ علم حدیث کے مختلف گوشوں پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ منکسر اور متواضع تھے۔ امامت و خطابت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خدمتِ حدیث کے لیے زندگی وقف کردی تھی۔ خاموشی کے ساتھ مسجد میں جاتے اور باجماعت نماز پڑھ کر واپس گھر آجاتے۔ اپنی موجودگی کا کسی کو کبھی احساس نہیں کرایا۔ گھر کے کام خود انجام دیتے۔ کسی کو تکلیف دینا اور اپنی ذات کے لیے کچھ کہنا ان کی عادت نہ تھی۔ بازار سے خود سودا خرید کر لاتے۔ کوئی شاگرد یا دوسرا آدمی کام کے لیے اپنی خدمات پیش بھی کرتا تو اس کو تکلیف دینا پسند نہ فرماتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے حلقۂ درس کو بڑی وسعت دی اور متعدد جید علمائے کرام ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔ ان کے نامور تلامذہ میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں اور یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے علم و فضل اور گوناگون اوصاف کی بنا پر خاص شہرت اور امتیاز کے مالک ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا عبداللہ انصاری امیٹھوی، مولانا احمد حسن امروہوی، مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شبلی نعمانی اور حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی۔

ارضِ برصغیر کے یہ عالم و فقیہ اور محدثِ شہیر ۱۲۹۷ھ کے شروع میں مرضِ فالج میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض سے ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (۱۷ اپریل ۱۸۸۰ء) کو شنبہ کے روز سہارن پور میں وفات پائی۔ بہتّر سال عمر پائی۔

---

لـ۱۳ اوجز المسالک شرح موطا امام مالک ص ۴۵ — حدائق الحنفیہ ص ۴۹۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۳ — حیاتِ شبلی ص ۸۴ تا ۸۷ — سیرت یعقوب و مملوک ص ۳۶، ۳۷ — سوانح قاسمی ج ۲ ص ۳۲۵۔

## ۲۳- سیّد احمد علی محمد آبادی

سرزمین برِصغیر میں علم و ادراک کی جو شمع روشن ہوئی اور فضل و عرفان کے میدان میں ارتقا و تقدم کی جو منزلیں طے ہوئیں، اس میں اہلِ حدیث، حنفی اور شیعہ سب شریک ہیں اور ہر جماعت کے اصحابِ کمال نے اپنی بساط کے مطابق اس میں حصہ لیا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس ملک میں جن حضرات نے خدمتِ علم میں نام پیدا کیا، ان میں مشہور شیعہ عالم سیّد احمد علی بن عنایت حیدر حسینی محمد آبادی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ان کی ولادت رمضان المبارک ۱۲۰۶ھ کو موضع محمد آباد گوہنہ میں ہوئی جو ضلع اعظم گڑھ میں واقع ہے اور کسی زمانے میں علم و علما کے مرکز کی حیثیت سے مشہور تھا۔ کچھ بڑے ہوئے تو اپنے شہر کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ بعد ازاں فیض آباد گئے، وہاں کے اہلِ علم سے اکتسابِ فیض کیا۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں مفتی ظہور اللہ انصاری لکھنوی (متوفی ۱۲۵۶ھ) سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ اس کے بعد سید دلدار علی نصیر آبادی (متوفی ۱۹ رجب ۱۲۳۵ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنے دور کے مجتہد شیعہ تھے۔ عرصے تک ان کے حلقۂ درس میں شامل رہے اور ان سے حدیث و فقہ اور اصول کی کتابوں کی تکمیل کی، یہاں تک کہ سیّد دلدار علی کے تلامذہ میں سب سے فوقیت لے گئے اور اپنے اقران و معاصرین میں بلند مرتبے کے حامل قرار پائے۔ اپنے تمام ہم درس حضرات سے زیادہ صاحبِ علم زیادہ فقیہ، زیادہ ذہین اور زیادہ ذی مرتبت تھے۔

سیّد احمد علی محمد آبادی نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں الرد علی الاخباریته، ترجمۃ الاثنی عشریۃ الصلوتیہ (از عاملی) ایک رسالہ اس موضوع پر ہے کہ نماز میں اس شخص کی امامت جائز ہے جس کے فسق کا لوگوں کو علم ہو، ایک رسالہ فی جواز المسح علی الخفین ہے۔ ایک مسح علی الجبیرہ کے بارے میں ہے۔ علاوہ ازیں وہ اور بھی متعدد کتب و رسائل کے مصنف تھے۔

برصغیر کے اس شیعہ عالم نے ۱۲۹۵ھ میں وفات پائی۔[۳۲]

## ۲۴- مولانا احمد علی چریا کوٹی

اعظم گڑھ کے نواح میں ایک قصبہ چریا کوٹ ہے، جو زمانۂ قدیم سے اہلِ علم کا مرکز رہا ہے۔ آئینِ اکبری میں ابو الفضل نے بھی اس کا نام تحریر کیا ہے۔ اس قصبے میں جن اصحابِ کمال نے جنم لیا اور بزمِ علما میں نام پیدا کیا، ان میں مولانا احمد علی چریا کوٹی قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا ممدوح کے والد کا نام غلام حسین اور دادا کا نام سعد اللہ تھا۔ نسباً عباسی تھے۔ علمائے احناف میں بالخصوص بڑی شہرت پائی۔ یوں تو تمام علومِ مروّجہ اور فنونِ متداولہ کے حامل تھے، لیکن خاص طور سے فقہ، اصولِ فقہ اور کتبِ درسیہ میں مہارت رکھتے تھے۔

مولانا موصوف کی ولادت ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۵ء) میں چریا کوٹ میں ہوئی۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصولِ علم کی طرف توجہ کی۔ صرف و نحو وغیرہ کی کتابیں حافظ غلام علی چریا کوٹی (متوفی ۱۲۴۸ھ) سے پڑھیں، جو چریا کوٹ میں ان علوم کے ماہرین میں سے تھے۔ پھر مزید تحصیل کے لیے رختِ سفر باندھا اور مشاہیر علمائے ہند کی خدمت میں حاضر ہوئے، جن میں مولانا غلام جیلانی رام پوری (متوفی ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ) اور مولانا حیدر علی ٹونکی رام پوری (متوفی ۱۲۷۳ھ) شامل ہیں۔ یہ دونوں بزرگ ارضِ ہند کے اصحابِ فضل اور اربابِ کمال میں سے تھے۔ ان کا حلقۂ درس بہت وسیع اور سلسلۂ تلمذ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

مولانا احمد علی چریا کوٹی نے علمائے اعلام کی کثیر جماعت سے استفادہ کیا اور اللہ نے تمام علوم و فنون کا دروازہ ان کے لیے کھول دیا۔ اذکار و اشغال

---

[۳۲] نجوم السماء، ص۔ — تذکرۂ العلماء، ص۔
— نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۳، ۴۴۔

اور تصوّف و طریقت کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو حافظ شاہ ابو اسحاق بھیروی (متوفی سنہ ۱۲۴۳ھ) کے آستانۂ سلوک پر موضع بھیرہ گئے، جو اعمالِ اعظم گڑھ میں ایک گاؤں ہے اور چریا کوٹ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ گاؤں اُس عہد میں علم و فضل کے لیے مشہور تھا۔

تیس سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے وطن چریا کوٹ واپس آئے۔ اس وقت وہ تمام فنونِ درسیہ سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ بعد ازاں اپنے عزیزوں میں شادی کی اور پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ بات کی وضاحت و تبیین اور مشکل مسائل کو آسان الفاظ میں بیان کرنے اور طلبا کے ذہن نشین کر دینے کا انھیں ملکہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانے کے علما و مدرسین اور طلبا ان کے طریق تدریس سے بہت متاثر تھے۔ ان کی زندگی درس و افادہ میں گزری، تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی بعض احباب و متعلقین کے اصرار پر کچھ لکھا بھی تو اس کے بعض حصے نا تمام رہے۔ انوارِ احمدیہ کے نام سے منطق کے ایک رسالے قال اقول کا حاشیہ تحریر کیا۔ سلم العلوم کی شرح سپردِ قلم کی لیکن تکمیل کی منزل کو نہ پہنچ سکی۔ علمِ مناظرہ میں نور النواظر کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو اپنی جگہ ایک مکمل کتاب ہے۔ علم صرف اور علمِ نحو کے سلسلے میں بھی کچھ رسالے قلم بند کیے۔ اسی طرح عربی اور اردو میں مختلف موضوعات سے متعلق بعض چھوٹے چھوٹے رسائل بھی تحریر کیے۔

ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، جن میں برصغیر کے بعض مشہور علما شامل ہیں، مثلاً مولانا نصر اللہ خاں خویشگی خورجوی (متوفی ۱۲۹۹ھ) مولانا عنایت رسول چریاکوٹی (متوفی غرہ شوال ۱۳۲۰ھ) اور مولانا نجم الدین چریاکوٹی (متوفی ۱۳۰۷ھ) وغیرہ۔ مولانا احمد علی چریاکوٹی نے بہتر سال عمر پائی اور ۲ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) کو اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور جنت الفردوس کی راہ لی [۳۳]

---

[۳۳] تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۹، ۲۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۴۴، ۴۵۔

## ۲۵- مولانا احمد گل بھوپالی

بھوپال دیارِ ہند کا مردم آفرین شہر ہے۔ اس میں بے شمار اصحابِ فضل عالمِ وجود میں آئے اور ان کی علمی تگ و تاز سے پورا برصغیر متاثر و مستفید ہوا۔ ان حضرات میں مولانا احمد گل کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے، جو اونچے درجے کے حنفی المسلک فقیہ تھے۔ فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ممتاز علما میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عرصے تک بھوپال کی مسندِ افتا پر فائز رہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں یہ بلدۂ بھوپال کے جیّد فقہا میں سے تھے۔ اسی شہر میں انتقال ہوا۔ مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں انھیں نائب مفتی بھوپال لکھا ہے [۳۴]

## ۲۶- حافظ احمد الدین بُگوی

برِصغیر کے قدیم خاندانوں میں جو شرافت و نجابت میں ممتاز اور علم و فضل میں یگانہ تھے، صوبہ پنجاب کے ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں "بُگہ" کا ایک خاندان بھی تھا۔ ان خاندانوں کی پُرانی روایات اب ختم ہو گئی ہیں۔ تذکرہ و رجال کی کتابوں میں صرف ان کے نام باقی رہ گئے ہیں۔ اپنے دَور کے یہ عظیم لوگ تھے جن کو تاریخ نے یاد رکھا اور اپنے سینے میں جگہ دی۔

تیرھویں صدی ہجری میں موضع بگہ کے حافظ احمد الدین نے جو ۱۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے، ایک نامور عالم، محدث اور فقیہ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کے ایک بھائی اور تھے، جن کا نام حافظ غلام محی الدین تھا۔ والد حافظ نور حیات، دادا حافظ محمد شفا اور پردادا حافظ نور محمد تھے۔ یعنی کئی پشتوں سے اس خاندان کے بزرگ قرآن اور دیگر علوم معقول و منقول سے شغف و تعلق

---

[۳۴] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۶۔

میں مشہور تھے۔

حافظ احمد الدین نے بیان و معانی میں مطوّل اور فقہ میں شرح وقایہ تک کتابیں اپنے بڑے بھائی غلام محی الدین سے پڑھیں۔ بعد ازاں ان ہی کی معیت میں دہلی گئے اور چودہ سال وہاں قیام رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب دہلی میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی (حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور خلیفے) سرگرم تدریس تھے۔ حافظ احمد الدین نے ان کے حلقۂ درس میں شرکت کی اور خوب استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ علومِ قرآن، حدیث و فقہ اور دیگر مروّجہ فنون میں کامل گردانے گئے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے سند و اجازہ حاصل کر کے واپس وطن تشریف لائے اور مسندِ درس بچھائی۔ بے شمار لوگ ان سے مستفید ہوئے اور اپنے علاقے میں تبلیغِ اسلام اور اشاعتِ علم کا موثر ترین ذریعہ بنے۔

دونوں بھائی — حافظ احمد الدین اور غلام محی الدین جلیل القدر علما میں سے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ایک بھائی چھ مہینے لاہور میں رہتا اور ایک اپنے گاؤں بگہ میں درس و افتا کی خدمت انجام دیتا۔ پھر دوسرا لاہور آجاتا اور لاہور والا بگہ چلا جاتا۔ اس طرح لاہور شہر اور علاقہ بگہ میں درس و تدریس اور افتا و تبلیغ کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔

حافظ احمد الدین بہت متقی عالم دین تھے۔ بلند اخلاق اور طلبا پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم بیمار پڑ جاتا تو اس کے لیے خود دوا تیار کرتے اور اس کو استعمال کراتے۔

حافظ احمد الدین بگوی اور ان کے برادر بزرگ مولانا غلام محی الدین بگوی نے علمِ دین کی خوب اشاعت کی اور درس و تدریس کے ذریعے لوگوں کو بہت فیض پہنچایا۔ جن حضرات نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا، ان میں صوبہ پنجاب کے متعدد مشاہیر علما و مشائخ شامل ہیں۔

حافظ صاحب ممدوح نے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن درس و افتا میں

زیادہ مصروف رہنے کی وجہ سے ان پر نظرِ ثانی کا موقع نہیں مل سکا۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ احمدیہ حاشیہ شرح مُلّا جامی۔

۲۔ حاشیہ خیالی۔

۳۔ حاشیہ مطوّل۔

۴۔ ضیاء الصرف شرح صرف میر۔

۵۔ دلیل المشرکین: یہ کتاب عربی میں ہے۔ ۱۲۵۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ جو خود مؤلف کے ہاتھ کا مکتوبہ ہے، جناب عبدالحمید سواتی (ناظم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) کے پاس محفوظ ہے۔ عبدالحمید صاحب نے اس کا اصل متن مع اردو ترجمہ "ایضاح المومنین" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں مصنف نے شرک کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں اور کتاب و سنت اور اقوالِ سلف سے اس کی تردید کی ہے۔ کتاب اپنے موضوع میں قابلِ مطالعہ ہے۔

۶۔ مسئلہ غنا سے متعلق بھی ان کی ایک کتاب ہے، جس کا ذکر "دلیل المشرکین" میں کیا ہے۔

حافظ احمدالدین بگوی عربی کے اچھے شاعر بھی تھے۔

انھوں نے بھیرہ کی جامع مسجد کو از سرِ نو تعمیر کرایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق یہ مسجد اب تک بگہ کے اِس اہلِ علم خاندان کے وعظ و ارشاد کا مرکز ہے۔ پنجاب کے اس عالم و فقیہ نے ۱۳ شوال ۱۲۸۶ھ کو موضع بھیرہ میں وفات پائی۔ اور وہاں کی جامع مسجد کے قریب دفن کیے گئے۔[۳۵]

---

۳۵ حافظ احمدالدین بگوی کے حالات کے لیے دیکھیے حدائق الحنفیہ ص ۴۸۶، ۴۸۷، نیز ۴۷۶ تا ۴۷۸ بھی دیکھیے ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۴۶ ــــ تذکرہ علمائے پنجاب ج ۱ ص ۸۷ تا ۸۹۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ اپنے بھائی مولانا غلام محی الدین سے تیرہ سال چھوٹے تھے اور ان سے تیرہ سال ہی بعد فوت ہوئے۔ غلام محی الدین کی تاریخِ وفات ۲۹ یا ۳۰ شوال ۱۲۷۳ھ ہے۔

## ۲۷۔ شیخ احمد اللہ انامی

شیخ احمد اللہ بن دلیل اللہ بن خیر اللہ بن عبد الکریم صدیقی انامی، حدیث و فقہ کے عالم اور نیک و پارسا بزرگ تھے۔ موضع انام میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے اور شاگرد حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی (مہاجر مکی) کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ شیخ احمد اللہ انامی نے دہلی جا کر اس میں شرکت کی، دیگر علمائے کرام سے بھی اکتسابِ علم کیا۔ حصولِ علم کے بعد خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور اس عصر کے مشہور علما نے ان سے استفادہ کیا، جن میں مولانا سخاوت علی جون پوری (متوفی ۶ شوال ۱۲۷۴ھ) اور مولانا کرامت علی جون پوری (متوفی ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ) ایسے اکابرِ رجال شامل ہیں۔

شیخ احمد اللہ انامی نے ایک رسالہ بھی تالیف کیا۔ اس رسالے کا نام انھوں نے مائۃ مسائل فی تحصیل الفضائل بالادلۃ الشرعیۃ و ترک الامور المنھیۃ رکھا۔ یہ رسالہ ان ایک سو مختلف فقہی اور دینی مسائل پر مشتمل ہے جو شیخ احمد اللہ نے اپنے استاذ محترم شاہ محمد اسحاق دہلوی کی تحریروں سے نقل کیے تھے۔ شیخ ممدوح کے سالِ وفات کا تو علم نہیں ہو سکا، البتہ اس رسالے کا سنِ تالیف ۱۲۴۵ھ ہے [۳۶]۔

---

[۳۶] نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۴۷، ۴۸۔

## ۲۸۔ مولانا ارادت حسین صدیقی عظیم آبادی

عظیم آباد (پٹنہ) ہندوستان کے صوبہ بہار کا وہ شہر ہے جس میں متعدد ایسے خاندان آباد تھے جو فضل و کمال، تدریس و تصنیف اور جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ ان حضرات کی بے مثال قربانیوں کی داستان تاریخ کا ایک نہایت اہم باب ہے۔ ان بزرگانِ عالی مقام میں سے ایک بزرگ مولانا ارادت حسین عظیم آبادی تھے جو وہاں کے صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے: ارادت حسین بن اولیا علی بن رضی الدین بن رفیع الدین بن روح الدین صدیقی۔

مولانا ارادت حسین صدیقی نے اپنے شہر عظیم آباد (پٹنہ) کے ان دو عظیم القدر علمائے دین سے تحصیل کی، جو فضیلت علمی کے ساتھ ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے مرتبۂ عالی پہ فائز ہوئے۔ ان میں ایک بزرگ کا اسمِ گرامی مولانا احمد اللہ[۳۷] اور دوسرے کا مولانا ولایت علی[۳۸] ہے۔ سندِ حدیث مولانا ولایت علی سے لی۔ طب کی کتابیں اپنے

---

[۳۷] مولانا احمد اللہ عظیم آبادی ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے، بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی کے ساتھ رہے اور ان کی جماعتِ مجاہدین میں شامل ہوئے۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور بعض دیگر حضرات سے علم حاصل کیا۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت نے ان کو گرفتار کر کے جزائر انڈیمان (کالے پانی) بھیج دیا تھا۔ وہیں ۲۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (۱۲ نومبر ۱۸۸۱ء) کو وفات پائی۔

[۳۸] مولانا ولایت علی عظیم آبادی ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں پیدا ہوئے لکھنؤ کی ایک درس گاہ میں علم حاصل کر رہے تھے کہ سید احمد شہید بریلویؒ سے ملاقات ہوئی اور پھر انہی کے ہو رہے۔ نامور عالم تھے۔ سرحد پار گئے، انگریزی حکومت سے جہاد کیا، مجاہدین کی قیادت کی اور سرحد پار کے مرکز مجاہدین میں ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ نومبر ۱۸۵۲ء) کو فوت ہوئے۔

چچا حکیم احمد علی سے پڑھیں اور حدیث و فقہ، فرائض و میراث، حساب و ریاضی طب اور دیگر علوم متداولہ میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔

مولانا ارادت حسین، نہایت متواضع، متدین، پاک باز اور منکسر المزاج تھے۔ لباس اور اکل و شرب میں بہت محتاط اور میانہ رو تھے۔ ۱۲۷۶ھ میں حج کی سعادت حاصل کی۔ پھر واپس آکر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ بعد ازاں ۱۲۸۱ھ میں ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ تیرہ سال بعد غرہ جمادی الاخریٰ ۱۲۹۴ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت چھپن ۵۶ سال کی عمر تھی۔

## ۲۹- مولانا اسلم کشمیری

وادیٔ کشمیر علم و فضل سے ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں جن فضلائے کرام نے وہاں جنم لیا ان میں مولانا اسلم بن یحییٰ بن معین الحق رفیقی کشمیری کا اسم گرامی بھی شامل ہے، ان کی کنیت ابو ابراہیم تھی اور اپنے زمانے کے محقق عالم، دقیق النظر فاضل، صاحبِ فتویٰ فقیہ اور متعدد کتابوں کے مصنف اور محشی تھے۔ ان کے والد مولانا یحییٰ اور دادا مولانا معین الحق کا شمار بھی دیارِ کشمیر کے اربابِ علم و تحقیق میں ہوتا تھا۔

مولانا اسلم کشمیری ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۳۹ھ کو پیدا ہوئے، قرآن مجید تجوید کے ساتھ اپنے دادا مولانا معین الحق سے پڑھا اور علوم مروّجہ کی تحصیل اپنے والدِ گرامی مولانا یحییٰ سے کی۔ ان سے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، لغت، کلام اور صرف و نحو کی تمام مروّجہ کتابیں پڑھیں۔ تصوّف و سلوک سے بھی لگاؤ تھا۔ یہ منزلیں بھی باپ کے حلقۂ طریقت میں طے کیں۔ مولانا یحییٰ کشمیری کا باقاعدہ سلسلۂ درس جاری تھا۔ لائق بیٹے نے کئی مرتبہ صحاح ستہ کی قرأت میں ان کے شاگردوں کے ساتھ شمولیت کی۔ باپ کو چوں کہ کتبِ حدیث سے خاص تعلق تھا، اس لیے بیٹا بھی ان سے متاثر ہوا، اور حدیث کی کتابوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

تکمیل تعلیم کے بعد اس دور کے حکمران کی درخواست پر منصب افتا پر فائز ہوئے اور بیس سال اس عہدۂ جلیلہ پر متمکن رہے۔ اس اثنا میں بے شمار فتوے جاری کئے اور مفتی کی حیثیت سے مرجع خواص و عوام ہوئے۔

تصنیف و تالیف میں بھی مہارت رکھتے تھے، چنانچہ فقہ و تصوّف وغیرہ کے سلسلے میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ متعدد کتابوں پر تعلیقات و حواشی لکھے، جن میں الجامع الصغیر، تفسیر جلالین، الاشباہ والنظائر، حسامی اور قصیدہ بُردہ کے حواشی قابلِ ذکر ہیں۔

تمام مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، جو بڑا وسیع تھا۔ ان کے شاگردوں میں کشمیر اور بیرونِ کشمیر کے بہت سے ممتاز اہلِ علم شامل ہیں، جن میں شیخ عبدالوہاب، مولانا ابوالمکارم، مُلا محب اللہ، مُلا قوام الدین، ملا عبداللہ، مفتی ہدایت اللہ، شیخ عبدالنبی، شیخ عطاء اللہ، شیخ صدیق اور شیخ ابوالطیب احمد ایسے جلیل القدر اصحاب کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا اسلم کشمیری کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہاں علم و فضل میں یگانہ تھے، وہاں تواضع، انکساری اور حسنِ خُلق میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ نہایت نرم مزاج اور عمدہ خصائل تھے۔

دیارِ کشمیر کے اس عالم و فقیہ نے ۲۷ محرم ۱۲۱۲ھ کو تہتر [۷۳] سال کی عمر پاکر سفرِ آخرت اختیار کیا[۳۹]

## ۳۰۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی

برِصغیر پاک و ہند کے جن قصبات و بلاد نے علوم و معرفت میں شہرت حاصل کی، ان میں صوبہ یو۔ پی کا ایک مقام "کاندھلہ" خاص اہمیت کا حامل ہے۔

---

[۳۹] حدائق الحنفیہ ص ۴۶۱، ۴۶۲ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۵۵۔

یہاں کے صدیقی خاندان میں گزشتہ صدی میں متعدد علما و فقہا عالم وجود میں آئے اور شمع علم کو روشن رکھنے کا باعث بنے۔ ان میں ایک ذی مرتبت عالم مفتی الٰہی بخش صدیقی کاندھلوی تھے، جو حنفی المسلک اور صاحب فضل و کمال تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب امام فخر الدین رازی کی وساطت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

مفتی الٰہی بخش بن شیخ الاسلام بن قطب الدین بن عبدالقادر صدیقی ۱۱۶۲ھ کو کاندھلہ میں پیدا ہوئے جو دہلی سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ضلع مظفر نگر کا معروف قصبہ ہے۔ اپنے نانا شیخ محمد کاندھلوی کے زیر نگرانی تربیت پائی۔ شیخ محمد کاندھلوی جیّد عالم تھے، انھوں نے اپنے نواسے کی بہترین طریقے سے تربیت کی۔ ابتدائی درسی کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ اس کے بعد عازم دہلی ہوئے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ کافی عرصہ وہاں رہے، شاہ صاحب موصوف کی بیعت کا شرف بھی حاصل کیا۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے والد گرامی اور جدّ محترم علم طب سے بھی شغف رکھتے تھے۔ مفتی صاحب ممدوح بھی اس علم سے بہرہ ور ہوئے اور طب کی کتابیں والد اور دادا سے پڑھیں۔ ان کے علم اور قابلیت کی شہرت سن کر نواب ضابطہ خاں نے انھیں طلب کیا اور محکمۂ افتا پر مامور فرمایا، خاصا عرصہ اس منصب پر متعین رہے۔ نواب ضابطہ خاں کی وفات کے بعد مفتی صاحب بھوپال چلے گئے اور وہاں کے منصب افتا پر متمکن ہوئے۔ کئی سال وہاں مقیم رہے اور نہایت عمدگی سے یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بھوپال سے اپنے وطن کاندھلہ تشریف لے گئے اور اپنے برادر کرم حاجی کمال الدین کاندھلوی سے طریقۂ قادریہ کے مطابق اخذ فیض کیا اور اذکار و اشغال میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں حضرت سیّد احمد شہید بریلوی سے رابطہ پیدا ہوا تو طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ ''ملہمات احمدیہ'' کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس میں سیّد احمد شہید بریلوی کے اذکار و اشغال کا

طریقہ بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ان کی مدح و توصیف کی گئی ہے۔
مفتی الٰہی بخش نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں ایک کتاب کا نام "جوامع الکلم" ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے متعلق ہے۔ ایک کتاب "شیم الحبیب فی ذکر خصائل الحبیب" ہے۔ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین پر مشتمل ہے اور اس میں سنن نبوی کا ذکر ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۰۹ھ میں بھوپال کے زمانۂ قیام میں تصنیف کی۔ ایک رسالہ "شرح عضرات الخمس" اور ایک تکملہ مثنوی معنوی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۱۶ھ میں تصنیف کی۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی رسائل و کتب ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔
بہر حال مفتی الٰہی بخش صدیقی کاندھلوی اپنے دور کے مفتی، فقیہ اور مصنف تھے۔ انھوں نے ۵ جمادی الاخری ۱۲۴۵ھ کو تریاسی[۸۳] سال کی عمر میں کاندھلہ میں وفات پائی[۱۴۰]۔
مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے ایک چھوٹے بھائی مولانا امام الدین صدیقی کاندھلوی تھے۔ وہ بھی بہت ذکی اور فہیم تھے۔ انھوں نے ابتدائی درسی کتابیں بڑے بھائی مفتی الٰہی بخش صدیقی سے پڑھیں، پھر دہلی گئے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے، علوم حکمیہ میں وہ بالخصوص اپنے دور کے فاضل بزرگ تھے۔ حکمت و فلسفے کی بعض کتابوں پر حواشی بھی تحریر کیے۔ عالم شباب ہی میں وفات پا گئے تھے[۱۴۱]۔

## ۳۱- شیخ امام الدین امروہوی

شیخ امام الدین بن علی احمد بن زین الدین حسینی امروہوی اپنے عصر کے معروف

---

۱۴۰ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۷۰، ۷۱۔
۱۴۱ ایضاً، ص ۷۶۔

عالم و فقیہ تھے۔ ان کی ولادت امروہہ میں ہوئی۔ ابتدا میں مذہباً شیعہ تھے۔ امروہہ کے ایک عالم شیخ ضیف اللہ امروہوی وہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے، امام الدین ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے کتبِ درسیہ پڑھیں۔ اس عالم دین سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کی صحبت و تلمذ سے شیعہ مذہب ترک کر کے مذہب اہل سنت اختیار کر لیا۔ بعد ازاں امروہہ سے دہلی چلے گئے اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے مدرسے میں داخل ہوئے۔ ان سے باقی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ شاہ غلام علی سے اخذِ طریقت کیا اور طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ پھر امروہہ واپس آئے اور مسندِ ارشاد سنبھالی۔

نہایت نیک اور متقی بزرگ تھے۔ متوکل علی اللہ اور قناعت شعار تھے۔ نیکی اور تدین کا یہ حال تھا کہ نماز فجر سے لے کر اشراق تک ذکر و مراقبے میں مشغول رہتے۔ بعد ازاں طلبا کو تفسیر، حدیث اور کتبِ فقہ کا درس دیتے۔ پھر نماز ظہر کے بعد سے عصر تک مختلف درسی کتابوں کا درس دیتے۔ نماز عصر کے بعد لوگوں کو تصوّف و طریقت کی تعلیم دیتے اور وظائف و اوراد بتاتے۔ اس اثنا میں حاضرین کو ضروری دینی مسائل سے بھی آگاہ کرتے۔

شیخ امام الدین چند کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں ایک کتاب کشف الغطا ہے۔ ایک کا نام ردّ الربا ہے، ایک اور کتاب تحقیق السماع والغنا ہے۔ علاوہ ازیں تجوید و قراءت کے سلسلے میں بھی چھوٹے چھوٹے رسائل تحریر کیے۔

شیخ امام الدین امروہوی نے ۶ ذی قعدہ ۱۲۵۶ھ کو تریسٹھ[۶۳] سال کی عمر میں انتقال کیا۔[۴۲]

## ۳۲۔ سیدہ امۃ الغفور دہلوی

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں برِصغیر پاک و ہند کی جن خواتین نے فضل و کمال میں شہرت پائی اور میدانِ علم میں بلند مرتبہ حاصل کیا،

---

[۴۲] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۷۴، ۷۵

ان میں شاہ محمد اسحاق دہلوی (متوفی ۲۷ رجب ۱۲۶۲ھ) کی دختر نیک اختر سیّدہ امۃ الغفور کا اسمِ گرامی لائق تذکرہ ہے۔ وہ اپنے والدِ مکرم کی شاگرد تھیں۔ ان سے حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھیں اور طویل عرصے تک ان سے استفادہ کرتی رہیں۔ نہایت نیک اور عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ علوم میں یدِطولیٰ رکھتی تھیں اور حدیث و فقہ کے مسائل مجتہدانہ انداز میں بیان کرتی تھیں۔

ان کی شادی مولانا عبدالحی بڑھانوی (متوفی ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ) کے صاحب زادہ گرامی قدر مفتی عبدالقیوم بڑھانوی (متوفی ۱۲۹۹ھ) سے ہوئی تھی۔ مفتی عبدالقیوم بڑھانوی اپنے عصر کے کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ شیخ و امام اور محدث تھے۔ والیہ بھوپال کی درخواست پر بھوپال میں مقیم ہوئے، اس نے ان کی قابلیت و علم کی بنا پر انھیں ریاست بھوپال کے منصب افتاء پر متعین کیا اور نہایت عزت و تکریم سے پیش آئی۔ بھوپال میں ان کو جاگیریں بھی عطا کر دی تھیں تاکہ وہ معاشی پریشانیوں میں مبتلا نہ ہوں۔

بہرحال حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کی صاحب زادی سیّدہ امۃ الغفور، مفتی عبدالقیوم کی زوجۂ محترمہ تھیں۔ دونوں میاں بیوی علم و فضل میں ممتاز تھے لیکن بیوی کی نظر مسائلِ فقہ کی جزئیات پر اتنی عمیق اور ہمہ گیر تھی کہ شوہر کسی شرعی مسئلے کو سلجھانے میں دقت محسوس کرتے اور حدیث و فقہ کی روشنی میں آگے قدم نہ بڑھا سکتے تو بیوی سے استفسار کرتے۔ وہ مشکل سے مشکل بات کی آسانی سے وضاحت کرتے اور کتاب و سنت کے دلائل سے مسئلۂ زیرِ بحث کی عقدہ کشائی کرنے میں مہارتِ تامہ رکھتی تھیں۔

سیّدہ امۃ الغفور کی تاریخِ ولادت و وفات کا تو علم نہیں ہو سکا۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ تیرھویں صدی ہجری کی ماہر حدیث و فقہ خاتون تھیں۔

## ۴۳۔ سیّد امیر حسن حسینی سہسوانی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے جن بلاد و قصبات اور دیہات میں زمانۂ

قدیم سے علم کی نہریں بہتی رہیں اور معرفت و ادراک کے چشمے اُبلتے رہے، ان میں ایک شہر کا نام "سہسوان" ہے، جو بدایوں سے پچیس میل بجانب غرب واقع ہے۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے جو عرصۂ دراز تک علما و مشائخ کا مرکز اور صلحا و فقہا کا مسکن رہا ہے۔ اس میں تیرھویں صدی ہجری میں جن نادرۂ روزگار شخصیتوں نے جنم لیا اور فضیلت و کمال میں شہرت پائی ان میں امام المتکلمین حضرت علامہ سید امیر حسن حسینی سہسوانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سرِ فہرست ہے۔ مولانا ممدوح کی ولادت ۱۲۴۳ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ عمر کا ابتدائی حصہ تحصیل علم کے شوق سے خالی رہا۔ عالم شباب میں جب ازدواجی ذمے داریاں بھی سر پر آپڑی تھیں، غیرتِ نفس نے جوش مارا اور طلب علم کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ وطن سے نکلے اور علی گڑھ کی راہ لی، جہاں مولانا عبدالجلیل (شہید ۱۸۵۷ء) سرگرمِ تعلیم و تدریس تھے ان سے استفادہ کیا۔ وہاں سے فرخ آباد گئے اور قاضی بشیر الدین قنوجی (متوفی ۱۲۹۶ھ) کے سلسلۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ پھر لکھنؤ کا قصد کیا اور حضرت مولانا ابو البرکات تراب علی فرنگی محلی (متوفی ۱۲ صفر ۱۲۸۱) سے فنونِ عقلیہ و حکمیہ کی تکمیل کی۔ وہاں تشنگیٔ علم کم نہ ہوئی تو دہلی جاکر مفتی صدر الدین دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ) کے خرمنِ علم سے خوشہ چینی کی۔ پھر استاذِ کل حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ) کے حلقۂ درس میں شمولیت کی اور ان سے کتبِ حدیث پڑھیں۔ مولانا شاہ عبدالغنی محدث مجددی (متوفی ۶ محرم ۱۲۹۶ھ) اور امام شوکانی (متوفی جمادی الاخریٰ ۱۲۵۰ھ) کے تلمیذِ رشید مولانا عبدالحق بنارسی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ) کی خدمت میں بھی گئے۔ ان تینوں حضرات سے کتبِ صحاح اور بعض دیگر کتابیں سماعاً و قراءۃً پڑھنے کا شرف حاصل کیا اور سند و اجازہ سے بہرہ مند ہوئے۔

زمانۂ قدیم میں علمائے عظام کا یہ شیوہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ممتاز و مشہور علما سے کسبِ علم اور حصولِ سند کی کوشش کرتے تھے۔ سید امیر حسن سہسوانی

نے بھی اپنے عصر کے متعدد نامور حضرات سے تحصیل کی اور سند لی، تاکہ ہر حلقۂ علم کے اکابر سے تعلق و قرب اور استفادے کے مواقع میسّر آسکیں۔

سیّد ممدوح کو اللہ تعالیٰ نے ذکاوت و فطانت، قوتِ حفظ، سرعتِ فہم اور ضبط سے خوب نوازا تھا اور وہ کم سے کم وقت میں دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل بات کو سمجھ لینے کی پوری استعداد رکھتے تھے۔ اس لیے چند ہی سالوں میں ان کا شمار متبحر اور وسیع النظر علما کی جماعت میں ہونے لگا اور تھوڑے عرصے میں شہرت و ناموری کی بہت سی منزلیں طے کرلیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد وطن واپس آئے تو دیکھا کہ جو شہر کسی زمانے میں دولتِ علم و عرفان سے مالا مال اور علما و فضلا کا گہوارہ تھا، اپنی رونقِ علم ختم کرچکا ہے اور جو روایات اس سے وابستہ تھیں، اس کے فقط نشانات رہ گئے ہیں باقی تمام سلسلہ معدوم ہو گیا ہے۔ پرانے اہلِ علم یا تو سفرِ آخرت اختیار کرگئے ہیں یا سہسوان کی سکونت ترک کرکے دیگر علاقوں اور شہروں میں جا بسے ہیں، یعنی پُرانی بساط یکسر اُلٹ گئی ہے۔

اب انھوں نے از سرِ نو حالات کا جائزہ لیا اور شمعِ علم کو جو بُجھ چکی تھی دوبارہ روشن کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ اللہ پر توکل کرکے وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور لوگوں کو تدین و تقویٰ اختیار کرنے اور طلبِ علم کے لیے کمربستہ ہونے کی تلقین کی۔ ان کی پُر خلوص تقریروں اور اثر آفرین مواعظ کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے اور ان کے نرم و متوازن طرزِ کلام کی وجہ سے انھوں نے راہِ راست اختیار کرلی۔ اب سہسوان اور اس کے گرد و نواح میں علم کے چرچے ہونے لگے اور ہر معاملے میں پابندیٔ شرع کا التزام کیا جانے لگا۔ یہ تگ و تاز کئی سال جاری رہی، حتیٰ کہ شہر اور علاقے کی فضا بالکل بدل گئی۔

اسی اثنا میں بعض رؤسائے دہلی کے اصرار پر دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی میں کئی سال دعوت و ارشاد اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ بے شمار لوگ

ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے اور متعدد طلبائے علم نے ان سے اخذِ علم کیا اور مرتبۂ کمال کو پہنچے۔

قیامِ دہلی کے زمانے میں ان کا شہرۂ علم دُور دُور تک پہنچ گیا تھا اور لوگ ان کے اسلوبِ تدریس اور اندازِ وعظ و تبلیغ سے بہت متاثر تھے۔ میرٹھ کے لوگوں کو ان کی صدائے حق کی اثر آفرینیوں کا پتا چلا تو اپنے ہاں لے جانے پر مُصر ہوئے۔ اس کے لیے میرٹھ کے ایک رئیس شیخ الٰہی بخش مرحوم پیش پیش تھے۔ ان کے مخلصانہ اصرار سے مجبور ہو کر سید صاحب موصوف دہلی سے میرٹھ منتقل ہو گئے۔ وہاں ایک بہت بڑا دینی اور اصلاحی مدرسہ قائم کیا۔ اس کا سنگِ بنیاد بھی خود رکھا اور اس کے اہتمام و نگرانی کے فرائض بھی خود ہی انجام دینے لگے۔ میرٹھ کا یہ مدرسہ ان کی وجہ سے بہت مشہور ہوا، اور دور دراز مقامات سے طلبا اس میں آنے اور ان سے مستفید ہونے لگے۔ ان کے وطن سہسوان کے متعدد طلبائے علم جن میں خاندانِ سادات اور ان کے قرابت دار بھی شامل تھے، ان کے ساتھ میرٹھ چلے گئے تھے۔ ان حضرات نے ان سے خوب استفادہ کیا اور اونچے مرتبے پر فائز ہوئے۔ میرٹھ میں ان سے استفادہ کرنے والوں میں بہت سے اکابر علمائے کرام ہیں خود ان کے فرزند گرامی مولانا سید امیر احمد سہسوانی (متوفی ۱۳۰۶ھ) بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا سید عبدالباری سہسوانی (متوفی ۱۳۰۳ھ) مولانا سید سبط احمد سہسوانی (متوفی ۱۳۰۷ھ) مولانا سید محمد نذیر سہسوانی (متوفی ۱۲۹۹ھ) مولانا محمد تراب علی مرشد آبادی اور قاضی محمد احتشام الدین مراد آبادی وغیرہ حضرات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سید امیر حسن طویل عرصے تک میرٹھ میں مقیم رہے، اس اثنا میں کتاب و سنت کی خوب نشر و اشاعت کی اور بے شمار لوگوں کو فیض پہنچایا۔ آخری دور میں مدرسہ میرٹھ کا انتظام اپنے بعض لائق تلامذہ کے سپرد کر دیا تھا اور خود اس ذمے داری سے آزاد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد میرٹھ میں کم اور علی گڑھ میں زیادہ قیام رہتا تھا۔ بعد ازاں پھر سہسوان میں اقامت گزین ہو گئے تھے۔ وہاں قرآن و حدیث کا

درس دیتے، بحث و مناظرے میں حصّہ لیتے، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے، طلبا کو مخالفین سے مباحثوں کے لیے تیار کرتے اور احسن طریقے سے تبلیغ اسلام کی تربیت دیتے۔ وہاں کی مسجد غلام علی شاہ میں روزانہ درس ہوتا اور کثیر تعداد میں طلبا و علما اور دیگر حضرات اس میں شریک ہوتے۔ نماز جمعہ میں بہت کثرت سے لوگ آتے، اور سیّد صاحب ممدوح نہایت حسن و خوبی سے قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کو منہیات سے روکتے اور نیکی و معروف کی تلقین کرتے۔

مختلف مذاہب و مسالک کی کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی اور ان کے اعتراضات کا جواب دینے میں ماہر تھے۔ کتب شیعہ کا بھی خوب مطالعہ تھا اور صحابہ کرام کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی تردید مضبوط دلائل سے کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں دربارِ اودھ کی سرپرستی میں صحابہ کرام کو نشانۂ طعن بنایا جانے لگا اور برسرِ عام تبرّی بازی ہونے لگی تو حیدر آباد (دکن) کی ریاست کے اربابِ اختیار نے اس اہم مسئلے کو موضوعِ توجہ ٹھہرایا، اور علمی و تحقیقی رنگ میں ان کی تردید کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے مولانا حیدر علی فیض آبادی (متوفی ۱۲۹۹ھ) کی خدمات حاصل کی گئیں، جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد اور جلیل القدر عالم تھے۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور ضعف و کمزوری نے انھیں گھیر لیا تھا۔ لیکن خدمتِ دین کی غرض سے یہ ذمے داری اس شرط پر قبول فرمائی کہ ان کو کوئی صاحبِ بصیرت اور وسیع النظر عالم بہ طور معاون کے دیا جائے۔ ساتھ ہی فرمایا کہ یہ معاون سید امیر حسن سہسوانی ہونے چاہییں، جن کا کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ فکر و نظر میں کوئی حریف نہیں ہے۔ چنانچہ سیّد صاحب ممدوح سے رابطہ قائم کیا گیا اور کہا گیا کہ ابتدا میں اس خدمت کے لیے انھیں چار سو روپے مہینہ دیے جائیں گے اور جلد ہی اسے بڑھا کر ایک ہزار روپے مہینہ کر دیا جائے گا۔ سب احباب اور اعزّہ و اقارب نے سیّد صاحب سے حیدر آباد تشریف لے جانے کی درخواست کی اور اس کام کو تمام

کاموں سے زیادہ اہم اور بنیادی قرار دیا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا،
میں اپنے اوقاتِ درس و وعظ کو مباحثات و مناجرات میں صرف کرنا اور امراء و
حکام کا تقرب اختیار کر کے اپنے آپ کو عیش و تنعم کا خوگر نہیں بنانا چاہتا۔ ایک
عالم کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں کہ وہ سلاطین و حکام کی مجلس اختیار
کرے، ان سے قرب و ربط رکھے اور علم کو مال و دولت کے لیے ضائع کرے۔

سید امیر حسن سہسوانی مسلکاً اہلِ حدیث تھے، کسی خاص امام کی تقلید
کے قائل نہیں تھے، براہِ راست کتاب و سنت کی اتباع کرتے اور اسی کو بنیادِ عمل
قرار دیتے تھے۔ مروجہ علوم پر ماہرانہ نظر رکھتے اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ تفسیر،
حدیث، فقہ و اصول اور دیگر علوم و فنون پر دسترس تھی۔ اللہ نے ان کو قوتِ فہم
اور بصیرت و دانش کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ ان کی سعی و کوشش سے سہسوان
اور ان کے اطراف میں علمِ حدیث کی اشاعت ہوئی اور لوگوں میں عمل بالحدیث کا
جذبہ ابھرا۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی (متوفی ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۶ھ) نے جو خطۂ
ہند کے مشہور عالم دین تھے، ان ہی کے فیضِ صحبت سے مسلکِ اہلِ حدیث اختیار
کیا تھا۔

تصنیف و تالیف سے بھی سید صاحب ممدوح کو دلچسپی تھی۔ ردِّ بدعات
اور حمایتِ سنت میں کئی رسالے لکھے اور قرآن مجید، حدیثِ رسول اور کتب فقہ
کے دلائل سے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔ ایک رسالہ شیعہ کے رد میں لکھا اور ایک
رسالہ اثباتِ حق کے نام سے تحریر کیا۔ طبیعیات شفا پر تعلیقات سپردِ قلم کیں۔

ان کی تصنیفات کے سلسلے میں یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ حضرت میاں
سید نذیر حسین دہلوی کی معروف تصنیف معیار الحق شائع ہوئی تو اس کے
جواب میں مولانا ارشاد حسین رام پوری (متوفی ۱۳۱۱ھ) نے انتصار الحق کے نام
سے ایک کتاب تصنیف کی۔ انتصار الحق کے رد میں حضرت میاں صاحب کے تلامذہ
نے چار کتابیں لکھیں۔ ایک براہینِ اثنا عشر، دوسری تلخیص الانظار فی ما نبی

علیہ الانتصار، تیسری اختیار الحق اور چوتھی بحرِ ذخار۔ ان میں سے اول الذکر تصنیف یعنی "براہین اثنا عشر" سید امیر حسن سہسوانی کی تصنیف ہے۔

براہینِ اثنا عشر کے معرضِ تصنیف میں آنے کا پس منظر یہ ہے کہ جس دن مولانا ارشاد حسین رام پوری کی کتاب انتصار الحق چھپ کر آئی، اسی دن سید امیر حسن سہسوانی نے اس کا مطالعہ کیا۔ اس میں حضرت میاں صاحب کے موقف کا مصنف نے بارہ دلائل سے رد کیا تھا اور لکھا تھا کہ جو شخص ان بارہ دلیلوں کا جواب دے گا سمجھا جائے گا کہ اس نے ان کی پوری کتاب کی تردید کر دی ــــ مصنفِ انتصار الحق کے نزدیک وہ دلائل اس قدر مستحکم اور مضبوط تھے کہ ان کا توڑ اور جواب محال تھا۔ لیکن سید امیر حسن نے اس کتاب کی اشاعت کے دوسرے ہی دن "براہین اثنا عشر" کے نام سے اس کا جواب لکھ کر شائع کرا دیا۔ اس کا ایک نسخہ چودھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی عالم مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۴ھ) کی خدمت میں بھی ارسال کیا۔ حضرت ممدوح نے یہ رسالہ پڑھا تو سید صاحب کو حسبِ ذیل مکتوب تحریر فرمایا:

از محمد عبدالحی: بہ مولوی صاحب مکرم معظم مجمع بحرین المعقول والمنقول، منبع نہرین الفروع والاصول مولوی سید امیر حسن صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ؛ عنایت نامہ لطف شمامہ مورخہ ۲۰ ماہِ رواں بہ ورودِ خود ممتاز ساختند و براہینِ اثنا عشر رسیدہ۔ اغلاطِ اسامیِ کتب و مؤلفین در انتصار لاتعد ہستند، شاید بہ نظرِ اختصار بر چند کفایت شدہ۔[۴۳]

یعنی ماہِ رواں کی ۲۰ تاریخ کو مکتوب گرامی ملا، اور باعثِ افتخار ہوا۔ براہینِ اثنا عشر وصول پائی۔ انتصار الحق میں کتابوں اور مصنفین کے ناموں کی لاتعداد غلطیاں موجود ہیں۔ آپ نے شاید اختصار کے پیشِ نظر چند ہی غلطیوں کے ذکر کو کافی سمجھا ہے۔

---

۴۳ الحیات بعد الممات ص ۵۹۲۔

مولانا عبدالحی الکھنوی جو خود بھی برِصغیر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فاضل تھے، مولانا سید امیر حسن سہسوانی کو نہایت احترام و عزت کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں اور ان کو مجمع بحرین، جامع معقول و منقول اور منبع فروع و اصول قرار دیتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ سید صاحب ممدوح اپنے دور کے بہت بڑے فاضل اور محقق تھے، اور برِصغیر پاک و ہند کے اکابر علما ان کو صدر جے لائق تعظیم و تکریم گردانتے تھے۔

سید امیر حسن کامیاب مناظر بھی تھے اور فنِ مناظرہ کے تمام پہلوؤں سے آگاہ تھے۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے بھی (جن کا سطور بالا میں ذکر ہوا ہے) مناظرے کا سلسلہ جاری رہا۔ ان دونوں علمائے عصر کے درمیان مسئلہ وجوبِ زیارت پر مباحثہ ہوا، اور اس ضمن میں دونوں طرف سے کئی رسالے شائع ہوئے۔

سید صاحب کے بہت بڑے حریف عیسائی پادری تھے جو اس زمانے میں انگریزی حکومت کے ایما اور تعاون سے ہندوستان میں عیسائیت کی ترویج و اشاعت کر رہے تھے۔ انگلستان سے بھی کئی مشہور پادری برصغیر میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے اور تبلیغِ عیسائیت میں سرگرم تھے۔ ان میں ایک پادری ہاملٹن تھا جو انگلستان کا باشندہ تھا اور بدایوں میں مقیم تھا۔ دوسرا پادری اسکاٹ تھا۔ یہ بھی انگریز تھا اور انگلستان کا رہنے والا تھا۔ یہ پادری بریلی میں اقامت پذیر تھا۔ ان دونوں پادریوں کو اپنے دور کے بہت بڑے مناظر اور محقق سمجھا جاتا تھا۔ ان کا اصل مقابلہ مسلمانوں سے تھا اور اسلام پر یہ مسلسل حملے کر رہے تھے۔ سید امیر حسن سہسوانی سے کئی مرتبہ ان کے مناظرے اور مباحثے ہوئے اور ہر مرتبہ سید صاحب کے مقابلے میں ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سید صاحب کی وسعتِ نظر اور مذاہب کے بارے میں ان کی تحقیق سے یہ دونوں پادری بہت متاثر تھے اور ان کی تعریف کرتے تھے۔ ان کی حاضر جوابی اور قوتِ استدلال کے بھی معترف تھے۔

ان کی زندہ دلی اور فراخ حوصلگی کے بھی مداح تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ملاقات کے لیے وہ سہسوان آتے، ان سے باتیں کرتے اور ان کی مجالسِ وعظ میں شریک ہوتے۔

پادری اسکاٹ ولایت میں تھا کہ اسے سید صاحب ممدوح کی وفات کی خبر پہنچی۔ اس نے نہایت افسوس کا اظہار کیا اور انگلستان کے ایک اخبار میں ان کے بارے میں مضمون لکھا، جس میں ان کے اسلوبِ بحث اور منہجِ استدلال کی تعریف کی اور ہندوستان کے علما میں ان کو بے مثل اور منفرد حیثیت کے عالم قرار دیا۔

عمر کے آخری حصے میں سید صاحب موصوف تمام علائق سے منقطع ہو کر ذکر و عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ علی گڑھ میں اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ وہیں دو شنبہ کے روز ۱۱ صفر ۱۲۹۱ھ کو معمولی ناسازیٔ طبع سے انتقال کیا۔ اڑسٹھ[۶۸] سال عمر پائی[۲۴۵]۔

مولانا سید امیر حسن سہسوانی کے صاحب زادے مولانا سید امیر احمد سہسوانی تھے، جو باپ کی طرح بہت ذہین اور علم و فضل میں یگانہ تھے اور ان کے شاگرد بھی تھے۔ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سند و اجازہ کا شرف حاصل تھا۔ انھوں نے ۱۳۰۶ھ میں رحلت فرمائی۔

## ۴۳۔ مفتی امیر حیدر بلگرامی

بلگرام ہندوستان کا وہ شہر ہے جس نے بے پناہ علمی شہرت حاصل کی اور اس میں بے شمار اصحابِ کمال عالمِ ظہور میں آئے۔ یہ دیارِ ہند کا ایک مردم آفرین مقام ہے

---

[۲۴۵] حالات کے لیے ملاحظہ ہو، حیات العلما، ص ۴۴ تا ۶۹ — الحیات بعد الممات ص ۵۹۲ و ۶۹۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۷۹، ۸۰ — تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۲۲۹ تا ۲۴۱ — مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۵۹۔

اور تاریخی لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل۔ اسیّد غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ، کا مولد ومسکن ہے اور آزاد بلگرامی وہ شخص ہیں، جنھوں نے عربی اور فارسی میں بہت علمی کام کیا اور بالخصوص اپنی عربی تصنیف سبحۃ المرجان اور فارسی کتاب مآثر الکرام کے ذریعے برصغیر کی علمی و دینی شخصیتوں کو آنے والی نسلوں سے متعارف کرایا۔ تذکرہ و رجال کے موضوع سے متعلق ان کی یہ وہ خدمت ہے، جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مفتی امیر حیدر بلگرامی ان ہی سیّد غلام علی آزاد کے پوتے ہیں، ان کے والد کا نام سیّد نور الحسن تھا جو عین عالم جوانی میں باپ کی زندگی ہی میں ۱۱۶۸ھ کو بلگرام کے تالاب میں ڈوب کر وفات پا گئے تھے۔ باپ کے لیے یہ نہایت غم انگیز حادثہ تھا، جوان بیٹے کی وفات پر آزاد نے دردناک مرثیہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے:

قیامت بر سرِ ایں بوستاں رفت  کہ یک گُل داشت آں ہم نوجواں رفت

آزاد کا یہی ایک بیٹا تھا۔ اس کی وفات کے بعد ان کی تمام سرگرمیاں معطل ہو گئی تھیں اور سیر و سیاحت کے سلسلے ختم ہو گئے تھے۔

امیر حیدر ۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۵ھ کو پیدا ہوئے۔ تین سال کو پہنچے تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دادا اس زمانے میں علاقہ دکن کے شہر اورنگ آباد میں رہتے تھے۔ امیر حیدر نے مروجہ درسی کتابیں سیّد محمد بلگرامی (متوفی ۱۱۸۵ھ) سے پڑھیں اور کچھ عرصہ ان کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ بعد ازاں اپنے جدِّ محترم سیّد غلام علی آزاد بلگرامی کے پاس اورنگ آباد چلے گئے۔ آزاد نے لائق پوتے کی خوب تربیت کی اور بعض کتب درسیہ کی تکمیل کے لیے سید نور الہدیٰ اورنگ آبادی (متوفی رمضان المبارک ۱۲۰۱ھ) کے حلقۂ درس میں داخل کرایا۔ علم طب حکیم عبدالسلام برہان پوری (متوفی ۱۱۹۲ھ) سے پڑھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد عازم کلکتہ ہوئے اور اپنی قابلیت اور فقہ میں عبور کی بنا پر وہاں کی مسندِ افتا پر فائز کیے گئے۔ سولہ سال منصبِ قضا پر مامور رہے۔ اس کے بعد وطن جانے کے شوق نے بے تاب کیا اور

بلگرام کو روانہ ہوئے۔ لیکن جب مرشد آباد پہنچے تو ہاتھ میں ایک ایسی پھنسی نکلی، جو نہایت تکلیف دہ تھی۔ اس کی وجہ سے انتہائی کرب میں مبتلا ہوئے اور وہیں وفات پا گئے۔

امیر حیدر بلگرامی اپنے دور کے مفتی، عالم اور فقیہ تھے۔ عربی میں چند کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں دو رسالے علم صرف اور علم نحو سے متعلق ہیں۔

امیر حیدر بلگرامی نے ۱۲۱۷ھ کو مرشد آباد میں انتقال کیا[۴۵]

## ۳۵- مفتی انور علی آروی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں ایک شہر "آرہ" ہے، جس کو بہت عرصے تک علما و صلحا کے گہوارے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں آرہ میں جو علمائے کرام پیدا ہوئے اور علم کے مختلف میدانوں میں شہرت پائی، ان میں مفتی انور علی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ مفتی انور علی حنفی المسلک تھے اور اپنے علاقے کے علمائے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ متداول درسی کتابیں اپنے بڑے بھائیوں کرامت علی اور احمد علی سے پڑھیں۔ پھر عازم کلکتہ ہوئے اور قاضی عباس علی (متوفی ۲۳ رمضان المبارک ۱۲۲۰ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے باقی کتب درسیہ پڑھیں۔ قاضی عباس علی کلکتہ اور اس کے مشرقی شہروں کے قاضی القضاۃ تھے۔

تکمیل تعلیم کے بعد مفتی انور علی آروی کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے اونچے درجے کے ہندی علما میں ہونے لگا اور اپنے دور کے شیخ و فاضل اور فقیہ گردانے گئے۔ ان کی قابلیت کی بنا پر انھیں منصب افتا پر فائز کیا گیا، جس پر وہ عرصے تک فائز رہے۔ پھر ان کو قاضی کا عہدہ عطا کیا گیا۔ قضا کے سلسلے میں انھوں نے قابلِ قدر

---

۴۵ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۸۱۔

خدمات انجام دیں اور ہر لحاظ سے عزت و احترام کے مستحق قرار پائے۔

وہ دو اہم مناصب — منصبِ افتا اور منصبِ قضا — پر مامور رہے۔ یہ دونوں انتہائی نازک اور ذمہ دارانہ منصب ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے درس و افادۂ طلبا کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ باقاعدہ فرائضِ تدریس انجام دیتے اور طلبائے علم کو پڑھاتے رہے۔ اس طرح بیک وقت تین عظیم الشان خدمات میں مصروف رہے اور ان میں سے ہر خدمت اپنی جگہ بہ درجہ غایت اہمیت کی حامل تھی۔ بہ طور مدرس اور معلم کے انھوں نے بہت کام کیا اور متعدد علماء طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

مفتی انور علی آروی نے ۲۵ ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ کو عظیم آباد (پٹنہ) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۴۶]

## ۳۶۔ سیّد اولاد حسن قنوّجی

علمائے قنوج میں مولانا سیّد اولاد حسن بخاری قنوجی عالمِ اجلّ اور فاضلِ ذی مرتبت تھے۔ نواب سیّد محمد صدیق حسن خاں والیِ بھوپال کے والدِ مکرم تھے۔ مولد و منشا قنوج اور سنِ ولادت ۱۲۱۰ھ ہے۔ والد کا نام سیّد اولاد علی تھا، جو دربار حیدر آباد کی طرف سے قلعۂ گول کنڈہ کے منصب قلعہ داری پر فائز تھے۔ ریاست کی طرف سے پانچ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی۔ انور جنگ بہادر کے لقب سے ملقب تھے اور ایک ہزار سوار و پیادہ کے سالار تھے۔ سلسلۂ نسب عالی ہے جو حضرت جعفر صادق کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔ اس خاندان کے نسب نامے میں سیّد اولاد حسن سے اوپر تیسرے نمبر پر ایک بزرگ سیّد عزیز اللہ کا نام آتا ہے۔ عزیز اللہ شیعہ ہو گئے تھے۔ ان سے

---

[۴۶] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۸۷، ۸۸ بحوالہ قسطاس البلاغہ۔

پہلے خاندان کے تمام حضرات کا تعلق اہلِ سنت سے تھا۔ سیّد عزیز اللہ کے بیٹے سیّد لطف اللہ اور سیّد لطف اللہ کے فرزند سیّد اولاد علی تھے۔ یہ تینوں حضرات مسلکِ شیعیت سے منسلک تھے۔ ان کے قبولِ شیعیت کی وجہ رؤسائے لکھنؤ اور امرائے حیدر آباد سے ربط و صحبت تھی۔ چوں کہ وہ شیعہ تھے، اس لیے ان سے متاثر ہو کر یہ بھی شیعہ ہو گئے۔ لیکن سیّد اولاد علی کے فرزند گرامی سیّد اولاد حسن نے شیعیت ترک کر کے مسلک اہلِ سنت اختیار کر لیا تھا۔ پھر علم و مطالعہ میں وسعت ہوئی تو زمرۂ اہلِ حدیث میں شامل ہو گئے۔

سیّد اولاد حسن نے حصولِ علم کا آغاز مولانا عبدالباسط صدیقی قنوجی، (متوفی ۱۲۲۳ھ) سے کیا۔ ان کے فیضِ صحبت سے ابتدائی عمر ہی میں شیعیت سے تائب ہو گئے تھے۔ ان کے بیٹے سیّد نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

چوں ایشاں بسنِ آگاہی رسیدند و اوائلِ کتب رسمیہ بہ حلقۂ درس استاذ الفضلا افضل الکملا بقیۃ السلف، خیر الخلف مولوی عبدالباسط بن مولوی رستم علی بن مُلا علی اصغر قنوجی رحمہم اللہ تعالیٰ اکتساب نمودند و قباحت و شناعتِ مذہب تشیع دریافتہ، سالکِ مسلکِ اہلِ سنت و جماعت گردیدند[۴۷]

یعنی سیّد اولاد حسن جب عمرِ شعور کو پہنچے تو ابتدائی مروّجہ کتابیں مولانا عبدالباسط قنوجی کے حلقۂ درس میں پڑھیں اور شیعہ مذہب ترک کر کے مسلکِ اہلِ سنت اختیار کیا۔

اس کے بعد لکھنؤ گئے، وہاں مولانا نور الحق انصاری لکھنوی (متوفی ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ) کے حلقۂ درس میں شرکت کی اور کتبِ درسیہ کی تکمیل فرمائی۔ لکھنؤ میں شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے تلمیذ مرزا حسن علی ہاشمی لکھنوی (متوفی ۴ صفر ۱۲۵۵ھ) سے بھی تحصیل کی، جو اپنے دور کے نامور شافعی المسلک محدّث تھے۔ اس اثنا میں مولانا محمد نور سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔

---

[۴۷] اتحاف النبلاء، ص ۲۳۵۔

۱۲۳۳ھ میں دہلی کا عزم کیا اور شاہ رفیع الدین دہلوی سے مستفید ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ شاہ عبدالقادر دہلوی سے بھی فیض یاب ہوئے۔ ان تینوں اساطین فضل و کمال کے تلمذ و صحبت کا یہ اثر ہوا کہ عقیدہ و عمل میں مزید تصلب آگیا اور شیعیت کے تمام اثرات نہ صرف زائل ہو گئے بلکہ شیعہ کے خلاف بعض رسالے تحریر کیے۔ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں :

در ردِّ ایں طائفہ رسائل نوشتند و عمائر بسیار از جنس امام بارڑہ جات و منصب ہائے تعزیہ وجز آں بخاک برابر کنانیدند، و در بدل آں بعمران مساجد و مدارس پرداختند [۴۸]

یعنی اس جماعت (شیعہ) کے رد میں رسالے لکھے اور امام باڑوں کو منہدم اور نشاناتِ تعزیہ وغیرہ کو مٹا کر زمین بوس کر دیا، اور ان کے بجائے مسجدیں اور مدرسے تعمیر کرائے۔

تکمیل علم کے بعد اپنے وطن قنوج تشریف لے گئے اور دعوت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانے میں امیر المجاہدین سید احمد بریلوی کی دعوتِ جہاد کا غلغلہ پورے برصغیر میں بلند تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ بیعت سے سرفراز ہوئے۔ پھر ان کی قیادت میں قافلہ مجاہدین کے ساتھ، جن میں مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی جیسے متعدد اکابر رجال شریک تھے، سرحد پار گئے اور انگریزی حکومت کے خلاف بعض جنگوں میں شرکت کی۔ اس عہد میں کابل، قندھار اور لاہور کا سفر بھی کیا۔ ان کا شمار بسلسلۂ جہاد سیّد صاحب کے ساتھ جانے والے السابقون الاولون میں ہوتا ہے۔

سرحد پار سے قنوج واپس آئے اور لوگوں کو دعوتِ جہاد دی۔ اس خدمت

---

[۴۸] لفظۃ العجلان ص ۱۲۷۔

کے لیے خود سیّد احمد بریلوی نے ان کو واپس بھیجا اور اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ یہاں آکر ملک کے مختلف علاقوں سے مجاہدین کے لیے سامان جہاد ارسال کیا اور ہزاروں اہلِ اسلام نے ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔ اپنے علاقے اور حلقۂ تعلقات میں نہایت سرگرمی سے لوگوں کو جہاد میں دعوتِ شرکت دینے اور تمام مساعی کی اطلاع باقاعدہ سیّد صاحب کو سرحد پار بھیجتے۔ سیّد صاحب نے ان کو خطوط بھی لکھے، جن میں ایک خط ۱۵ ذوالحجہ ۱۲۴۲ھ کو پنجتار کے مقام سے ارسال فرمایا۔ اس خط میں سیّد صاحب نے ان کو "سیادت مآب نقابت انتساب سیّد اولاد حسن سلمہ اللہ تعالیٰ" کے شان دار الفاظ سے خطاب کیا ہے اور ان کی تبلیغ و اشاعتِ دینی اور رنگ و انداز مجاہدانہ کی بہت تعریف کی ہے۔

حضرت سیّد احمد بریلوی کی شہادت کے بعد سیّد اولاد حسن کو نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی جانب سے ملازمت اختیار کرنے کی درخواست کی گئی لیکن چوں کہ اس کی بعض باتیں خلاف شرع تھیں، اس لیے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ حکام فرخ آباد کی طرف سے منصب افتا و قضا قبول کرنے کی دعوت دی گئی، اس کے لیے بھی تیار نہ ہوئے تو مولانا ولی اللہ فرخ آبادی کو اس منصب پر متعین کیا گیا۔

حیدر آباد (دکن) کے دربار میں ان کے والد سیّد اولاد علی انور جنگ بہادر عرصے تک ملازم رہے تھے اور ان کی خطیر رقم ریاست کے خزانے میں جمع تھی۔ سیّد اولاد علی کی وفات کے بعد ریاست کے والی نے سیّد اولاد حسن کو باضابطہ فرمان بھیجا کہ یہ رقم آکر لے جائیں، مگر انھوں نے باپ کی رقم لینے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ یہ اندوختہ ان کے زمانۂ شیعیت کا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی انگریزی حکومت کے ملازموں کی دعوت قبول کر لیتے تھے، لیکن سیّد اولاد حسن قنوجی اس کو مال مشتبہ سمجھتے اور اس سے منع فرماتے تھے۔ مولانا عبدالحی

تو ان کے نقطۂ نظر کو مان لیتے، لیکن مولانا اسماعیل شہید جواب دیتے کہ "آخر یہ لوگ کام ہی کر کے تو پیسے لیتے ہیں۔"

سید اولاد حسن نے اپنی زندگی خدمتِ حدیث و سنت کے لیے وقف کر دی تھی۔ بہت مؤثر وعظ کہتے اور بدعات کی قرآن و حدیث کی روشنی میں تردید کرتے۔ ان کے علاقے اور شہر کے لوگ ان کی بے حد تکریم کرتے اور شرعی معاملات میں ان ہی کے فتوے اور تحقیق کو لائق اعتنا ٹھہراتے۔

وہ چھوٹی بڑی سترہ کتابوں کے مصنف تھے، جو عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں ہیں، اور خالص دینی اور فقہی نوعیت کی ہیں۔ ان میں تیرہ کتابیں حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ الاختصاص ببیان الحدود والقصاص۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔

۲۔ تقویۃ الیقین برد المشرکین: فارسی میں ہے۔

۳۔ نور العرفا من مرأۃ الصفا: فقہی مسائل سے متعلق ہے اور فارسی میں ہے۔

۴۔ راہِ جنت: یہ چالیس احادیث کی شرح ہے اور فارسی نظم میں ہے۔

۵۔ رسالہ در معنی کلمۂ توحید: فارسی میں۔

۶۔ فتویٰ فی ردِّ تعزیہ: فارسی میں۔

۷۔ رسالہ در بیان مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ: میاں جی یار علی کے رد میں ہے۔

۸۔ اردو ترجمہ حبل المتین بقول المسبتین فی حقوق الخلق اجمعین۔

۹۔ رسالہ در بیانِ آدابِ وعظ: فارسی میں۔

۱۰۔ رسالہ در بیان بیعت و انواع و حقائق آں: فارسی میں۔

۱۱۔ ہدایت المومنین: در ردِّ تعزیہ۔

۱۲- راہِ سنت منظوم : اردو-

۱۳- رسالہ در منع افروختن و چراغاں بر قبور: یہ بھی اردو میں ہے اور اس میں شریعت کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ قبروں پہ چراغاں کرنا جائز نہیں۔

نواب محمد صدیق حسن خاں اتحاف النبلا میں لکھتے ہیں کہ ان کے کتب خانے میں بہت سی ضخیم قلمی کتابیں ان کے ہاتھ کی کتابت شدہ موجود ہیں، جن میں تفسیر فتح العزیز کی تین جلدیں، مجالس الابرار ایک جلد، طریقۂ محمدیہ ایک جلد، تحفہ اثنا عشریہ، نور الانوار اور تنقیح الشعرا شامل ہیں[۴۹]۔

سید اولاد حسن خاں کا مرتبۂ علمی اس قدر بلند تھا کہ اس دور کے تمام علما و فضلا اور اقران و معاصرین ان کی تعظیم کرتے اور ان کی مجلس میں حاضر ہونے کو سعادت سمجھتے تھے۔ نہایت صابر و شاکر، قانع و بے نیاز، عابد و زاہد، ذکی و فطین، سریع الادراک، حاضر جواب، مہمان نواز، مستجاب الدعوات، متبع سنت، پرہیز گار، سلفی العقیدہ اور بلند اخلاق عالم دین تھے۔ غرض تمام اوصافِ حمیدہ سے متصف تھے۔

سید صاحب ممدوح شاعر بھی تھے۔ جیساکہ پہلے عرض کیا گیا مسلکاً اہلِ حدیث تھے اور براہِ راست کتاب و سنت سے تمسک کرتے تھے۔ اس ضمن میں "راہِ سنت" سے ان کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

اب کسی کا فعل ہو یا قول ہو　　چاہیے سنت سے اس کو تول لو
مولوی فاضل ہو یا استاد دبیر　　یا ولی یا شیخ یا شاہ و فقیر

---

[۴۹] اتحاف النبلا ص ۲۳۶ — سید اولاد حسن کی کتابیں ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نواب محمد صدیق حسن خاں کے پاس رہیں، پھر وہ بھی وفات پا گئے تو ان کا کتب خانہ جو بہت عمدہ اور شاندار کتابوں پر مشتمل ہے، ندوۃ العلما لکھنؤ میں منتقل ہو گیا۔ اب یہ کتب خانہ وہیں ہے۔

زندہ ہو، مردہ ہو یا نزدیک و دور — ہو ولایت یا کرامت کا ظہور

ہو رسالہ یا کہ ہو کوئی کتاب — مجتہد ہو یا فقیہِ لاجواب

گر اسے برحسبِ سنت پائیے — بے خطر اس کو عمل میں لائیے

گر نہ ہو سنت سے اس کو اتفاق — چھوڑ دے اس کو ہے گر دارِ شقاق

ہے خطا کی پیروی کرنا خطا — یہ اجازت کب ہوئی ہم کو روا

ہر طرح تبعیت اور تقلیدِ عام — غیر پیغمبر کی ہے جائے کلام

مذہبِ اربابِ سنت کر یقیں — جز نبی معصوم عالم میں نہیں

مجتہد کے حق میں ہے یخطی یصیب — ہے خطا جائز ولی سے اے حبیب

جو خطا تقلید میں ہوتی معاف — کس لیے پڑتا بھلا پھر اختلاف

کہتے ہیں اکثر گروہِ معتقد — ہے خطا سے پاک قولِ مجتہد

دشمنِ تحقیق ان کی بات ہے — جز نبی معصوم کس کی ذات ہے

علم ہیں رکھتے بہت عالم مگر — کس لیے نزدیک اربابِ خبر

راہ پر کچھ اور کچھ بے راہ ہیں — اگرچہ اہلِ علم ہیں آگاہ ہیں

اچھے اچھے ہیں خطا میں آپڑے — مذہبِ باطل میں عالم ہیں بڑے

الغرض یہ وہم ہیں سب درخیال — ہے بجائے خود یہ دعویٰ محال

جان و دل سے چاہیے کرنا قبول — لطف قال اللہ اور قال الرسول

سن چکے تم حسن ارشادِ نبی
چاہیے سنت کی اب تو پیروی

سید اولاد حسن قنوجی جلیل القدر عالم، محدث و فقیہ اور مجاہد و جنگ جو تھے۔ برصغیر کے اونچے مرتبے کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے، اور دونوں عالم و فاضل۔ ایک مولانا سید احمد حسن عرشی، اور دوسرے نواب سید محمد صدیق حسن خاں۔!

سید اولاد حسن قنوجی نے صرف تینتالیس سال عمر پائی اور سید احمد بریلوی

کی شہادت کے سات سال بعد ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) کو قنوج میں انتقال کیا۔ ان کی وفات کے وقت نواب صدیق حسن خان کی عمر صرف پانچ برس تھی اور احمد حسن سات سال کے تھے۔[۵]

## بعض اور فقہائے کرام

برِصغیر پاک و ہند کے تیرھویں صدی ہجری کے اِن فقہائے کرام کے علاوہ ردیف الف کے ذیل میں اور بھی متعدد فقہا کے اسمائے گرامی شامل ہیں لیکن تذکرہ و رجال کی کتابوں میں ان کے حالات مذکور نہیں ہیں۔ صرف دو دو چار چار سطروں میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں:

۱- شیخ ابو اسحاق بھیروی: ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی) کے ایک گاؤں موضع بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ مختلف اساتذۂ عصر سے حصول علم کیا، جن میں مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا محمد فاخر زائر الٰہ آبادی (متوفی ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ) بھی شامل ہیں۔ ان سے کتبِ حدیث پڑھیں۔ شیخ ابو اسحاق بھیروی کا شمار اپنے دور اور علاقے کے اصحاب الحدیث، نامور فقہا اور اہلِ تقویٰ میں ہوتا ہے۔ ان سے بے شمار حضرات نے استفادہ کیا۔ ۱۲۳۴ھ میں فوت ہوئے۔

۲- مولانا احمدی بن نعیم کرسوی: اپنے دور کے فقیہ تھے۔ بنارس کے منصبِ قضا پر فائز رہے۔ اس کے بعد گورکھپور کے قاضی مقرر ہوئے۔ موضع کرسی کے رہنے والے تھے، جو نواحِ لکھنؤ میں ایک قریہ تھا۔ وہیں فوت ہوئے۔

۳- قاضی اخی بن محمد حسین سورتی: فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد قاضی اخی نے منصبِ مشیخت کو زینت بخشی۔

---

[۵] تفصیل کے لیے دیکھیے اتحاف النبلاء ص ۲۳۵ تا ۲۳۸ — مآثر صدیقی ج ۱ ص ۵۳ تا ۴۷ — التاج المکلل ص ۲۹۳، ۲۹۴ — جماعت مجاہدین ص ۲۶۱ تا ۲۶۳ — تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۲۶۹ تا ۲۷۴۔

۴۔ مفتی اسد اللہ الہ آبادی: بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ولادت ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۳۰ھ کو ہوئی۔

۵۔ مولانا اسد اللہ انصاری لکھنوی: فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ ۳ رمضان ۱۲۸۱ھ کو وفات پائی۔

۶۔ مولانا اسد اللہ بنگالی: ڈھاکہ کے رہنے والے تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جید عالم تھے۔

۷۔ مولانا اسلم رام پوری: کتب فقہ، اصول فقہ اور عربی علوم کے ماہر تھے۔ رام پور (ہندوستان) کے رہنے والے اور درس و تدریس کے دل دادہ تھے

۸۔ مولانا اسماعیل برہان پوری: فقہ و اصول اور علوم مروّجہ میں یگانہ تھے۔ برہان پور کے باشندے تھے۔ وہیں رحلت پائی۔

۹۔ مولانا اسماعیل سورتی: تیرھویں صدی ہجری کے علاقۂ گجرات کے نامور فقیہ اور اصولی تھے۔ بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ۵ شوال ۱۲۸۷ھ کو سورت میں انتقال کیا۔

۱۰۔ قاضی افضل الدین کاکوروی: ممتاز حنفی فقیہ تھے۔ مرشد آباد کے عہدۂ قضا پر فائز رہے۔ ۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۲۳۷ھ کو عظیم آباد (پٹنہ) میں وفات پائی۔

۱۱۔ مفتی اکرام الدین دہلوی: ۱۱۹۰ یا ۱۱۹۱ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے دور کے مفتی اور فقیہ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی نسل سے تھے۔ ان کی تصنیفات میں دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک سل الصمصام علی من قال ان المزامیر لیست بحرام — دوسری سعادۃ الکونین فی فضائل الحسنین۔

۱۲۔ قاضی امام الدین کاکوروی: ۹ شوال ۱۱۶۷ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد قاضی حمید الدین کاکوروی، بڑے بھائی قاضی نجم الدین کاکوروی، اور

بحرالعلوم مولانا عبدالعلی لکھنوی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر درس وافادۂ طلبا میں مصروف ہوئے۔ بنارس کے منصب قضا پر بھی مامور کیے گئے۔ صوبہ بہار کے قاضی القضاۃ بھی رہے۔ حدیث و فقہ میں کامل تھے۔ ایک رسالہ علم تجوید کے بارے میں اور ایک علم النسبہ کے موضوع پہ لکھا۔ ۸ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۹ھ کو کاکوری میں وفات پائی۔

۱۳۔ مفتی امیر اللہ مدراسی: حنفی المسلک فقیہ تھے۔ محکمۂ افتا میں مفتی کے منصب پر متعین تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی تھا۔ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۰ھ کو سفر آخرت پہ روانہ ہوئے۔

۱۴۔ مولانا امین اللہ انصاری لکھنوی: لکھنؤ کے فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ ۲۹ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۳ھ کو لکھنؤ میں ارتحال کیا۔

۱۵۔ مولانا انوار الحق رام پوری۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد سے تھے۔ اپنے دور کے محدث اور فقیہ تھے۔ ۱۲۷۱ھ میں "اثبات رفع المسبحۃ وقت التشہد فی الصلوٰۃ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔

# ب

## ۳۷۔ حافظ بارک اللہ لکھوی

برصغیر پاک وہند کے شرفاو نجبا میں متحدہ پنجاب کا لکھوی خاندان صفِ اوّل میں شمار ہوتا ہے۔ فضیلتِ علمی، تدین وتقویٰ، تصوّف وسلوک، زہد و عبادت، تصنیف وتالیف، بیعت وارشاد اور درس وتدریس میں کوئی اس خاندان کے اصحابِ علم کا حریف نہیں۔ پھر جس جذبۂ خلوص اور شوق ولگن کے ساتھ اس کے اربابِ کمال نے جو بوقلموں خدمات انجام دیں، اس میں بھی کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انکسار و تواضع، للہیت اور خوفِ خدا ہمیشہ ان حضرات عالی مرتبت کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ یوں تو ان کی تگ وتازِ علمی کا دائرہ برصغیر پاک وہند کے دور دراز گوشوں تک پھیلا ہوا ہے، لیکن بالخصوص پنجاب میں ان کے اثر ونفوذ کا یہ حال ہے کہ اس خطّے کے اکثر اہلِ علم بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی خاندان کے خرمنِ کمال کے خوشہ چیں ہیں۔ تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی کو اس خانوادۂ فضل کمال کے رکنِ رکین کی حیثیت حاصل تھی۔

### آبا واجداد

حافظ بارک اللہ کے والد ماجد کا اسمِ گرامی حافظ احمد اور جدِّ امجد کا نامِ نامی حافظ محمد امین تھا۔ سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے امام محمد بن حنفیہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ خاندانی اعتبار سے علوی تھے اور درمیان کے تمام حضرات اپنے اپنے دَور میں قبلہ گاہِ تشنگانِ فیض تھے۔ مخلوقِ خدا کی اصلاح اور روحانی نفع رسانی ان کا اصل کام تھا۔

## قدیم وطن

حافظ بارک اللہ کے جدِّ نامدار حافظ محمد امین ضلع قصور کے موضع ڈھنگ شاہ کے رہنے والے تھے، یہ ان کا قدیم وطن تھا اور عرصے سے یہاں آباد تھے۔ ان کے دادا کا نام ابوداؤد تھا، جو عوام میں "ڈھنگ شاہ" کے عرف سے معروف ہوئے۔ یہ گاؤں ان کی ملکیت تھا اور ان ہی کے نام سے اس کا نام ڈھنگ شاہ پڑا۔ بعد ازاں تغیر و انقلاب کی ایسی بے رحم لہریں اٹھیں کہ اس نواح میں سکھ راج قائم ہوگیا اور یہ علاقہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ابوداؤد کی وفات اسی گاؤں میں ہوئی۔ وہ انتہائی نیک اور پارسا بزرگ تھے اور گردونواح کے لوگ ان کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ وفات کے بعد ان کی قبر پر عرس کی محفلیں جمنے لگیں اور کئی قسم کی بدعات کا ارتکاب ہونے لگا۔ ان کے پوتے حافظ محمد امین نے لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش کی اور اصلاحِ احوال کے لیے میدان میں نکلے، لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ بالآخر اپنے آبائی وطن (ڈھنگ شاہ) کی سکونت ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔

## لاہور میں قیام

حافظ محمد امین کے دو بیٹے تھے۔ ایک حافظ احمد اور دوسرے حافظ نور محمد! دونوں کو ساتھ لیا اور لاہور چلے آئے۔ ان کو تعلیم دلائی اور بہتر طریقے سے ان کی تربیت کا اہتمام کیا۔ بیٹوں کی تکمیلِ تعلیم تک وہ لاہور میں مقیم رہے۔ یہ عرصہ چند سال کو محیط ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس واقعہ پر دو ڈھائی سو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن بالخصوص لاہور اور اس کے اطراف میں مثلاً اضلاعِ لاہور، ساہیوال اور قصور کے قصبات و دیہات میں اب بھی اس خاندان کے اہلِ علم کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان مقامات کے لوگ ان سے تعلقِ عقیدت و ارادت رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ سات آٹھ نسلوں سے بدستور چلا آرہا ہے۔

ایک تو یہ اس خاندان کی نیکی کا نتیجہ ہے، دوسرے لوگوں کے دلوں میں یہ بات پیوست ہو چکی ہے کہ وہ اسی خاندان کے اکابر کی تبلیغ سے رُشد و ہدایت کی نعمت سے بہرہ مند ہوئے ہیں۔

## فیروز پور میں سکونت

جب بیٹے تعلیم سے فارغ ہو گئے تو حافظ محمد امین نے لاہور کی سکونت ترک کر کے فیروز پور کا قصد کیا اور وہیں اقامت گزین ہو گئے۔ فیروز پور اور اس کے اطراف و جوانب میں ان باپ بیٹوں نے اسلام کی خوب اشاعت کی، قریہ قریہ گھومے، لوگوں کو اتباعِ سنت کی تلقین کی، توحید کا درس دیا اور مسائل دین سے آگاہ اور احکامِ شرع سے باخبر کیا۔ اس نواح میں ان کی تبلیغی سرگرمیاں بہت مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور کثیر تعداد میں لوگ ان کے اخلاص اور زہد و اتقا کی وجہ سے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ حافظ محمد امین نے فیروز پور میں وفات پائی اور بڑے بازار میں "نوگزے" کی قبر کے قریب مدفون ہوئے۔

## فیروز پور سے نقل مکانی

حافظ محمد امین کی وفات کے بعد دونوں بیٹوں — حافظ احمد اور حافظ نور محمد — نے فیروز پور کی سکونت ترک کر دی۔ حافظ نور محمد نے تو فیروز پور سے متصل ایک گاؤں "بارے کے" میں اقامت اختیار کر لی اور حافظ احمد نے فیروز پور سے بہ جانب مغرب چودہ میل دُور موضع "لکھوکے" کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا۔ دونوں بھائی علم و فضل اور تقویٰ و تدین کے زیور سے آراستہ تھے، اپنے اپنے علاقوں میں دونوں دعوت و ارشاد اور اصلاح و تبلیغ میں سرگرم و مستعد ہوئے، اور بہت جلد لوگوں کا مرکزِ عقیدت بن گئے — ان کی تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں تصوّف و سلوک اور معرفت و ادراک کی دنیا میں لکھوکے کے چھوٹے سے گاؤں نے شہرتِ دوام حاصل کی۔

## حافظ بارک اللہ کی ولادت

موضع "لکھوکے" کے قریب ایک گاؤں "طور" تھا۔ وہاں کے رئیس نے اپنی بیٹی حافظ احمد کے عقد میں دے دی تھی، جس کے بطن سے ۱۲۰۱ یا ۱۲۰۲ھ (۸۶-۱۷۸۷ء) میں حافظ بارک اللہ پیدا ہوئے۔ یہ نہایت نیک اور پرہیزگار خاتون تھیں، اپنے اس بیٹے کو ہمیشہ باوضو ہو کر دودھ پلاتی تھیں۔ حافظ بارک اللہ کے والد حافظ احمد بھی بہت متقی بزرگ تھے اور اپنے عہد اور علاقے کے جید عالم تھے۔ نانا بھی صاحب علم اور صاحب دل تھے جنھوں نے رئیس اور امیر آدمی ہونے کے باوجود اپنی بیٹی ایک اجنبی شخص کے نکاح میں محض اس کے علم و اتقا کی بنا پر دے دی تھی۔ یعنی حافظ بارک اللہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ننہال اور ددھیال دونوں طرف سے صاحبِ فضل و مجد تھے۔

## حصولِ تعلیم

حافظ بارک اللہ نے خیر و صالحیت کے ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور تقویٰ و پاکیزگی کی فضا میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ گھر میں علم کی نہر جاری تھی، اور بلند بخت باپ کا سلسلۂ درس و اصلاح قائم تھا، بڑے ہوئے تو والدِ گرامی سے قرآنِ مجید حفظ کیا، عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں اور علومِ متداولہ اور فنونِ متعارفہ میں مہارت حاصل کی۔

## شاہ غلام علی کی خدمت میں

حافظ بارک اللہ کا عہد وہ عہد ہے جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی شوکتِ حکمرانی دم توڑ رہی تھی اور غلامی کے سائے لمحہ بہ لمحہ بڑھتے جا رہے تھے، لیکن اس شر میں خیر کا پہلو یہ تھا کہ اس میں یہاں علم و فضل کی بے پناہ اشاعت و ترویج ہوئی اور تقویٰ و للہیت کے وہ مظاہر سامنے آئے جن کا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ جلیل القدر علما پیدا ہوئے اور صوفیا و اتقیا کی کثیر جماعت عالمِ وجود میں آئی۔ ان میں ایک رفیع القدر بزرگ شیخ غلام علی

دہلوی تھے۔ شیخ ممدوح ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور کے قصبہ بٹالہ میں پیدا ہوئے اور ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) کو دہلی میں وفات پائی۔ انھیں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی ارادت و خلافت کا شرف حاصل تھا۔ علم و فضل میں یگانۂ روزگار اور زہد و عبادت میں یکتائے عصر تھے۔ دہلی میں ان کی خانقاہ اصحابِ تصوّف اور ارباب علم کا مرجع و ماوی تھی۔ نہایت متبع سنت اور حامیِ شریعت تھے۔ ہندوستان اور افغانستان کا تو ذکر ہی کیا کہ یہاں کے کثیر تعداد میں لوگ حصولِ فیض کے لیے ان کے پاس آتے تھے، ترکی، شام، مصر، بغداد چین اور حبش کے لوگ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور خانقاہ میں قیام کو سعادتِ ابدی سمجھتے تھے۔[1]

حافظ بارک اللہ بھی چوں کہ پشت ہا پشت سے خانوادۂ تصوّف و سلوک سے تعلق رکھتے تھے، لہٰذا انھوں نے بھی دہلی کے لیے رختِ سفر باندھا اور شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے فیض حاصل کیا اور طریقت کی منزلیں طے کیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس زمانے میں دہلی گئے، کتنا عرصہ وہاں رہے اور کب مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دہلی کو اس عہد میں علما و فضلا کے گہوارے اور صوفیا و اتقیا کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اور تشنگانِ علوم ظاہری و باطنی دہلی ہی کا قصد کرتے تھے کہ وہیں کے چشمہ ہائے فیض سے ان کی تشنگی دُور ہوتی تھی۔

حضرت شاہ غلام علی کی بارگاہِ کمال سے اس دَور کے بہت سے اعاظم رجال نے استفاضہ کیا اور مراتبِ بلند پر پہنچے۔ ان حضرات میں شیخ ابو سعید مجدّدی دہلوی (متوفی یکم شوال ۱۲۵۰ھ) ان کے فرزند دلبند شیخ احمد سعید مجدّدی (متوفی ۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ) حضرت شیخ عبدالغنی مجدّدی (۶ محرم ۱۲۹۶ھ) شیخ محمد آفاق دہلوی (متوفی

---

[1] آثار الصنادید ص ۲۰۹

۷ محرم ۱۲۵۱ھ) اور حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی (متوفی ۱۲۸۷ھ) رحمہم اللہ شامل ہیں۔

دہلی میں اس زمانے میں علما کا جھمگٹا تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ عبدالقادر دہلوی، شاہ رفیع الدین دہلوی اور شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی رحمہم اللہ عنہم موجود تھے اور ان حضرات کے یکے بعد دیگرے مسلسل درس و تدریس کے سحر کے بپا رہے۔ ان کے علاوہ مولانا رشید الدین خاں دہلوی (متوفی ۱۲۴۳ھ) مولانا محمد اسماعیل شہید (شہادت ۱۲۴۶ھ) سید احمد شہید (شہادت ۱۲۴۶ھ) مولانا عبدالحی بڑھانوی (متوفی ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ) مولانا مملوک علی (متوفی ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ) اور بہت سے دیگر علماء و مشائخ اس دور میں دہلی میں قیام فرما تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ حافظ بارک اللہ کی ان حضرات میں سے بعض بزرگوں سے صحبتیں رہی ہوں گی اور وہ دہلی کے علماء و صوفیا سے مستفید ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ تذکرہ و رجال کی کتابوں میں اس کی وضاحت مذکور نہیں، لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دہلی جا کر صرف حضرت شیخ غلام علی علوی ہی سے استفاضہ نہیں کیا ہوگا، دوسرے اکابرِ دہلی کی خدمت میں بھی حاضری دی ہوگی۔

## کھیتی باڑی

حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے عہد کے ولیٔ کامل اور انتہائی عابد و زاہد تھے۔ ہر معاملے میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ مشتبہ اور مشکوک چیزوں کے قریب تک نہ جاتے اور رزقِ حلال کی تلاش میں رہتے۔ ان کے والدِ گرامی حافظ احمد کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی کسبِ معاش میں نہایت محتاط تھے اور کھیتی باڑی کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ حافظ بارک اللہ نے بھی یہی سلسلہ شروع رکھا۔ وہ درس و تدریس کے لیے بھی وقت دیتے، دعوت و ارشاد اور تصوّف و سلوک کا فریضہ بھی انجام دیتے، دیہات میں جا کر لوگوں کو اتباعِ سنت کی تلقین بھی فرماتے، اور اس بے پناہ مصروفیت کے باوجود اپنے ہاتھ سے کمائی کر کے روزی حاصل کرنے کی سعی

پر بوجھ بننا یا کسی سے کچھ توقع رکھنا ہرگز ان کا شیوہ نہ تھا۔ اس کمائی سے اللہ نے ان کو بہت وسعت اور فراخی عطا فرمائی تھی۔

## تلامذہ

حافظ بارک اللہ کے تلامذہ کی تفصیل کا پتا نہیں چلتا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ضلع فیروز پور اور اس سے دور دراز علاقے کے لوگوں پر لکھوی خاندان کے اکابر کا گہرا اثر تھا اور وہ ہر مسئلۂ شرعی میں ان ہی سے رجوع کرتے تھے، اس لیے یہ کہنا خلاف واقعہ نہیں کہ ان کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی اور وہ اپنے اپنے علاقوں میں مصروفِ درس و افادہ تھے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ حافظ صاحب ممدوح کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت حافظ محمد لکھوی اور دوسرے مولوی محمد صالح۔ دونوں نے باپ سے علم حاصل کیا اور ان ہی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ مولوی محمد صالح کے حالات نہیں ملتے، لیکن حافظ محمد لکھوی کے علم و ادراک اور تصنیف و تالیف کی معرکہ آرائیاں سب کے سامنے ہیں۔ حافظ محمد لکھوی، حافظ بارک اللہ کو جامع الاصول والفروع قرار دیتے ہیں اور ان کا شمار اپنے عہد کے فقہائے ذی احترام اور علمائے عالی مرتبت میں کرتے ہیں ——— حافظ محمد کو حصول علم کا جو بہت زیادہ شوق پیدا ہوا، اور برصغیر کے مختلف مراکزِ علم میں جا کر اس دور کے رفیع المرتبت اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تو اس میں لازماً باپ کی فراوانیِ علم کا اثر کارفرما تھا۔

## تدین و تقویٰ اور حق گوئی کی ایک مثال

حافظ بارک اللہ کا شمار پنجاب کے تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز علماء و فقہا میں ہوتا ہے۔ زہد و ورع میں بھی ان کا مقام بہت اونچا تھا اور کلمۂ حق کہنے میں بھی جری تھے، اللہ اور رسول کے احکام کی تبلیغ و اشاعت میں وہ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اور اعلائے کلمۃ اللہ میں کوئی مصلحت ان کا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا اور مختلف دیہات و قصبات سے آکر

لوگ ان سے استفادہ و استفاضہ کرتے تھے۔ ان کا گاؤں "لکھوکے" (جو ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب میں ہے) اس زمانے میں ریاست ممدوٹ کے ماتحت اور اس سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔

حافظ بارک اللہ کی حق گوئی اور غیرت دینی سے متعلق ایک واقعہ قابل ذکر ہے، جو ۱۲۴۵ھ میں پیش آیا، اس وقت ان کی عمر چوالیس پینتالیس برس کی تھی سو واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت اہم ہے اور مندرجہ ذیل ہے: (یہ واقعہ ان سطور کے راقم کو عرصہ ہوا، حضرت مولانا محمد علی لکھوی مدنی مرحوم نے بھی سنایا تھا)۔

ایک دن مسجد میں طلبا کو درس دے رہے تھے کہ والیِ ممدوٹ نواب قطب الدین[۲] خاں اپنے چند مصاحبوں اور وزیروں کے ساتھ ملاقات کو آیا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ اس نے کنگن پہن رکھے ہیں۔ ان کا خادم علی محمد قریب ہی بیٹھا تھا، اس نے عرض کیا: "سونے کے کنگن ہیں"[۳] یہ سن کر نواب کے ہاتھ جھٹک دیے اور سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "ہم درویش لوگ ہیں اور امورِ دنیا سے منقطع ہو کر مسجد میں بیٹھے ہیں۔ بے دین لوگ یہاں بھی ہمیں آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ ایسی چیزیں پہن کر آ گئے ہیں جو مردوں کے لیے شریعت نے حرام ٹھہرائی ہیں۔" یہ لفظ کہے اور نواب کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے مسجد کے اندر

---

۲ے مولا بخش کشتہ مرحوم نے اپنی کتاب "پنجابی شاعراں دا تذکرہ" (ص ۱۵۷) میں نواب جمال الدین خاں لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ اس زمانے کے نواب ممدوٹ کا نام قطب الدین خاں تھا۔ دیکھیے منظورۃ السعدا ورق ۶۳۴ ب۔

۳ے کشتہ مرحوم نے لکھا ہے کہ بینائی ختم ہو گئی تھی، دیکھ نہیں سکتے تھے، ٹٹول کر پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میرے خیال میں یہ درست نہیں، حافظ صاحب اس وقت چوالیس پینتالیس سال کے جوان تھے اور بینائی ٹھیک تھی۔

چلے گئے۔

نواب نے اس طرزِ عمل اور اسلوب کلام کو گستاخی پہ محمول کیا اور اس کا پندارِ حکمرانی مسجد کے ایک درویش کے کلمۂ حق کو برداشت نہ کر سکا۔ حکم ہوا "اس کو فوراً حدودِ ریاست سے باہر نکال دیا جائے"۔ لوگوں نے نواب کو سمجھانے کی کوشش کی اور جلاوطنی کا یہ سخت حکم واپس لینے پہ آمادہ کرنا چاہا، مگر وہ نہ مانا۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور حافظ بارک اللہ اہل و عیال اور طلبا و مریدین کو ساتھ لے کر دریائے ستلج کے کنارے آئے جو قریب ہی بہتا تھا، اور کشتی میں سوار ہو کر ریاست بہاول پور کو روانہ ہو گئے۔ ان کا ارادہ حجازِ مقدس جانے کا تھا۔

موجودہ جغرافیائی حساب کے مطابق وہ ہیڈ سلیمان کی کے قریب "حاصل ساڈو" کے مقام پر اترے لیکن ان کی روانگی کے بعد یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ بلا ظاہری اسباب و آثار اور موسم کے، دریائے ستلج میں شدید طغیانی آگئی، جس سے نواب ممدوٹ کے باغ، محلات اور شاہی قلعے کو سخت نقصان پہنچا۔ نواب اس صورتِ حال سے انتہائی پریشان ہوا، اور مصاحبوں سے اس ناگہانی آفت کے بارے میں بات کی۔ جواب ملا۔ "یہ سب حافظ بارک اللہ کو جلا وطن کر دینے کا نتیجہ ہے۔ وہ بہت متقی اور پرہیزگار بزرگ ہیں، انھوں نے ایک صحیح بات کہی تھی، جس سے ناراض ہو کر انھیں ریاست بدر کر دیا گیا ہے۔ اگر انھیں واپس نہ لایا گیا تو مزید طغیانی اور تباہی کا خطرہ ہے"۔

نواب قطب الدین خاں پر یہ سُن کر سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور اسی وقت اپنے ماموں کی قیادت میں چند گھڑ سواروں کو حافظ صاحب کے پیچھے دوڑایا، نواب بہاول پور کے پاس بھی چند معززین کو بھیجا کہ وہ حافظ بارک اللہ کو جو اُن کے علاقے میں جا بیٹھے ہیں مہربانی کر کے واپس بھیج دے ۔۔۔ حافظ صاحب واپس تشریف لائے تو طغیانی رُکی اور دریا کا پانی پہلی سطح پہ آ گیا۔

نواب نے حافظ صاحب سے معافی مانگی اور "لکھوکے" کا گاؤں بہ طور جاگیر

ان کو پیش کیا۔ لیکن حافظ صاحب نے یہ کہہ کر گاؤں لینے سے انکار کر دیا کہ ایک تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں، دوسرے ہم ایسی زمین نہیں لینا چاہتے جس کا لگان اور معاملہ و آبیانہ وغیرہ ہم حکومت کو ادا کرنے پر مجبور ہوں۔ اس کے بعد نواب نے ان کو وہ زمین واپس کر دی جو اُن کے والد حافظ احمد صاحب کے وقت سے انھیں عطا کی گئی تھی اور ان کو ریاست بدر کر دینے کے بعد بحق سرکار ضبط کر لی گئی تھی۔ اس زمین کا لگان پہلے سے معاف تھا، اس لیے اس کو "معافی کی زمین" کہا جاتا تھا۔ یہ زمین تقسیم ملک تک حافظ بارک اللہ کی اولاد کے قبضے میں رہی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اس واقعہ سے پہلے ریاست کا صدر مقام ممدوٹ تھا۔ لیکن اس کے بعد نواب قطب الدین خاں نے جلال آباد کو صدر مقام بنا لیا تھا اور تقسیم ہند تک جلال آباد ہی ریاست کا صدر مقام رہا۔ نیز شاہی محلات کے جو حصے دریا کی طغیانی سے منہدم ہو گئے تھے، آزادیٔ وطن تک اسی حالت میں تھے۔

ایک اور واقعہ

حافظ بارک اللہ کے موضع حاصل ساڈھ میں قیام کے زمانے کا یہ واقعہ لائقِ تذکرہ ہے کہ اس علاقے کے لوگوں نے ان کو بتایا کہ اس جنگل میں کسی ایسی بد روح کا اثر ہے جو اُن مال مویشیوں کو ہلاک کر دیتی ہے جو اس کی حد میں چلے جاتے ہیں، لہٰذا آپ اپنے اونٹ وغیرہ وہاں نہ جانے دیں۔ حافظ صاحب نے جواب دیا، اللہ نگہبان ہے اور وہی ہر شے کا مالک ہے، اس کے سوا نہ کوئی کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ فائدہ —!

لیکن اس کے چند روز بعد معلوم ہوا کہ ان کا اونٹ اسی جگہ چلا گیا تھا، جس جگہ کے بارے میں لوگوں نے بتایا تھا کہ وہاں کسی بد روح کا اثر اور ٹھکانا ہے، اور وہ اونٹ وہاں جاتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ حافظ صاحب وہاں پہنچے اور بعض آیات قرآنی پڑھ کر اونٹ پر پھونکیں تو وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر چاروں طرف پھونک ماری اور فرمایا اب بے شک کوئی جانور اس جنگل میں کہیں گھومے پھرے اس کو کوئی نقصان نہیں

پہنچے گا۔ چنانچہ اس کے بعد انھیں اس قسم کی کوئی شکایت نہیں پہنچی اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ حافظ صاحب وہاں کتنا عرصہ رہے؟ اس کا پتا نہیں چلتا۔

## سیّد جعفر علی سے ملاقات

یہی وہ مقام ہے، جہاں امیر المجاہدین سیّد احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت کے نامور مجاہد سیّد جعفر علی نقوی کی، جہاد کے لیے سرحد پار جاتے ہوئے ان سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا ذکر سیّد جعفر علی نے اپنی کتاب منظورۃ السعدا میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ودرآن ایام میاں بارک اللہ بزرگے بودند کہ از خان مذکور ناخوشنود شدہ از عمل او بیروں رفتہ بودند، از ایشاں ملاقات نمودم، تلطف بسیار نمودند و مریدانِ شان محبت بسیار نمودند[۴]

یعنی ان دنوں ایک بزرگ میاں بارک اللہ[۵] سے ملاقات ہوئی، جو (نواب قطب الدین) خان مذکور سے ناخوش تھے اور ریاست بدر کر دیے گئے تھے۔ وہ نہایت شفقت اور مہربانی سے پیش آئے، ان کے مرید بھی بہت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

یہاں چار باتیں لائقِ تذکرہ ہیں:

---

[۴] منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ و الشہداء ورق ۶۳۴ ب۔

[۵] کتاب کا جو قلمی نسخہ میرے پیشِ نگاہ ہے اس میں "تبارک اللہ" مرقوم ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ "منظورۃ السعدا" کئی مرتبہ نقل ہوئی اور مختلف حضرات نے اس کو نقل کیا۔ اس کی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں بھی پہنچی۔ ساڑھے چھ سو ورق اور تیرہ سو سے زائد صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب نقل در نقل ہوتی رہی، اور اس طرح کسی نقل نویس نے "بارک اللہ" کو "تبارک اللہ" بنا دیا۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے میں الفاظ کی اور بھی متعدد غلطیاں ہیں، بعض مقامات کے نام بھی صحیح نہیں لکھے گئے ہیں۔ قلمی کتابوں میں غلطیاں بہر حال ہوتی ہیں۔

۱- حافظ بارک اللہ خلافِ شرع بات برداشت نہ کرتے تھے، اگرچہ اس کا نتیجہ جلاوطنی کی صورت میں نکلتا ہو۔

۲- وہ بلند اخلاق، مشفق اور متقی بزرگ تھے۔ ان کی نیکی کی وجہ سے لوگ ان سے متاثر ہوتے تھے۔ سیّد جعفر علی نقوی جیسے عالم و فاضل اور متدین و صالح بزرگ بھی ان سے اثر پذیر ہوئے، انھیں یاد رکھا اور اپنی کتاب میں ان کا ذکر کیا، ورنہ اثنائے راہ میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں، کون کسی کو یاد رکھتا ہے۔ وہی شخص یاد رہتا ہے جو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہو اور جس کے عمل و فعل نے دل پر کوئی خاص نقش قائم کر دیا ہو۔ سیّد جعفر علی کی ۱۲۴۵ھ میں ان سے ملاقات ہوئی اور یہ کتاب انھوں نے ۱۲۷۲ھ میں لکھی، یعنی ملاقات سے ستائیس سال بعد! اتنے طویل عرصے کے بعد وہی شخص اس طرح یاد رہتا ہے کہ اس کا باقاعدہ کتاب میں ذکر کیا جائے، جو بہت بڑی شخصیت کا مالک اور غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہو۔

۳- وہ اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز عالمِ دین تھے، جن کا ایک خاص حلقۂ اثر و ارادت تھا۔

۴- ان کے عقیدت مند اور مرید اچھی خاصی تعداد میں تھے، جو ان کے گاؤں "لکھوکے" سے دور دراز علاقوں میں بھی موجود تھے۔ مریدوں کی ذہنی اور روحانی تربیت وہ احسن طریقے سے کرتے تھے، جس کی بنا پر وہ ملنے والوں سے شفقت و تلطف سے پیش آتے تھے۔

انواع بارک اللہ

حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے عصر میں پنجاب کے سر برآوردہ فقہا اور مشاہیر علما و مشائخ میں سے تھے اور صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ پنجابی کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔

"انواع بارک اللہ" ان کی مشہور تصنیف ہے جو پنجابی نظم میں ہے اور فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ مسائل انھوں نے فقہ حنفی کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ اس کتاب سے صاف پتا چلتا ہے کہ فقہ پر ان کی عمیق اور وسیع نظر تھی۔ یہ کتاب پنجاب میں عرصۂ دراز تک متداول و مقبول رہی۔ لوگ اس کا ذکر بطور حوالے کے کرتے ہیں۔

انواع بارک اللہ کا نام "نصاب الفقہ" بھی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۲۵۴ھ میں تصنیف کی۔ جیساکہ عرض کیا گیا، اس کے مشمولات و مندرجات فقہ حنفی سے ہم آہنگ ہیں۔ مصنف کی وسعتِ مطالعہ کا اس سے پتا چلتا ہے کہ فتاویٰ قاضی خاں، ردالمختار، درالمختار، طحاوی، شامی، فتاویٰ عالم گیری، فتاویٰ مظہری، تفسیر مظہری، ہدایہ، کنز وغیرہ تمام ذخیرۂ فقہ ان کے سامنے ہے اور یہ مسائل میں جا بجا ان کے حوالے درج ہیں۔ تفسیر اور حدیث کی کتابیں بھی ان کے پیشِ نگاہ ہیں۔

فارسی حواشی

اس وقت ۱۸۹۱ء کی شائع شدہ "انواع بارک اللہ" زیرِ نظر ہے[۶]۔ اس کے حواشی حافظ بارک اللہ کے فرزندِ رشید حافظ محمد لکھوی نے تحریر کیے ہیں، جو فارسی زبان میں ہیں۔ کتاب کے بعض مقامات پر حافظ محمد نے اپنے والد محترم کی اجازت سے اضافے بھی کیے ہیں اور کچھ حصے حذف بھی کیے ہیں۔

پیشِ نگاہ نسخہ شیخ الٰہی بخش تاجر کتب کشمیری بازار لاہور کی طرف سے مطبع وکٹوریہ پریس (لاہور) کا شائع شدہ ہے۔ شیخ الٰہی بخش مذکور نے دو سو روپے ادا کرکے حضرت حافظ محمد لکھوی سے اس کے حقوقِ طباعت حاصل کیے۔ اس سے اندازہ

---

[۶] مولا بخش کشتہ مرحوم نے لکھا ہے کہ انواع بارک اللہ پہلی مرتبہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں شائع ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف کی زندگی میں یہ کتاب شائع ہو گئی تھی۔ لیکن کوشش کے باوجود کتاب کے اس نسخے تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔

ہوتا ہے کہ اس کتاب کو بہت فقہی اہمیت حاصل تھی، جس کے حقوق طبع ایک سو دس سال قبل دو سو روپے میں حاصل کیے گئے، جب کہ روپے کی قیمت آج کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ تھی۔

انواع بارک اللہ کے حواشی کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بعد حمد پروردگار و صلوٰۃ و سلام بر سید الابرار و آل او و اصحابش اطہار، می گوید بندۂ گنہگار امیدوار مغفرت و عفو آفرید گار، محمد بن مخدومی و افتخاری عمدۃ الانقیا، زبدۃ الاصفیا، صفوۃ الفقہاء مولوی محمد بارک اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ و عفی عنہ کہ ایں کتابیست معتبر در علم فروع فقہ بروایت ثقات از کتب معتبرات مؤلفہ جناب مولائی و مخدومی و والدی و استاذی موصوف و اکثر ابواب ایں کتاب شعر ایں احقر است بحکم حضور پرنور و بعضے اشعار آنحضرت مرحوم اند کہ در بعضے از انہا بہ اجازت حضور قدرے محو و اثبات رفتہ بود، پس ایں احقر دریں اوان بتوفیق الٰہی ارادہ انطباع ایں کتاب کردہ بحواشی مزین خواہد نمود، پس ہر کہ ازیں کتاب فائدہ گیرد امید کہ ضعیف را بہ دعائے خیر یاد فرماید، والسلام[۱]

حمد و ثنا کے بعد بندۂ گنہگار امیدوار مغفرت محمد بن مولوی محمد بارک اللہ عرض کناں ہے کہ میرے والد مکرم نے جو اتقیا و اصفیا اور ممتاز فقہا میں سے ہیں، جن کی ذات گرامی باعث افتخار ہے اور جو میرے مخدوم اور استاذ محترم ہیں، فروع و مسائل فقہ پر مشتمل ایک مستند کتاب کی تصنیف کی ہے، جس میں تمام مواد فقہی، ثقہ راویوں اور معتبر ترین کتابوں کے حوالے سے درج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے اکثر ابواب کے اشعار میرے ہیں جو میں نے حضرت والد مکرم کے حکم سے لکھے ہیں، بعض اشعار خود انہی کے ہیں۔ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں ان کی اجازت سے حک و اضافہ کیا گیا ہے۔

---

[۱] انواع بارک اللہ، ص ۲ حاشیہ نمبر ۱

اب کہ میں اس کتاب کو توفیق الٰہی سے طبع کرانے لگا ہوں تو اس کو حواشی سے مزین کرنے کا عزم کیا۔ جو شخص اُس کا مطالعہ کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے، وہ مجھ ضعیف کو دعائے خیر میں یاد رکھے۔ والسلام۔

ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ حافظ بارک اللہ لکھوی اپنے عصر کے عالم و فاضل، متقی و پارسا اور نامور فقیہ تھے۔ ان کے فرزندِ گرامی حافظ محمد لکھوی ان کے شاگرد تھے۔ یہ بھی پتا چلا کہ حافظ بارک اللہ کے زمانے میں "لکھوکے" میں دینی مدرسہ قائم تھا، جس میں حافظ صاحب ممدوح طلبا و مریدین کی علمی اور روحانی تربیت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسی مدرسے میں حضرت حافظ محمد لکھوی نے ان کے حضور زانوے تلمذ تہ کیا اور بعض کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی تعلیم تولا زماً انھی سے حاصل کی۔ فقہ کا جو گہرا ذوق ان میں پیدا ہوا، وہ انھی کے فیضِ تلمذ و شرفِ صحبت کا نتیجہ ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انواع بارک اللہ کی تصنیف کے زمانے میں حافظ محمد لکھوی کے فقہی افکار میں تبدیلی آ چکی تھی اور وہ مسلکِ اہل حدیث سے وابستہ ہو گئے تھے۔

انواعِ بارک اللہ کے آخری صفحے کے حاشیے کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اس کی کتابت میاں شاہ محمد سوار (سکنہ کیلیاں والہ ضلع گوجرانوالہ) نے اور تصحیح کتابت (پروف خوانی) بادشاہی مسجد لاہور کے امام مولوی یار محمد نے کی۔ حاشیے کے الفاظ یہ ہیں:

ہزاراں ہزار شکر و حمد مر منعمِ حقیقی را کہ امورِ حسنہ بتوفیقِ او بہ اتمام بہ رسید و کارہائے دشوار بتدبیرِ او آسان می شود، و درود ثنا محدود ہادیِ راہِ قدیم و بانیِ شرائع شرع مستقیم را کہ امتِ او بہ شفاعتِ او بہ اعلیٰ علیین می رسد، و طفیلِ او از مخارف و مہابت دارین می رہد، وعلیٰ آلہٖ واصحابہ واتباعہ اجمعین الیٰ یوم الدین ـــ امابعد مشتاقانِ علومِ دینیہ و مفتیانِ حنفیہ را مژدہ باد کہ دریں زمان

سعادت اقران کتابے عجیب العجائب و تحفۂ غریب الغرائب بزبانِ پنجابی در فقہِ حنفی مسمّی بہ نصاب الفقہ معروف بہ انواع مولوی محمد بارک اللہ مرحوم با صلاح و تصحیح مکررہ و محشی نادرہ تتمہ وافرہ از کتب معتبرہ بعرق ریزی و جاں فشانی حافظ محمد بن بارک اللہ بہ تصحیح مولوی محمد بارہ صاحب لاہوری امام مسجد بادشاہی عفی عنہ بہ کتابت و سعی میاں محمد شاہ سوار سکنہ موضع حضرت کیلیاں والا بہ انصرام رسید و روشن باد کہ دفتر عبادات از کتاب الطہارۃ و کتاب الصیام منقول از فتاویٰ عالم گیری است الا نادراً از دیگر کتب معتبرہ اتفاق افتاد، پس نقل کتاب در انجا مسطور گشت، و در کتاب الحج تا آخر معاملات از در المختار، رد المختار و طحاوی و کنز الدقائق و بعض شروحِ آں منقول گشت الا نادراً کہ از عالم گیری یا شرح وقایہ نوشتہ شدہ، و نام منقول عنہ در انجا مسطور گشتہ۔ التماس: امید از ناظرین آں کہ اگر بر خطائے اطلاع یابند بہ قلم اصلاح پیرایند و از عیب جوئی و نکتہ گیری احتراز نمایند و بہ دعائے خیر ایں عاجز را یاد فرمایند۔ جزاہم اللہ تعالیٰ فی الدارین خیرا، ان الاصلاح الا ما استطعت وما توفیقی الا باللہ وعلیہ توکلت و الیہ انیب۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب، تمام شد۔ مصنف ھٰذا الکتب۔ مولوی محمد سلمہ اللہ ربہ[۵۸]

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر اور تعریف ہے کہ جس کی توفیق سے نیک کام اور مشکل امور آسان ہو جاتے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لاتعداد درود ہو۔۔۔! اس کے بعد گزارش ہے کہ علوم دینیہ کے شائقین اور حنفی مسلک کے مفتیوں کے لیے خوش خبری ہو کہ ان کی خدمت میں نہایت عمدہ اور نادر کتاب پنجابی زبان میں جو فقہِ حنفی سے متعلق ہے نصاب الفقہ معروف بہ انواع مولوی محمد بارک اللہ صلاح و تصحیح اور تحشیہ کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔ حافظ محمد بن بارک اللہ نے نہایت عرق ریزی

---

۵۸ انواع بارک اللہ ص ۱۹۰۴۔ حاشیہ

اور جاں فشانی سے کتبِ معتبرہ کی مدد سے اس کے حواشی تحریر کیے۔ کتابت کی تصحیح بادشاہی مسجد لاہور کے امام مولوی یار محمد نے کی۔ موضع حضرت کیلیاں والا کے میاں شاہ محمد سوار نے اس کی کتابت کی۔ دفترِ عبادات کے مسائل جو کتاب الطہارۃ اور کتاب الصیام پر مشتمل ہیں، فتاویٰ عالم گیری سے منقول ہیں۔ البتہ ان مسائل کا کچھ حصہ دوسری معتبر کتابوں سے بھی لیا گیا ہے، جن کے نام وہاں لکھ دیے گئے ہیں۔ کتاب الحج اور آخر معاملات تک کے مسائل درالمختار، ردالمحتار، طحاوی، کنزالدقائق اور ان کی بعض شروح سے ماخوذ ہیں، لیکن کچھ حصہ فتاویٰ عالم گیری یا شرح وقایہ سے اخذ کیا گیا ہے، جن کے نام وہاں مسطور ہیں۔ ناظرینِ کتاب سے التماس ہے کہ اگر وہ کسی غلطی سے مطلع ہوں تو قلم سے اصلاح کر دیں، عیب جوئی اور نکتہ چینی سے احتراز فرمائیں اور مجھ عاجز کو دعائے خیر میں یاد رکھیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

انواع بارک اللہ کا پیشِ نگاہ نسخہ ۴۴۲ صفحات پر مشتمل اور ۱۸۹۱ء کا مطبوعہ ہے۔

حواشی کا اردو ترجمہ

انواع بارک اللہ کے ان فارسی حواشی کا اردو ترجمہ مولانا محمد عبدالحق موضع لکھن، ہری پور (ہزارہ) نے کیا۔ ترجمہ اچھا ہے۔ زبان اور اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد عبدالحق ممدوح فقہیات پر عبور رکھتے ہیں۔ حواشی کے اردو ترجمے والی "انواع بارک اللہ" شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور نے مطبع اسلامیہ لاہور سے شائع کی۔ صفحات ۴۴۲ ہیں۔ کتاب کے آخر میں ناشر نے لکھا ہے کہ ترجمہ انھوں نے خود کرایا ہے اور اس پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوئی ہے۔ ترجمے کے پیشِ نگاہ نسخے کا سالِ طباعت ۱۳۴۵ھ ہے۔ حواشی کے مترجم نے آخرِ کتاب میں "گزارشِ مترجم" کے عنوان سے مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کیے ہیں:

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بخدمت جمیع ناظرین واضح ہو کہ مصنفؒ نے حاشیہ بزبانِ فارسی اضافہ کر کے اپنی کتاب کو مزین کیا تھا، جس سے سوائے قابل اشخاص کے عوام اردو دان حضرات کو فائدے سے محرومی تھی۔ اس کی ضرورت کو شیخ الٰہی بخش و محمد جلال الدین تاجرانِ کتب لاہور، کشمیری بازار نے محسوس کر کے عاجز احقر کو یہ کام بطریقِ عجالہ سپرد کیا، جسے اپنی کم بضاعتی کے باوجود حتی الامکان با محاورہ ترجمہ وصحیح ادائے مطلب کی سعی کر کے اللہ تعالیٰ کی توفیق رفیق سے ختم کو پہنچایا۔ اس میں اگر کوئی صاحب کسی قسم کی لغزش پائیں تو اصلاح فرما کر دامنِ کرم وعفو سے ظلِ مرحمت ڈالتے ہوئے حقیر مترجم محمد عبدالحق بن مولوی محمد الیاس مرحوم موضع لکھن ہری پور ہزاروی اور اس کے والدین کو دعائے خیر سے یاد فرما کر عند اللہ ماجور وعند الناس مشکور ہوں۔[۹]

## تاریخ ممدوٹ میں تذکرہ

حافظ بارک اللہ لکھوی، ان کے فرزند گرامی حافظ محمد اور ان کے گاؤں لکھوکے کا تذکرہ "تاریخ پرگنہ مکتسر و ممدوٹ" میں بھی ہے اور لکھا ہے: "یہ بہت نیک اور مشہور لوگ ہیں۔ ذی علم ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں، اکثر لوگ انھیں وہابی کہتے ہیں۔ دیہہ ہذا (لکھوکے) میں ان کے خاندان میں عالم ہوتے رہے ہیں اور مولوی صاحب (حافظ محمد بارک اللہ) کے باعث چرچا علم بہت (بہت) اچھا رہتا ہے۔ بلکہ بعض طلبا سوائے فارسی کے علم عربی بھی تحصیل کرتے ہیں اور ان کو سرکار (ممدوٹ) کی طرف سے دو چاہ معافی ملے ہوئے ہیں۔ گاؤں کچا ہے، مگر وہاں کی مسجد پختہ ہے جو حافظ محمد صاحب کے اہتمام میں فیض بخش قوم کمبوہ ارائیں ساکن فیروز پور تھانیدار ضلع نے تعمیر کرائی ہے۔[۱۰]

---

[۹] انواعِ بارک اللہ، حاشیہ اردو، ص ۴۱۹

[۱۰] تاریخ پرگنہ مکتسر و ممدوٹ ص ۸

## وفات

حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی نے ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۱ء) میں انتقال کیا اور اپنے گاؤں لکھو کے (ضلع فیروزپور، مشرقی پنجاب) میں مدفون ہوئے۔ انھوں نے چھیاسی یا ستاسی برس عمر پائی اور اپنی حیاتِ مستعار میں بے شمار علمی اور تدریسی خدمات انجام دیں۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

## اولاد و احفاد

حافظ بارک اللہ کے دو بیٹے تھے۔ ایک مولوی محمد صالح اور دوسرے حافظ محمد۔ مولوی محمد صالح کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ البتہ حضرت حافظ محمد لکھوی ۱۲۲۱ اور ۱۲۲۵ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔ وہ بہت بڑے عالم دین فاضل اور مصنف تھے، خطۂ پنجاب میں انھوں نے بے پناہ دینی و تصنیفی خدمات انجام دیں۔ مفسرِ قرآن، ممتاز محدث اور نامور فقیہ تھے۔ انھوں نے ۳ صفر ۱۳۱۱ھ کو بمقام لکھو کے وفات پائی۔ اگر حالات سازگار رہے اور زندگی نے وفا کی تو ان کے سوانح حیات ان شاءاللہ چودھویں صدی ہجری کے فقہائے برصغیر میں بیان ہوں گے۔[۱]

حضرت حافظ محمد لکھوی کے بیٹے حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی تھے، جو حضرت عبداللہ غزنوی کے مرید اور نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے۔ اپنے عہد کے شیخ اور جلیل القدر عالم تھے۔ حضرت مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے تلمیذ تھے، اپنے والدِ مکرم کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ حج بیت اللہ کے لیے گئے اور ۱۳۱۳ھ میں مدینہ منورہ میں بحالتِ سجدہ وفات پائی۔ جنت البقیع

---

[۱] حضرت حافظ بارک اللہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: راقم کا مضمون "حافظ محمد لکھوی" روزنامہ "امروز" (لاہور) ۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء و ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء — "احوال الآخرت" (مطبوعہ زیرِ اہتمام مولانا معین الدین لکھوی اوکاڑہ) کے آخر میں مولانا ممدوح کا مضمون — پنجابی ادب دی کہانی ص — پنجابی شاعراں دا تذکرہ ص

میں دفن کیے گئے۔

## بہت بڑی فروگزاشت

پنجاب کے اس رفیع المرتبت خاندان کے علمائے کرام نے بے پناہ علمی و تصنیفی اور تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دیں جس کا سلسلہ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل شروع ہوا، اور اب تک جاری ہے۔ اوکاڑہ (جامعہ محمدیہ) میں مولانا معین الدین لکھوی کے زیر اہتمام اور رینالہ خورد میں حافظ شفیق الرحمٰن اور حافظ عزیز الرحمٰن کے زیر نگرانی درس و تدریس کا بنیادی کام ہو رہا ہے۔

اس خاندان کے اہلِ علم کا قلم و قرطاس سے ہمیشہ رشتہ قائم رہا ہے لیکن افسوس ہے ان کے بزرگوں کے حالات و سوانح آج تک منضبط شکل میں حیطۂ تحریر میں نہیں لائے گئے۔ نہ اس خاندان کے کسی صاحبِ قلم نے اس کام کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور نہ ان کے تلامذہ میں سے کسی نے اس خدمت کو لائقِ اعتنا گردانا۔ حالانکہ ان کے تلامذہ کی وسعت پذیر فہرست میں بہت سے حضرات علم و فضل اور تحریر و کتابت میں منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

لکھوی خاندان کے علمائے کرام مروجہ علوم و فنون میں عبور و مہارت کی بنا پر قبلۂ گاہِ شائقینِ علم تھے، اور بلاشبہ بعض اصحابِ تدریس جن میں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی مرحوم کا اسمِ گرامی خصوصیت سے لائقِ ذکر ہے، فنون میں درجۂ امامت پر فائز تھے۔ مولانا محمد علی لکھوی مرحوم نے مدینہ منورہ جا کر مسجد نبوی میں غلغلۂ درس بلند کیا اور دیارِ عرب اور افریقہ کے علما و طلبا پر اپنے فضل و کمال کی دھاک بٹھا دی، مگر حیرت انگیز تعجب کی بات ہے کہ ان کے حالات و سوانح کہیں مرقوم نہیں، ان کی قبروں میں ان کے ساتھ ہی ان کے کوائفِ حیات بھی دفن ہو گئے۔

اس عالی قدر خاندان کے بزرگوں کے اخلاف اور ان سے مستفید و مستفیض ہونے والوں کی یہ بہت بڑی فروگزاشت ہے۔ کاش، کوئی اللہ کا بندہ اس اہم خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے اور لکھوی خاندان کے اکابر کے حالات

منظرِ عام پر لانے کے لیے کوشاں ہو۔

## ۳۸۔ مولانا باقر مدراسی

سرزمینِ مدراس کے علمائے مشاہیر میں مولانا باقر بن مرتضیٰ مدراسی کا اسمِ گرامی لائقِ تذکرہ ہے۔ وہ مسلکاً شافعی تھے اور اپنے عصر کے شیخ، فاضل اور علامہ تھے۔ خاندان نوائط سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۵۸ھ کو ویلور میں پیدا ہوئے جو اعمالِ مدراس میں واقع ہے۔ ذہین و فطین اور سریع الادراک تھے۔ ابتدائی کتابیں اپنے عمِ محترم سید ابو الحسن ویلوری سے پڑھیں۔ پھر ترچناپلی کے لیے رختِ سفر باندھا۔ وہاں ایک عالمِ دین شیخ ولی اللہ کا حلقۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور ان سے کسبِ فیض کیا ——— اس کے بعد اخذِ علم کا باقاعدہ سلسلہ ترک کر دیا اور مطالعۂ کتب میں مشغول ہو گئے۔

مولانا باقر مدراسی تیرھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی عالم اور فقیہ تھے۔ تفسیر، حدیث، علم کلام، فقہ، اصولِ فقہ اور دیگر علوم میں ماہرانہ اور مجتہدانہ نظر رکھتے تھے۔ بیس سال سے بھی کم عمر میں فتویٰ نویسی اور تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ عالمِ جوانی ہی میں وہ ان تمام صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے، جو ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے عالمِ دین میں پائی جاتی ہیں۔ کثیر المطالعہ عالم تھے۔ سریع الحفظ اور انتہائی زیرک تھے۔ قوتِ ادراک اور فہم و فراست میں اُس دور کا کوئی شخص ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بیس سال سے بھی کم عمر میں وہ اہلِ علم کی بڑی بڑی مجالس میں جانے اور اصحابِ فکر کی محافل میں شریک ہونے لگے تھے۔ بے جھجک ہو کر بات کرنا اور مناظروں اور مباحثوں میں حصہ لینا ان کا شیوہ تھا۔ دلائل کے اعتبار سے ان کی گرفت اتنی مضبوط ہوتی اور اس طرح اعتماد کے ساتھ بات کرتے کہ بڑے بڑے عالم ان کا مقابلہ نہ کر پاتے۔ ان کے طریقِ استدلال، نہجِ کلام اور کثرتِ مطالعہ سے لوگ متحیر اور متعجب ہوتے۔

بیس سال کے ہوئے تو ان کی شہرتِ قابلیت حکمرانوں کے ایوانوں میں جا پہنچی، اور مدراس کے امیر نواب محمد علی خاں نے ان کو اپنے دربار میں تحریر و انشا پر مامور کیا۔ دو سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا عرصے تک یہ ذمے داری ان کے سپرد رہی۔ پھر نواب مذکور نے ان کو اپنے بچوں کا معلم اور اتالیق بنا دیا۔ اب ان کے جوہر نکھرے اور نواب پر ان کی گوناگوں صلاحیتوں کا راز کھلا۔ چند ہی روز بعد انھیں جاگیریں عطا کیں جن کی چار ہزار دو سو روپے سالانہ آمدنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اپنے خاص ندیموں اور مشیروں میں شریک کر لیا۔

مولانا باقر مدراسی برصغیر کے پہلے عالم ہیں جنھوں نے نواحیِ مدراس میں علومِ دینیہ کو عربی سے اردو میں منتقل کیا۔ ان سے قبل اس نواح میں کسی نے یہ اہم کام نہیں کیا تھا۔ ان کو علمِ کلام، عقائد، لغت اور صرف و نحو میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ علمِ فقہ اور اصول مستحضر تھا۔ معرفتِ تفسیر و حدیث میں یگانہ تھے۔ باقی علومِ مروجہ سے کامل آگاہی حاصل تھی۔ منقول و معقول میں اس طرح تطابق پیدا کرتے کہ لوگ ان کی فضیلتِ علم کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں کتابیں لکھیں اور ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔

ان کی عربی تصانیف یہ ہیں:

۱: تنویر البصر والبصیر فی الصلوٰۃ علی النبی البشیر والنذیر۔

۲: نفائس النکات فی رسالہ علیہ السلام الی جمیع المکونات۔

۳: القول المبین فی ذراری المشرکین۔

۴: الدر النفیس فی شرح قول محمد بن ادریس۔

۵: النفحۃ العنبریۃ فی مدح خیر البریہ۔

۶: العشرۃ الکاملہ: یہ عربی کے دس قصیدے ہیں جو سبعہ معلقہ کے انداز پر ہیں۔

۷: مقامات: یہ کتاب مقاماتِ حریری کے اسلوب کی ہے۔

۸ : الشمامة الکافوریه فی وصف المعاھد الویلوریه -

۹ : الخطفة العقابیه للفارة المسکینه -

۱۰ : المقامة الترشنافلیه ـــــــ المقامة الارکانیه -

۱۱ : المقامة الحیدرآبادیه -

۱۲ : شمائم الشمائل فی نظام الرسائل -

۱۳- ان عربی کتابوں کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک دیوان شعری ہے -

۱۴ : غزل اور مختلف اصنافِ شعر میں ایک اور دیوان بھی ہے -

فارسی زبان میں ان کی کتابیں یہ ہیں :

۱۵ : چہار صد ایراد بر کلام آزاد - یہ سید غلام علی آزاد بلگرامی کے کلام پر چار سو اعتراضات ہیں -

۱۶ : السعادة السرمدیه فی وجوب المحبة المحمدیه -

۱۷ : کشف الغطاء عن اشراط یوم الجزاء -

۱۸ : شرح دیباچہ مثنوی معنوی -

۱۹ : شرحِ غزلِ اوّل دیوان حافظ -

۲۰ : مثنوی معنوی کے دو ابیات کی شرح جو دو رسالوں پر مشتمل ہے -

۲۱ : بیان دل نہاد -

۲۲ : اتحاف السالک فی شرح کلما خطر ببالک -

۲۳ : ایقاظ الغافلین -

۲۴ : ارشاد الجاھلین -

۲۵ : نغمۂ بیدل نواز -

۲۶ : سحر الحلال فی ذکر الھلال -

۲۷ : جلاء البصائر فی نقض دلائل المناظر -

۲۸: الاعلان بالاذان عند تغول الغيلان،
۲۹: الاستعاذة بالله الواحد القهار عند سماع نهق الحمار۔
۳۰: تبيين الانصاف وتوهين الاعتساف فيما ثبت من اخبار الشيعة من الاختلاف۔
۳۱: رد الكذب على الكاذب المنكر۔
۳۲: كمال العدل والانصاف الدال على العدول عن الاعتساف
۳۳: النقول البديعه فى اقسام الشيعه۔
۳۴: دلائل الاثنى عشريه فى رد بعض هفوات الاماميه۔
۳۵: الحجة المنيعه فى الزام الشيعه۔
۳۶: الرباعيات البديعه فى مناقب الشيعه۔
۳۷: شرح حديث انتم اعلم۔
۳۸: عين الانصاف۔
۳۹: كمال الانصاف۔
۴۰: معذرت نامہ، شیعہ کے بارے میں بعض رسائل۔
۴۱: فارسی دیوان، جو بہت سے اشعار پر مشتمل ہے۔
اردو کتابیں یہ ہیں:
۴۲: ہشت بہشت،
۴۳: ریاض الجنان۔
۴۴: تحفۃ الاحباب فی مناقب الاصحاب۔
۴۵: فرائد۔
۴۶: محبوب القلوب۔
۴۷: تحفۃ النساء۔
۴۸: روضۃ السلام۔

۴۹ : گلزارِ عشق۔

۵۰ : افسانۂ رضوان شاہ۔

۵۱ : افسانۂ روح افزا۔

۵۲ : صبح نو بہارِ عشق۔

۵۳ : ندرتِ عشق۔

۵۴ : عرفاتِ عشق۔

۵۵ : حیرتِ عشق۔

۵۶ : حسرتِ عشق۔

۵۷ : رُوپ سنگار۔

۵۸ : اردو دیوان شعری۔

بہرحال مولانا باقر مدراسی نے عربی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کیں اور نظم و نثر میں خوب کام کیا۔

خطۂ مدراس کے اس عالم اجل اور فقیہ نامدار نے ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ کو انتقال کیا۔ کل باسٹھ سال عمر پائی۔[۱۲]

## ۳۹۔ مولانا بُرہان الدین دیوی

مولانا برہان الدین بن سرفراز علی اعظمی دیوی تیرھویں صدی ہجری میں برصغیر کے معروف محدّث و فقیہ تھے۔ مفتی عبدالسلام دیوی کی نسل سے تھے۔ یوپی کے موضع دیوہ میں جن علما و صلحانے اسلام کی نشر و اشاعت میں بھرپور حصہ لیا ان میں مولانا برہان الدین کو تذکرہ نویسوں نے بہت اہمیت دی ہے۔ دیوہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے چچا مولانا ذوالفقار علی دیوی

---

[۱۲] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۹۱ تا ۹۶ بحوالہ حدیقۃ المرام۔

سے حصولِ علم کیا جو فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ بعد ازاں ان کی معیت میں رائے بریلی گئے اور طویل عرصے تک سید محمد عدل نقشبندی کے زاویے میں مقیم رہے۔ ان سے خوب استفادہ کیا اور تذکیر و موعظت میں مشغول ہوئے۔ تمام عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کر دی۔ ہزاروں لوگوں کو بدعات و محدثات سے روکا اور تقویٰ و تدین کی راہ پر لگایا۔

مولانا برہان الدین دہلوی نے جو کتابیں تصنیف کیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ مسائلِ فقہی پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وہ اپنے دور کے ممتاز و کبار علما میں سے تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ محاکمہ: اس رسالے کی تصنیف کا پس منظر یہ ہے کہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو سہ شنبہ کے روز علمائے دہلی کے درمیان بعض مختلف فیہ مسائل سے متعلق مباحثہ ہوا۔ ایک فریق کے سرگروہ حامیِ سنت مولانا رشید الدین خاں دہلوی تھے اور دوسرے کے قائد ماحیِ بدعت مولانا عبدالحی بڑھانوی۔ جب مباحثہ ختم ہوا تو دونوں کی تحریر و تقریر مولانا برہان الدین دہلوی کے سامنے آئی۔ انھوں نے اس پر بطور محاکمہ ایک رسالہ لکھا، جو "محاکمہ" کے نام سے مشہور ہوا۔

۲۔ تحقیق الاوزان: یہ کتاب زکوٰۃ اور صدقہ کے اوزان کے بارے میں ہے۔ ۱۲۴۷ھ میں تصنیف کی۔

۳۔ احکام عید الفطر: اس میں عید الفطر کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب احمد آباد نارہ کے بعض علما و صلحا کی درخواست پر ۱۲۵۰ھ میں تحریر فرمائی۔

۴۔ احکام عید الاضحیٰ: عید الاضحیٰ کے احکام و مسائل پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی صلحائے احمد آباد کی درخواست پر ۱۲۵۰ھ میں لکھی گئی۔

۵۔ احکام النکاح: یہ رسالہ نکاح کے مسائل و احکام کو محیط ہے۔

۶۔ تحقیق الاشارۃ بالسبابۃ فی الصلوٰۃ: تشہد میں رفع سبابہ کے بارے میں

۷۔ تحقیق النذور والذبائح : نذر و نیاز اور ذبیحہ کے متعلق۔
۸۔ تحقیق ربا : سودی لین دین کے بارے میں۔
۹۔ مواریث : احکام وراثت وغیرہ کے ذکر میں۔
۱۰۔ کفارۂ میّت : میّت کے کفارہ سے متعلق ہے۔
۱۱۔ شرح وقایہ کے مبحث طہر متخلل پر حاشیہ۔
۱۲۔ حاشیہ شرح تہذیب : یہ حاشیہ رائے بریلی کے سیّد محمد عدل کے بعض اقربا کے لیے تحریر کیا۔

مولانا برہان الدین دیوی اپنے دور کے نامور اور پارسا علما میں سے تھے۔[۱۳]

## ۴۰۔ قاضی بشیر الدین قنوجی

علمائے قنوج میں سے جو حضرات برِ صغیر کے آسمان علم و عرفان پر نمایاں ہو کر ابھرے، ان میں قاضی بشیر الدین عثمانی کا اسمِ گرامی خاص طور سے لائقِ تذکرہ ہے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ والد کا نام نامی کریم الدین عثمانی تھا، جو اپنے عصر کے عالم مانے جاتے تھے۔

قاضی بشیر الدین قنوجی ۱۲۳۴ھ میں قنوج میں پیدا ہوئے اور رائے بریلی میں نشو و نما پائی۔ قرآن حکیم بریلی کی جامع مسجد کے امام حافظ احمد علی سے پڑھا۔ صرف و نحو اور منطق کی چند ابتدائی کتابوں کے لیے مولانا تفضل حسین بریلوی کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا۔ عروض، بیان و بدیع، حساب و فرائض اور فقہ کے بعض رسائل کی تکمیل اپنے والد سے کی۔ کچھ کتابیں جن میں میر زاہد، بحر العلوم کی شرح سلّم، شرح حمد اللہ، نیز تشریح الافلاک اور تحریر اقلیدس وغیرہ شامل ہیں، مولانا محمد حسن بریلوی کے حلقۂ درس میں مکمل کیں۔ شرح تہذیب اور شرح چغمینی کی تکمیل مولانا

---

۱۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۹۷، ۹۸۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۰۳۱-۳۲۔

محمد علی سے کی۔ مختصر المعانی، توضیح، تلویح، ہدایہ، تفسیر بیضاوی کی تحصیل کے لیے شیخ اللہ داد رام پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مطوّل، مقاماتِ حریری، سبعہ معلقہ، متنبی، حماسہ، مولانا اوحد الدین بلگرامی سے پڑھیں۔ باقی کتبِ درسیہ کی تکمیل مولانا قدرت اللہ لکھنوی سے کی۔ حدیث مولانا رحیم الدین بخاری کے درس میں پڑھی جو شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولانا تہوّر علی حسینی نگینوی سے بھی حصولِ علم کیا، جنھیں شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی اور مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

قاضی بشیر الدین قنوجی نے اپنے زمانے کے نامور اساتذہ سے تحصیلِ علم کی، اور بائیس سال کی عمر میں مروّجہ علوم سے فارغ ہو گئے۔ پھر درس و تدریس میں مشغول ہوئے اور اس میدان میں کامیاب رہے۔ عرصے تک ٹونک میں مسندِ درس بچھائے رکھی۔ مراد آباد، دہلی، علی گڑھ اور کان پور میں بھی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ جن حضرات نے ان سے علم حاصل کیا، ان کا شمار برِصغیر کے جلیل القدر علما میں ہوتا ہے۔ مولانا شمس الحق ڈیانوی، سیّد امیر علی ملیح آبادی، سیّد امیر حسن سہسوانی، مولانا وحید الزمان لکھنوی، مولانا علیم الدین شاہ جہان پوری، اور سیّد امداد علی اکبر الہ آبادی ایسے اکابر رجال ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

قاضی صاحب ممدوح کی یہ خوش بختی ہے کہ ان کے تلامذہ کی وسیع فہرست میں وہ علمائے عظام شامل ہیں جو آگے چل کر حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شارح، مفسّرِ قرآن، محدّث، فقیہ، مصنف و مترجم اور مدرس و معلّم ہوئے اور اس کے نتیجے میں اللہ نے چار دانگ عالم میں ان کو شہرت و ناموری عطا فرمائی۔ آج ان کے زرّیں کارناموں پر برِصغیر پاک و ہند کے اہلِ علم کو بجا طور پہ فخر ہے۔

نواب صدیق حسن خاں کے عہد میں قاضی صاحب کو ۱۲۹۵ھ میں بھوپال

تشریف لانے کی دعوت دی گئی۔ قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر علوم پر چونکہ عبور حاصل تھا، لہٰذا بھوپال میں قاضی کا عہدہ پیش کیا گیا اور حسن وخوبی سے اس منصب جلیلہ کے تقاضوں کو پورا کیا۔

قاضی بشیر الدین قنوجی متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ کشف المبہم مافی المسلّم: یہ کتاب مسلّم الثبوت کی شرح ہے۔

۲۔ حل ابیات مطوّل: اس میں بیان وبدیع کی مشہور درسی کتاب مطوّل کے اشعار کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔

۳۔ حاشیہ میر زاہد شرح المواقف۔

۴۔ موطا امام مالک کے بعض اہم حصّوں کی شرح۔

۵۔ تخریج احادیث شرح العقائد۔

۶۔ صرف ونحو کی بعض درسی کتابوں کے مشکل مقامات کا حل۔

۷۔ تفہیم المسائل — ۸۔ صواعق الٰہیہ۔

۹۔ غایۃ الکلام فی ابطال عمل المولد والقیام۔

۱۰۔ احسن المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال۔

۱۱۔ بصارۃ العینین فی منع تقبیل الابہامین۔

ان کتابوں کے علاوہ مختلف مسائل سے متعلق بعض اور کتابیں اور رسالے بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

برصغیر کے اس عالم کبیر نے ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ میں باسٹھ[۶۲] سال عمر پاکر بھوپال میں رحلت کی[۱۴۷]

قاضی بشیر الدین قنوجی کا یہ وہ تذکرہ ہے جو سید عبدالحی حسنی لکھنوی نے اپنی عربی تصنیف نزہۃ الخواطر میں کیا ہے اور حوالہ حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی

---

[۱۴۷] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۰۰، ۱۰۱، بحوالہ تذکرۃ النبلاء۔

کی کتاب "تذکرۃ النبلا" کا دیا ہے۔ مولانا ڈیانوی برِصغیر پاک و ہند کے ممتاز عالمِ دین کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ قاضی صاحب ممدوح کے شاگرد اور ابو داؤد کی شرح عون المعبود کے مصنفِ شہیر ہیں۔ تذکرۃ النبلا ان کی قلمی کتاب ہے، جس کا ایک نسخہ نزہۃ الخواطر کے فاضل مصنف کے پاس موجود تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ اب وہ نسخہ ان کے فرزندِ گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے کتب خانے (رائے بریلی) میں محفوظ ہے۔ رجال کے سلسلے کی یہ بہترین کتاب ہے۔ نزہۃ الخواطر کی بعض جلدوں کے متعدد مقامات میں اس کے حوالے دیے گئے ہیں۔

"تراجم علمائے حدیث ہند" میں مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے بھی قاضی بشیر الدین قنوجی کا ترجمہ تحریر کیا ہے، جس کے بعض حصے نزہۃ الخواطر سے بہت مختلف ہیں۔ انھوں نے کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ لکھتے ہیں:

قاضی بشیر الدین محدّث قنوجی کے والد کا نام مولوی نور الدین ہے[15] سنِ ولادت ۱۲۳۴ھ مگر سنِ ارتحال ۱۲۷۳ھ ہے[16] دو سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے[17] والدہ ہی نے پرورش کی۔ ان ہی نے بغدادی قاعدہ

---

[15] صاحبِ نزہۃ الخواطر نے جیسا کہ پہلے گزر چکا، قاضی بشیر الدین کے والد کا نام کریم الدین لکھا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے فرزند گرامی نواب علی حسن خاں نے بھی کریم الدین تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو مآثر صدیقی جلد ۲ ص ۱۰۔

[16] ان کا سنِ ارتحال ۱۲۷۳ھ نہیں ہے یا تو یہ کتابت کی غلطی ہے یا مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی سے سہو ہو گیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کی وفات ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ میں ہوئی، جیسا کہ ان کے عالی مرتبت تلمیذ مولانا شمس الحق ڈیانوی نے تذکرۃ النبلا میں رقم فرمایا ہے۔

[17] اس کے برعکس صاحبِ نزہۃ الخواطر، تذکرۃ النبلا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قاضی بشیر الدین قنوجی نے عروض و بیان و بدیع، حساب و فرائض اور فقہ کی بعض کتابیں اپنے والدِ محترم سے پڑھیں۔ ہمارے نزدیک صاحب نزہۃ الخواطر کا بیان ہی صحیح ہے۔

شروع کرایا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو مرحوم نے اپنے والد کے ایک شاگرد مولوی عبدالحق کے سپرد کر دیا، جنھوں نے مروّجاتِ فارسی پڑھائیں اور میزان الصرف (خود قلم بند کر کے) پڑھائی۔ گھر میں ناداری کا تغلب تھا۔ پڑھنے کا شوق تھا، والدہ سے اجازت لے کر دہلی کا قصد فرمایا۔ نو عمری، پیادہ پا مسافت، علی گڑھ پہنچے تھے کہ پیروں میں ورم آگیا اور ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ علی گڑھ میں ایک درویش محمد شاہ رہتے تھے۔ انھوں نے دیکھ کر نام دریافت کیا، والد کا نام پوچھا اور سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا، تمھارے والد مولوی نورالدین[۱۸] تو میرے پیر بھائی تھے، میرے ساتھ مکان پر چلو۔ اس کے دو ایک روز بعد شاہ عبدالجلیل شہید (۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) کے سپرد کر دیا۔ اس وقت شاہ صاحب کا درس جامع مسجد میں ہوتا تھا اور مسجد کی امامت بھی ان ہی کو تفویض تھی۔ یہاں شرح جامی اور قطبی پڑھ کر شاہ صاحب کی اجازت سے دہلی کا عزم کیا۔ دہلی پہنچ کر حکیم نیاز احمد سہسوانی مرحوم سے (جو مولانا محمد بشیر سہسوانی کے حقیقی چچا تھے) اتفاق سے کالی مسجد میں ملاقات ہوگئی۔ حکیم صاحب کا ذاتی دواخانہ دہلی میں تھا۔ انھوں نے آپ کو دس روپے ماہوار پہ ملازم رکھ لیا اور اپنے صاحب زادے کے ساتھ کتبِ معقول اور ادب و معانی میں ہم سبق کر دیا۔ قاضی صاحب اس تنخواہ میں سے صرف دو روپے ماہانہ پر اپنی بسرِ اوقات فرماتے اور بقیہ آٹھ روپے اپنی والدہ ماجدہ کو قنوج بھیج دیتے۔ جب علم و ادب وغیرہ کی تمام کتابیں ختم ہوگئیں اور حکیم صاحب نے آئندہ کا ارادہ دریافت کیا تو آپ نے علمِ حدیث کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ اس پر حکیم صاحب ہی نے مشکوٰۃ، ابن ماجہ، ترمذی، نسائی اور موطا امام مالک خود پڑھا کر حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں سفارشی خط لکھ کر بھیجا۔ جس وقت قاضی صاحب خط لے کر حاضر ہوئے، شاہ صاحب صحیح مسلم

---

[۱۸] جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا، والد کا نام نورالدین نہیں، کریم الدین ہے۔

پڑھا رہے تھے سبق ختم ہونے کے بعد رقعہ پیش کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا، صحیح مسلم تو ہو ہی رہی ہے، اس میں شامل ہو جاؤ۔ اس کے بعد صحیح بخاری میں سید نذیر حسین کے ہم سبق ہو کر سند و اجازہ سے ممتاز ہوئے۔

تکمیل کے بعد حکیم صاحب کے پوتے حکیم بدر الحسن کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ اس دوران میں اپنی والدہ کو بھی قنوج سے دہلی بلا لیا، جن کا دہلی ہی میں انتقال ہوا۔

"کچھ مدت بعد آگرہ تشریف لے گئے۔ پھر مولوی ڈپٹی امداد علی کے کہنے سے پچاس روپے ماہوار پر ان کے مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے مراد آباد چلے گئے۔ مراد آباد میں اس زمانے میں منشی اندرمن کا بہت شہرہ تھا جو آریہ اپدیشک (مبلغ) تھے اور تحریر و تقریر میں اسلامی احکام اور مسلمانوں کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ قاضی بشیر الدین قنوجی نے ان سے مناظروں اور مباحثوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لیکن آریہ مبلغ تابِ مقابلہ نہ لا سکا۔ کچھ مدت بعد قاضی صاحب ممدوح مراد آباد سے پھر آگرہ چلے گئے۔"

اس سے آگے مولانا امام خاں نوشہری لکھتے ہیں:

"(غالباً) بزمانۂ نواب والاجاہ صدیق حسن خاں بھوپال میں ورود ہوا، اور قاضی مقرر ہوئے۔" [۱۹]

مولانا امام خاں نوشہروی کا یہ کہنا قرینِ صحت نہیں کہ مولانا بشیر الدین کا "سنِ انتقال ۱۲۷۳ھ ہے۔"

---

[۱۹] تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۳۲۹ تا ۳۳۱ — یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مصنف "تراجم علمائے حدیث ہند" نے قاضی بشیر الدین قنوجی کے حالات میں کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا اور یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ حالات کہاں سے لیے ہیں۔

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کا سنِ ارتحال ۱۲۷۳ھ ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ غالباً نواب صدیق حسن خاں کے عہد میں "قاضی قنوج مقرر ہوئے" ۱۲۷۳ھ میں تو خود نواب صاحب حصولِ ملازمت کے لیے سرگرداں تھے۔ ان کو وہ کیونکر قاضی بنا سکتے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ۱۲۹۵ھ میں ان کو نواب صدیق حسن خاں نے بھوپال آنے اور منصبِ قضا پر فائز ہونے کی دعوت دی"۔ اس کے ایک سال بعد ۱۲۹۶ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بہرحال قاضی بشیر الدین قنوجی اپنے دور کے بلند پایہ عالم، متکلم اور اصولی تھے۔ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں نواب وحید الزماں نے ان سے تفسیر و حدیث کا درس لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) تک بہ قید حیات تھے۔

قاضی صاحب ممدوح سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی اور بدعت کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ یہ جو رواج ہو گیا ہے کہ حفاظ جب تراویح میں قرآن مجید ختم کرتے ہیں تو قل ھو اللہ احد تین مرتبہ پڑھتے ہیں، قرآن و حدیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے، اس لیے قاضی صاحب ممدوح ایسے موقع پر حفاظ سے نہایت بے باکانہ طور پر فرما دیتے تھے کہ یہ بدعت ہے۔ اس ضمن میں نواب وحید الزماں، وحید اللغات (مادہ ثلث) میں لکھتے ہیں: مولانا بشیر الدین قنوجی جو میرے شیخ تھے، حافظ سے یہ کہہ دیتے تھے کہ ختم (قرآن) کے وقت قل ھو اللہ احد کو بھی ایک ہی بار پڑھو، تین بار پڑھنے کو بدعت کہتے تھے[20]۔

## بعض دیگر فقہائے کرام

ردیف ب کے ضمن میں تیرھویں صدی ہجری کے بعض اور فقہائے کرام کے

---

[20] حیاتِ وحید الزماں حاشیہ ص ۱۹، ۲۰۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بھی قاضی بشیر الدین قنوجی کے بارے میں "حیات وحید الزماں" کے حوالے سے یہی الفاظ درج کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۶۔

اسمائے گرامی بھی ملتے ہیں، لیکن ان کے زیادہ حالات مذکور نہیں ہیں، اور وہ یہ ہیں:

۱- سیّد باقر لکھنوی: شیعہ فقیہ تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ والیِ اودھ امجد علی شاہ نے ان کو محکمۂ عدلیہ کے سربراہ مقرر کیا اور "منصف الدولہ" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اودھ کے مسلمان حکمرانوں کے آخری عہد تک اس خدمت پر مامور رہے۔ تصنیفات یہ ہیں: تشدید مبانی الایمان۔ یہ کتاب مولانا حیدر علی فیض آبادی کی تصنیف ازالۃ الغین عن بصارۃ العین کے جواب میں لکھی۔ ایک رسالہ رضاع کبیر کی بحث میں اور ایک نکاحِ بنتِ زانیہ کے بارے میں تحریر کیا۔ ۸ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۶ھ کو وفات پائی۔

۲- مرزا باقر طباطبائی: شیعہ مجتہد تھے۔ فقہ اور فنونِ ادبیہ میں مہارت رکھتے تھے۔

۳- مولانا ببر علی اخباری: علمائے شیعہ میں سے تھے۔ محدث اور فقیہ تھے۔ دیارِ ہند سے عراق گئے اور وہیں جمادی الاخریٰ ۱۲۴۸ھ کو فوت ہوئے۔ کربلا میں دفن کیے گئے۔

۴- مولانا بدر علی رام پوری: فقہ اور اصول کے ممتاز علمائے حنفیہ میں سے تھے۔

۵- مولانا برہان الحق انصاری لکھنوی: ولادت و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے والدِ گرامی مولانا نور الحق اور دیگر علما سے تحصیل کی۔ ارضِ حجاز میں تین سال رہے۔ مکہ مکرمہ میں مفتیِ احناف شیخ جمال الدین اور شیخ محمد عابد سندھی سے علمِ حدیث پڑھا۔ فقہ میں عبور حاصل تھا۔ ۱۲۸۶ھ میں وفات پائی۔

۶- مولانا بزرگ علی مارہروی: معروف حنفی المسلک فقیہ اور عالم تھے۔ ولادت اور نشو و نما مارہرہ میں ہوئی۔ مبادیات کی تکمیل اپنے شہر کے علما و مدرسین سے کی۔ پھر مزید تحصیل کے لیے لکھنؤ اور کلکتہ گئے۔ انتہائی کتبِ درسیہ مولانا حیدر علی ٹونکی سے پڑھیں۔ دیگر علما سے بھی استفادہ کیا۔ سندِ حدیث حضرت شاہ عبد العزیز

محدث دہلوی سے لی۔ پھر اکبر آباد (آگرہ) میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں علی گڑھ کے قاضی مقرر ہوئے، لیکن اس اہم منصب پر فائز رہ کر بھی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد وزیر الدولہ کے عہد میں ٹونک گئے اور ٹونک کے قاضی القضاۃ کا عہدۂ جلیلہ سنبھالا۔ عیسائیوں سے مناظرے میں بہت مہارت تھی۔ العجالۃ النافعہ اور اثبات الحق ان کی تصنیفات میں سے ہیں۔ ۱۱ شوال ۱۲۶۲ھ کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

۷۔ مولانا بشارت اللہ بہرائچی: ۱۲۰۱ھ کو بہرائچ میں ولادت ہوئی۔ شیخ نعیم اللہ بہرائچی، مولانا فضل امام خیرآبادی اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی سے تحصیل کی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں بھی حاضری دی اور ان سے مستفید ہوئے۔ اخذِ طریقت شاہ غلام علی سے کیا۔ بمبئی کے علاقے میں اپنے دور کے شیخ اور فقیہ کی حیثیت سے شہرت پائی۔ بہت نیک اور متقی بزرگ تھے۔ غرۂ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۴ھ کو بہرائچ میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے۔

۸۔ قاضی بشیر الدین کاکوروی: مولد و منشا کاکوری، والد کا اسم گرامی قاضی قطب الدین تھا۔ اپنے والد اور دیگر علما سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مولانا حسین احمد ملیح آبادی اور مولانا تقی الدین کاکوروی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ علم فقہ میں بالخصوص درک رکھتے تھے۔ حصولِ علم کے بعد فتح پور سیکری کے عہدۂ قضا پر مامور ہوئے۔ بہت پارسا اور متدین عالم دین تھے۔ درس و افادۂ طلبا کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۲۶ شوال ۱۲۹۶ھ کو کاکوری میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

۹۔ سید بندہ حسین لکھنوی: ولادت و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ اپنے والد سید محمد لکھنوی اور بھائی سید مرتضیٰ لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ شیعہ مجتہد اور فاضل فقیہ تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق منصب اجتہاد پر فائز ہوئے۔ تصنیفات یہ ہیں: الوسالۃ الخلیلیہ، تحفۃ السالکین، مقطوع الید، الصراط السوی، نہج السداد، المواعظ الحسینیۃ۔ ۱۲۹۴ھ میں لکھنؤ میں رحلت کی۔

# ت

## ۱۴۱۔ مولانا تراب علی لکھنوی

مولانا تراب علی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: تراب علی بن شجاعت علی بن مفتی فقیہ الدین بن مفتی محمد دولت بن مفتی ابو البرکات۔ یہ تمام حضرات اصحاب علم و فضل تھے۔ ان کے جدِ امجد مفتی ابو البرکات فقہ کی ایک کتاب جامع البرکات کے مصنفِ شہیر تھے۔ آگے چل کر ان کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامور صحابی حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

مولانا تراب علی ۱۲۱۳ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور سید مخدوم حسینی لکھنوی، مفتی ظہور اللہ انصاری لکھنوی، شیخ مظہر علی ناجر اور مفتی اسماعیل مراد آبادی وغیرہ سے اخذِ علم کیا۔ یہاں تک کہ فقہ و اصول اور منقول و معقول کے جید علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بہت سے لوگوں کو مستفید فرمایا۔ ۱۲۵۹ھ میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور حجاز میں مفتی عبداللہ سراج المکی سے علمِ حدیث پڑھا۔ واپس آئے تو پھر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بے شمار حضراتِ علما نے ان سے استفادہ کیا، جن میں مولانا معین الدین کڑوی، قاضی انور علی مراد آبادی اور سید غنی نقی زید پوری شامل ہیں۔

مولانا تراب علی لکھنوی نے قلم و قرطاس سے بھی ہمیشہ رشتہ قائم رکھا، ان کی تصانیف کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ درسی کتابوں پر بھی شروح و حواشی لکھے اور مسائلِ فقہ سے متعلق بھی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی تصنیفات میں سے چالیس کتابوں کا علم ہو سکا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ شمس الضحیٰ لازالۃ الدجیٰ۔

۲: التکملۃ العلی للواءالھدیٰ۔
۳: الفراضۃ الغالیہ۔
۴: مصفاۃ الاذھان فی تحقیق السبحان۔
۵: العشرۃ الکاملہ۔
۶: التحقیقات البدیعۃ الشوکیہ فی توھین الھفوات السعدیہ۔
۷: التحقیقات الزکیہ فی التوھمات السعدیہ۔
۸: حاشیہ شرح ملا جامی۔ یہ حاشیہ نامکمل ہے۔
۹: ازالۃ العضل عن اشعار المطوّل۔
۱۰: الترشیح الاجلّی فی مسائل المرور امام المصلی۔
۱۱: القول الصواب فی مسائل الخضاب۔
۱۲: العجالۃ الدقیقۃ فی مسائل العقیقہ۔
۱۳: سبیل النجاح الیٰ تحصیل الفلاح۔
۱۴: التعلیق المرضی علیٰ شرح القاضی۔
۱۵: التعلیق الاحسن علیٰ شرح مُلّا حسن۔
۱۶: حاشیہ شرح سلّم از حمداللہ۔
۱۷: شوکۃ الحواشی لازالۃ الغواشی۔
۱۸: حاشیہ صدرا۔
۱۹: لجۃ الروایات فی اجوبۃ الواقعات۔ نامکمل۔
۲۰: الھلالین علی الجلالین۔ تفسیر جلالین کی یہ نا تمام شرح ہے۔
۲۱: شرح فارسی قصیدہ بُردہ۔
۲۲: شرح فارسی قصیدہ تنزانی۔
۲۳: تحصیل الخبرہ بآداب العمرہ۔
۲۴: شرح فارسی تحصیل الخبرہ۔

۲۵: مسالک السداد فی مسائل الافراد۔

۲۶: ھدایۃ الانام فی آداب الاحرام۔

۲۷: تحصیل التخضع بآداب التمتع۔ ناتمام

۲۸: الفوز المبین بآداب البلد الامین۔ ناتمام

۲۹: فوائد القرب فی آداب الاکل والشرب۔

۳۰: درک المآرب فی آداب اللحی والشوارب۔

۳۱: شرح شمس بازغہ۔ ناتمام۔

۳۲: التحقیقات الکمالیہ فی ابطال ارتدادات الکلالیہ۔

۳۳: العجالۃ السبکیہ۔

۳۴: سواء الطریق لابطال اقوال الزندیق۔

۳۵: ھدایۃ النجدین الی مسائل العیدین۔

۳۶: قرۃ العینین فی ابطال مسح الرجلین۔

۳۷: رسالہ در فضائل حضرت ابوبکر صدیق۔

۳۸: رسالہ در فضائل حضرت عثمان۔

۳۹: رسالہ معراجیہ۔

۴۰: منھیۃ مصفاۃ الاذھان۔

مولانا تراب علی لکھنوی نے بھرپور علمی زندگی بسر کی اور لاتعداد لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ۱۲ صفر ۱۲۸۱ھ کو ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک مقام محمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔[۱]

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۵، ۳۶ ــــ حدائق الحنفیہ، ص ۴۸۱ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

# ث

## ۴۲: قاضی ثناء اللہ پانی پتی

برصغیر پاک و ہند کے ان کبار علما میں جن کو علوم مروجہ کے تمام پہلوؤں پر عبور و تبحر حاصل تھا، تیرھویں صدی ہجری کے حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی کا اسم گرامی زرّیں حروف سے لکھنے کے لائق ہے۔ وہ شیخ زمان، امام وقت، مجتہد عصر، مفسّر قرآن، علامۂ کبیر، محدّث عمدہ خصال، فقیہ باکمال، محقق عالی مرتبت اور صاحب تصوّف و طریقت تھے۔ برصغیر کی مردم آفرین سرزمین نے جن راسخین فی العلم اور عالی فکر لوگوں کو جنم دیا، ان میں قاضی ثناء اللہ کی ذات والا صفات صفِ اوّل میں شامل ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔

### شاہ ولی اللہ کے حلقۂ درس میں

قاضی ثناء اللہ کا مولد و منشا پانی پت ہے۔ ولادت ۱۱۴۵ھ اور ۱۱۴۷ھ کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر اپنے شہر کے اساتذہ سے مروجہ علوم اور عربی کی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد دہلی کا رخ کیا جو اس عہد میں مرکزِ اربابِ فضل اور مرجعِ اصحابِ کمال تھا اور جہاں حجۃ الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدّث کا غلغلۂ درس بلند تھا۔ بہت سے اعاظمِ رجال نے شاہ صاحب کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کے لیے دہلی کو اپنا قبلہ گاہ قرار دے لیا تھا۔ قاضی ثناء اللہ نے بھی اسی شہر کے لیے رختِ سفر باندھا اور شاہ صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ان سے حدیث و فقہ کی تکمیل کی اور اٹھارہ سال کی عمر میں علومِ عقلیہ و نقلیہ پر حاوی ہو گئے۔

## شیخ محمد عابدؒ سُنامی اور مرزا مظہر کے حلقۂ طریقت میں

فارغ التحصیل ہونے کے بعد شیخ محمد عابد سُنامی سے بیعتِ تصوّف کی اور ان کے اثرِ صحبت سے روحانیت کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ ان کی وفات کے بعد مرزا مظہر جان جاناں کی بیعت کا شرف حاصل کیا اور سلوک و طریقت میں طریقۂ مجددیہ کے مقاماتِ علیا تک رسائی حاصل کی۔ مرزا ممدوح ان پر انتہائی شفقت فرماتے اور بہ درجۂ غایت محبت سے پیش آتے تھے۔

### شاگردی اور تدریس

قاضی ثناء اللہ کے حالات کے ضمن میں دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ ایک یہ کہ قاضی ممدوح شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے یا شاہ عبدالعزیز کے؟ دوسرے یہ کہ کیا پانی پت میں ان کا سلسلۂ تدریس قائم تھا؟

"تراجم علمائے حدیث ہند" کے مصنف مولانا ابویحیٰ امام خاں نوشہروی مرحوم نے ترجمۂ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے ضمن میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا ذکر شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں کی فہرست میں کیا ہے[1] اور خود قاضی صاحب ممدوح کے ترجمے میں "معارف" (اعظم گڑھ) کا ایک مضمون درج کر دیا ہے، جس میں مرقوم ہے کہ یہ صحیح نہیں کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، بلکہ آپ دراصل حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے حضرت شاہ عبدالعزیز کی صغر سنی ہی میں فارغ ہو کر آپ اپنے خاندانی منصبِ قضا پر پانی پت میں ممتاز تھے۔ وہیں سلسلۂ درس بھی تھا۔ گو پانی پت میں قیام کی وجہ سے درس و تدریس نے پوری شہرت نہیں پائی۔[2]

اصل قصہ یہ ہے کہ "معارف" میں سید سلیمان ندوی کا ایک مضمون بعنوان "ہندوستان میں علمِ حدیث" کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا جس میں قاضی ثناء اللہ

---

[1] دیکھیے تراجم علمائے حدیث ہند ص ۵۹۔ [2] ایضاً ۲۰۷

کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا شاگرد بتایا گیا تھا۔[۵۳] لیکن اس کے بعد مولانا محمد فاروق بہرائچی نے سلسلۂ "عالیہ مجددیہ اور علمِ حدیث" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں اس کی تردید کی اور ثابت کیا کہ قاضی صاحب ممدوح شاہ عبدالعزیز کے شاگرد نہیں تھے، بلکہ ان کے والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے شاگرد تھے۔[۵۴] معلوم ہوتا ہے کہ صاحب "تراجم علمائے حدیث ہند" نے اس سلسلے میں خود زیادہ تحقیق نہیں کی، "معارف" کے مضامین ہی کو کافی سمجھ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد نہیں تھے، بلکہ ان کا شمار شاہ ولی اللہ کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ قاضی صاحب ۱۱۴۵ اور ۱۱۴۷ھ کے درمیان پیدا ہوئے جب کہ شاہ عبدالعزیز کا سنِ ولادت ۱۱۵۹ھ ہے۔ اس حساب سے قاضی صاحب ان سے تیرہ چودہ سال عمر میں بڑے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر منصبِ قضا پر بھی فائز ہو گئے تھے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیا قاضی ثناء اللہ کا پانی پت میں باقاعدہ سلسلۂ درس جاری تھا؟ ہمارے خیال میں "معارف" کے فاضل مقالہ نگار مولانا محمد فاروق کا یہ کہنا محلِ نظر ہے کہ قاضی ثناء اللہ کا "وہیں سلسلۂ درس بھی تھا، گو پانی پت میں قیام کی وجہ سے درس و تدریس نے پوری شہرت نہیں پائی۔"

واقعہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے اور دُور دراز دیہات میں بھی جن علمائے کرام نے مسندِ درس بچھائی، وہ مرجعِ تشنگانِ علم قرار پا گئے اور ان دیہات کو غیر معروف ہونے کے باوجود شہرتِ دوام حاصل ہو گئی۔ جن حضرات نے ان دیہات کے اساتذہ سے استفادہ کیا، ان کے اسمائے گرامی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں ہمیشہ کے لیے

---

۵۳ ملاحظہ ہو "معارف" (اعظم گڑھ) نومبر ۱۹۲۸ء ص ۳۴۶۔

۵۴ " " جون ۱۹۲۹ء ص ۴۴۴۔

محفوظ ہو گئے، لیکن قاضی ثناء اللہ کے تلامذہ کا چند ایک کے سوا کچھ پتا نہیں چلتا۔

یہ بات قرینِ صحت نہیں کہ ان کے سلسلۂ درس نے پانی پت کی وجہ سے شہرت نہیں پائی۔ قاضی صاحب کے زمانے میں پانی پت کوئی غیر معروف قریہ نہ تھا، بلکہ ایک اچھا خاصا شہر تھا، جہاں باقاعدہ محکمۂ قضا قائم تھا اور متعدد بزرگانِ دین اور مشائخ کرام کا مسکن رہا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ قاضی صاحب ممدوح زیادہ تر منصبِ قضا کی ذمہ داریوں میں مصروف رہے اور اسی کو مرکزِ توجہ ٹھہرائے رکھا کہ اس سے بہ طریقِ احسن عہدہ برآ ہو سکیں۔ مختلف مسائلِ فقہی کے حل و کشود کے سلسلے میں ان میں جو وسعتِ فکر اور ملکۂ اجتہاد پیدا ہوا وہ ان کے منصبِ قضا ہی پر متمکن رہنے کا نتیجہ ہے۔

محکمۂ قضا کی اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وہ تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے۔ تصنیف و تالیف کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے اور تحقیق و کاوش کا طالب۔ ان دو بنیادی کاموں کے علاوہ کسی اور کام کے لیے زیادہ وقت نکالنا ان کے لیے مشکل تھا —— اس لیے ظاہر ہے قاضی ثناء اللہ کا سلسلۂ درس و تدریس محدود اور مقامی نوعیت کا تھا، جس کی طرف ان کے زمانے میں اور ان کے بعد اعتنا نہیں کیا گیا۔ اگر ان کا سلسلۂ درس دیگر علما کی طرح غیر محدود اور وسعت پذیر ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ان کی باقی خدمات کو تو شہرت و قبولیت حاصل ہو جاتی اور تدریسی سرگرمیاں پردۂ خفا میں رہتیں —— ان کا تعلق صرف پانی پت ہی سے نہ تھا اور وہ ایک خاص علاقے اور شہر کے عالم ہی نہ تھے، وہ ایک عہد اور دور کے جلیل القدر عالم و فقیہ تھے اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے تلمیذِ رشید تھے، جن کے خود شاہ صاحب بھی مداح ہیں۔ اگر ان کی باقاعدہ مسندِ درس آراستہ ہوتی اور طلبا زیادہ تعداد میں ان سے استفادہ کرتے تو لازماً اس کا ذکر کتبِ رجال میں آتا اور ان کے تلامذہ فخر سے اس کی تشہیر کرتے۔ طلبا اسناد کی شہرت کا ایک مستقل

ذریعہ ہوتے ہیں اور جن حضرات سے اخذ علم و کسب فیض کرتے ہیں، ان کی طرف نسبت تلمذ کا اظہار مسرت کے ساتھ کرتے ہیں تاکہ ان کی سند عالی ہو۔ قاضی ثناء اللہ کے تلامذہ و فیض یافتگان کا اگر تذکرہ نہیں ہے تو اس کو محض ان کی پانی پت کی سکونت قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے درس و تدریس پر تصنیف و تالیف، رشد و ہدایت، وعظ و نصیحت منصب قضا اور اصلاح خلائق کو ترجیح دی اور یہ ان کی عظیم الشان خدمت ہے۔ منصب قضا کی وجہ سے وہ صرف ایک ہی فقہی دائرے میں مقید نہیں رہے بلکہ تمام مسالک فقہ پر ان کی نظر حاوی ہو گئی اور ذہن و فکر کی وسعت نے ان کو آسمان کی بلندیوں پر اچھال دیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

بہر حال قاضی ثناء اللہ کا سلسلۂ درس محدود اور مقامی نوعیت کا تھا، جس میں پانی پت اور اس کے گرد و نواح کے طلبا استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے بڑے بیٹے مولانا احمد اللہ نے ان سے تحصیل کی۔ بعض اور طلبا بھی ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے۔ صوبہ سرحد کے دو یا تین طلبا نے بھی ان سے استفادہ اور استفاضہ کیا۔

قاضی صاحب موصوف کے حلقۂ درس کے محدود ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اتنے امیر عالم دین نہ تھے کہ طلبا کے مصارف برداشت کر سکتے۔ اپنے اندر استطاعت کفالت نہ تھی اور دوسروں سے مانگنا ان کی عادت میں داخل نہ تھا۔

ایک بڑی وجہ پانی پت میں وسیع پیمانے پر حلقۂ درس قائم نہ ہونے کی یہ بھی تھی کہ عرصۂ دراز تک یہ شہر کئی عظیم جنگوں کا میدان بنا رہا تھا۔ اس کے اطراف و جوانب کے دیہات تباہ ہو گئے تھے اور وہاں کے باشندے مختلف علاقوں میں منتقل ہو گئے تھے۔ اشیائے خورد و نوش آسانی سے مہیا نہ ہو سکتی تھیں اور لوگ پریشان حال تھے۔ ان حالات میں طلبا بھی ادھر کا بہت کم رخ کرتے تھے۔

## عَلَم الہدیٰ اور بیہقیِ وقت

نواب محمد صدیق حسن خاں ان کی علوِ فکر، جودتِ طبع، قوتِ ادراک اور اتباعِ سنت کی بہت تعریف کرتے اور "زائدالوصف" قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

بخدمت میرزا جان جاناں رسیدند و بر زبان ایشان ملقب بہ عَلَم الہدیٰ شدند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ایشان را بیہقیِ وقت می گفتند[۵۶]

(قاضی ثناء اللہ پانی پتی) میرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں پہنچے تو میرزا صاحب نے ان کو عَلَم الہدیٰ کے عظیم لقب سے سرفراز کیا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان کو بیہقیِ وقت کہہ کر پکارتے تھے۔

جس شخص کو میرزا مظہر جان جاناں جیسا عالم اجل اور صاحب طریقت "عَلَم الہدیٰ" کے خطاب سے نوازتا ہو، اور شاہ عبدالعزیز جیسے "بیہقیِ وقت" کے لقب سے سرفراز کرتے ہوں، غور فرمائیے وہ تدین و اتقا کی کتنی اونچی منزلیں طے کر چکا ہوگا اور مسائل شرعیہ پر عبور و استحضار اور کثرتِ مطالعہ میں اس کا مرتبہ کتنا بلند ہوگا۔

### کثرتِ مطالعہ

ان کا راہوارِ علم بہت تیز تھا اور زمانۂ طالب علمی میں بھی وہ ہر آن مصروفِ مطالعہ رہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے جس کا اظہار نواب صدیق حسن خاں نے ان کے شوقِ کتب بینی کے بارے میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

در ایامِ تحصیل سی صد و پنجاہ کتب سوائے کتبِ تحصیلیہ بہ مطالعۂ خود آوردند۔[۵۷]

زمانۂ طالب علمی میں مروجہ کتبِ نصابی کے علاوہ انھوں نے تین سو پچاس کتابوں کا مطالعہ کیا۔

---

۵۶ اتحاف النبلاء ص ۲۴۰۔ ۵۷ ایضاً۔

آج سے ڈھائی سَو سال قبل جب کہ کتابوں کی اشاعت وطباعت کی موجودہ سہولتوں میں سے کوئی سہولت بھی میسر نہ تھی، قلمی کتابیں ہی پڑھی اور پڑھائی جاتی تھیں، اس زمانے میں ساڑھے تین سَو کتابوں کا مہیا کرنا اور پھر انھیں پڑھنا کتنا مشکل کام اور کٹھن مرحلہ تھا، اور کتابیں بھی وہ جو خالص علمی اور فنی نوعیت کی تھیں۔

## مرشد کے دل پر مرید کی ہیبت

میرزا مظہر جان جاناں اپنے فضل وکمال کے باوصف قاضی صاحب ممدوح کے صلاح وتقویٰ اور پابندیِ شریعت کا واضح الفاظ میں ذکر فرماتے ہیں اور مرید سے اس کی للّٰہیت کی بنا پر روحانی خوف اور ہیبت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

میرزا مظہر می فرمود در دلِ فقیر مہابتِ ایشان می آید از رُوئے صلاح و تقویٰ و دیانت، روحِ مجسم اند، مروّجِ شریعت، منوّر طریقت، ملکی صفات کہ ملائکہ تعظیمِ ایشاں می نمایند[۵]

میرزا مظہر فرمایا کرتے کہ ان کے صلاح وتقویٰ اور دیانت کے باعث اس فقیر کے دل پر ان کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ وہ پیکرِ خیر، شریعت اسلامی کی ترویج واشاعت کرنے اور نورِ طریقت پھیلانے والے ہیں۔ اس درجے فرشتہ صفت ہیں کہ فرشتے ان کی تعظیم بجا لاتے ہیں۔

شیخ غلام علی شاہ علوی لکھتے ہیں کہ مَیں نے اپنے کانوں سے میرزا مظہر جان جاناں سے سنا، وہ قاضی ثناء اللہ کو اپنے لیے ذریعۂ مغفرت ٹھہراتے تھے:

می فرمودند اگر خدائے تعالیٰ بروزِ قیامت از بندہ پُرسید کہ بہ درگاہِ ما

---

۵۔ مقاماتِ مظہری ص ۷۶

تحفہ چہ آوردی ؟ عرض کنم ثناء اللہ پانی پتی را۔ [۹]

فرمایا کرتے اگر اللہ نے قیامت کے روز مجھ سے پوچھا کہ ہمارے دربار میں کیا تحفہ لائے ہو؟ تو عرض کروں گا، ثناء اللہ پانی پتی کو لایا ہوں۔ [۱۰]

## اوصافِ گوناگوں

قاضی ثناء اللہ کے بارے میں مرزا مظہر جان جاناں کا یہ قول بلاشبہ صحیح ہے

---

[۹] مقاماتِ مظہری ص ۷۶

[۱۰] یہی الفاظ حضرت مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے بارے میں کہے تھے۔ حضرت حافظ صاحب بہت بڑے اہلِ حدیث عالم اور استادِ پنجاب تھے۔ بے شمار اکابر علما نے ان سے اخذِ علم کیا۔ نابینا تھے، لیکن بصیرت و ذہانت اور ذکاوت و فطانت کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کے تلامذہ کی کثیر جماعت میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی شامل تھے، جو چودھویں صدی ہجری کے جید عالم اور بوقلموں اوصاف سے موصوف تھے۔ ایک مرتبہ علما کے ایک اجتماع میں حضرت حافظ صاحب نے فرمایا، اگر اللہ نے قیامت کے دن مجھ سے پوچھا کہ تم آنکھوں سے اندھے تھے، ہم نے تم کو عزت عطا فرمائی، علم سے نوازا، اور لاتعداد علما کو تمھارے حلقۂ شاگردی میں داخل کیا، بتاؤ اس احسانِ عظیم کے بدلے ہمارے حضور کیا تحفہ لائے ہو؟ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا، ثناء اللہ امرتسری کو لے کر حاضر ہوا ہوں، امید رکھتا ہوں کہ اس خدمت کے بدلے مستحق مغفرت سمجھا جاؤں گا۔!

مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی نے اپنے شاگرد مولانا ثناء اللہ امرتسری کے لیے وہی الفاظ استعمال فرمائے جو مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے شاگرد قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے لیے استعمال فرمائے تھے۔ بلاشبہ یہ دونوں ثناء اللہ متحدہ پنجاب کے فحول علما سے تھے۔ ایک کا تعلق تیرھویں صدی ہجری سے تھا اور ایک کا چودھویں صدی ہجری سے! دونوں مفسّرِ قرآن، محدث و فقیہ، کثیر التصانیف، وسیع النظر، وسیع الفکر اور اشاعتِ دین میں سرگرم تھے۔

وہ ہمہ گیر اوصاف کے حامل اور ہر گوشۂ علم میں کامل تھے۔ نواب صدیق حسن خاں رقم طراز ہیں:

مدت العمر در افاضۂ کمالات ظاہر و باطن و اشاعت علوم و فصل خصومات وافتائے سوالات و حلِّ معضلات مصروف بودند، در علمِ تفسیر و فقہ و کلام و تصوف ید طولیٰ داشتند[۱۱]

عمر بھر ظاہری و باطنی کمالات کی فیض رسانی، اشاعتِ علوم، فصلِ خصومات، فتووں کے جواب دینے اور مشکل مسائل کی عقدہ کشائی میں مصروف رہے۔ علم تفسیر، فقہ و کلام اور تصوف میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فقہی مسلک میں حنفی تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی بعض تصنیفات کے آغاز میں کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد الطالبین کے شروع میں لکھتے ہیں:

بعد حمد و صلوٰۃ فقیر محمد ثناء اللہ پانی پتی موطناً عثمانی نسباً حنفی مذہباً، نقشبندی مجددی مشرباً...[۱۲]

فارغ التحصیل ہونے کے بعد منصبِ قضا پر مامور ہوئے جو مدتِ مدید سے ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔ اس نازک منصب کے وقار کو انھوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اس کی ذمہ داریوں کو نہایت عمدہ طریق سے پورا کرتے رہے۔ اس باب میں اپنے ماتحت عملے کی پوری نگرانی کرتے، عدل و انصاف کے تقاضوں سے نہ خود غافل ہوتے نہ کسی کو غلط راہ اختیار کرنے دیتے۔ جس شخص کے پاس ان کی مہر رہتی تھی، ایک مرتبہ اس نے کسی سے کوئی چیز لے لی[۱۳]۔ ان کو اطلاع ہوئی

---

[۱۱] اتحاف النبلاء، ص ۲۴۱۔

[۱۲] ارشاد الطالبین ص ۲۔

[۱۳] مقامات مظہری ص ۷۷۔

تو اس کو سزا دی اور وہ چیز واپس کی۔

تصنیف و تالیف اور بیانِ حقائق و معارف میں وہ شاہ ولی اللہ کے تمام تلامذہ سے فائق تر تھے۔ ان کی تصانیف میں اسی طرح مجتہدانہ شان نمایاں ہے، جس طرح ان کے استادِ عالی قدر حضرت شاہ ولی اللہ کی تصانیف میں، نمایاں ہے۔ ان کے مرشد مرزا مظہر جان جاناں بھی صفتِ اجتہاد سے متصف تھے۔

قاضی ثناء اللہ کی تصانیف میں تفسیر مظہری ضخامت اور عمدگی کے اعتبار سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ عربی زبان میں قرآن مجید کی یہ مشہور تفسیر ہے اس کا نام انھوں نے اپنے استاذ و مرشد مرزا مظہر جان جاناں کے نام پر رکھا۔ اس تفسیر کے بارے میں انھوں نے اپنے پیر بھائی مولانا نعیم اللہ بہرائچی کو خط لکھا جس میں اس کے حجم و ضخامت اور مندرجات و مشمولات کا ذکر کیا ہے۔ خط فارسی زبان میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اللہ کے فضل سے تفسیر مظہری اختتام کو پہنچ گئی ہے۔ اس میں مذاہبِ فقہا، شانِ نزول، ادلۂ احکام، مسائل فقہ، مسائل کلام، مسائل تصوّف، سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مغازی، اختلافِ قرأت وغیرہ امور تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

شانِ اجتہاد

میرزا مظہر جان جاناں ان کے علم و فضل اور تحقیق و تدقیق پر بہت اعتماد فرماتے تھے اور ان کی فقہی حیثیت اور اجتہادی شان کا اعتراف کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ مرزا ممدوح نے شاہ ولی اللہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کے موضوع پر ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی۔ شاہ صاحب نے وہ رسالہ لکھ کر میرزا صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ لیکن وہ ان کے حسبِ دل خواہ نہ تھا، لہٰذا انھوں نے وہ رسالہ قاضی صاحب کو بھیج دیا، چند کتابیں اور بھی بھیجیں، ساتھ ہی خط لکھا کہ اپنے علم و مطالعہ کے مطابق سیرتِ طیبہ سے متعلق ایک کتاب لکھیں۔ قاضی صاحب نے تعمیل حکم کی اور چودہ کتابوں کے حوالے

سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر ایک رسالہ تحریر فرمایا، جس میں آنحضرت کے افعال و اعمال فقہی ابواب قائم کر کے جمع فرمائے، اختلافاتِ روایات میں تطبیق دی اور حسبِ موقع مذہبِ راجح کی ترجیح کے وجوہ مجتہدانہ انداز سے بیان کیے۔ یہ رسالہ طبع نہیں ہوا، اصل مسودہ قاضی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس کے شروع میں اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک رسالہ ہے[14]

مقاماتِ مظہری کے مصنف شہیر شاہ غلام علی علوی، قاضی ثناء اللہ کا ذکر محبت اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ ان کے مرتبۂ اجتہاد اور تبحرِ علمی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

در علوم عقلی و نقلی تبحر تام دارند، در فقہ و اصول بہ مرتبۂ اجتہاد رسیدہ۔ کتابے مبسوط در علم فقہ با بیانِ ماخذ و دلائل مختار مجتہدانِ مذاہبِ اربعہ در ہر مسئلہ تالیف نمودہ اند، و ہر آنچہ نزد ایشاں اقوی ثابت شدہ آں را رسالہ جدا مسمّٰی بہ "ماخذ الاقویٰ" تحریر فرمودہ۔ در اصول نیز "مختارات" خود نوشتہ اند[15]

علوم نقلی و عقلی میں کامل تبحر رکھتے تھے، فقہ و اصول میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے علم فقہ میں ایک مبسوط و مفصل کتاب تصنیف کی جس میں ہر مسئلہ ماخذ کے حوالوں اور مجتہدینِ مذاہب اربعہ کے مختار دلائل سے بیان کیا۔ کسی مسئلے میں ان کے نزدیک جس مذہبِ فقہی کی جو دلیل زیادہ قوی ہے، اس کو ایک الگ رسالے "ماخذ الاقوی" میں تحریر کیا۔ اصول فقہ میں بھی "مختارات" کے نام سے کتاب لکھی۔

تصنیفات

قاضی ثناء اللہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جو تفسیر، حدیث، فقہ، اور زہد و عبادت وغیرہ کے موضوع کو محتوی تھیں۔ ان کی بعض تصنیفات کا پتا

---

[14] معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۲۹ء
[15] مقاماتِ مظہری ص ۷۵۔

نہیں چلتا، جن کا پتا چل سکا ہے، ان میں اہم کتابیں یہ ہیں :

تفسیر مظہری : یہ قرآن مجید کی عربی تفسیر ہے جو دس جلدوں میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کی ہے۔ نہایت شاندار اور عمدہ تفسیر ہے۔ قاضی صاحب نے اسے اپنے مرشد میرزا مظہر جان جاناں کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا صاحب سے انھیں انتہائی محبت تھی۔

فتاویٰ مظہری : یہ قاضی صاحب کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ یہ وہ فتوے ہیں جو انھوں نے مختلف فقہی مسائل سے متعلق جاری کیے۔ یہ فتوے قاضی صاحب کے پوتے قاضی عبدالسلام بن دلیل اللہ کے مرتب کردہ ہیں اور مرزا مظہر جان جاناں کی طرف منسوب ہیں۔

رسالہ پنج روزی : یہ رسالہ اصولِ فقہ میں ہے۔

مختارات : یہ بھی اصولِ فقہ میں ہے۔

سیف المسلول : اس کتاب کا دوسرا نام شمشیر برہنہ ہے۔ ردِّ شیعہ میں ہے۔ اپنے موضوع کی یہ مشہور کتاب ہے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے "تحفہ اثنا عشریہ" سے پہلے کی تصنیف ہے۔

حرمتِ متعہ : یہ بھی ردِّ شیعہ میں ہے، اس میں حرمتِ متعہ سے متعلق دلائل دیے گئے ہیں۔

مالا بُدّ منہ : فقہی ترتیب سے عقائد پر یہ عمدہ کتاب ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

ارشاد الطالبین : سلوک و طریقت کے بارے میں ہے۔ فارسی میں ہے۔ فقہی مسائل بھی اس میں بیان کیے گئے ہیں۔

تذکرۃ الموتیٰ والقبور : اس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں احوالِ قبور کا بیان ہے اور بتایا ہے کہ قبر میں نیک آدمی کس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اور غلط اعمال کے مرتکب شخص کو کس صورتِ حال میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

6-1993

تذکرۃ المعاد : یہ کتاب قیامت اور آخرت کے احوال و کوائف کو محیط ہے۔
حقوق الاسلام : اس کا دوسرا نام حقیقۃ الاسلام بھی ہے۔
رسالہ درحرمت غنا : اس میں غنا اور سرود کی حرمت بیان کی ہے۔ قوالی اور سماع کو بھی ناجائز اور خلاف شرع قرار دیا ہے۔
رسالہ در عشر و خراج : اس میں عشر اور خراج کے احکام درج ہیں۔
رسالہ شہاب ثاقب :
حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایک مبسوط کتاب دو جلدوں میں تصنیف کی۔
وصیت نامہ : اسّی سال کی عمر کو پہنچ کر اپنے احباب و اولاد کو وصیت کی کہ وفات کے بعد ان کی تجہیز و تکفین سنت کے مطابق کی جائے، قرض وغیرہ ادا کیا جائے اور ساتواں، دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ خلاف شرع رسوم ہیں یہ بالکل نہ کی جائیں۔
المقالۃ المرضیۃ فی النصیحۃ و الوصیۃ : حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے رسالہ "وصیت نامہ" کی شرح۔
مکتوبات : قاضی صاحب ممدوح کے یہ مکتوبات تصوف و سلوک اور مسائل فقہی سے متعلق ہیں اور خالص علمی و تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ شیخ ابوالخیر محمد ابن احمد فاروقی مرادآبادی نے "کلمات طیبات" میں قاضی ثناء اللہ کے آٹھ مکتوب نقل کیے ہیں، جو شاہ غلام علی علوی مجددی، قاضی کرانہ شیخ محمد اور شیخ نعیم اللہ بہرائچی کے نام ہیں۔ ایک مکتوب خاندانِ سادات میں سے ایک بزرگ کے نام ہے۔

استاد، مرشد اور معاصرین کا ہدیۂ عقیدت و تعظیم

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے اس شاگرد کی بہت تعظیم کرتے تھے جس زمانے میں وہ شاہ صاحب کے حلقۂ درس میں شریک تھے، اس زمانے میں شاہ صاحب ان

کے بارے میں ایک مکتوب میں مرزا مظہر جان جاناں کو لکھتے ہیں:

مولوی ثناء اللہ مصابیح و صحیحین استماع نمودند و مستعد کتب ستہ بلکہ عشرہ متداولہ اند ہمیں توجہ ہمت سامی است کہ آیتہ بہ ظہور رسد و بعد ازاں احرام صحبت شریف بندند[۹۶]

مولوی ثناء اللہ مصابیح اور صحیحین پڑھ رہے ہیں۔ کتب ستہ بلکہ عشرہ متداولہ کی تکمیل کے لیے میرے پاس ہیں۔ آپ کی توجہ خاص سے امید ہے کہ اللہ کی کوئی نشانی ظہور میں آئے گی۔ اس کے بعد آپ کی خدمت میں احرام باندھیں گے۔

قاضی ثناء اللہ برصغیر کے وہ بزرگ تھے جن کے خاندان میں دس پشت سے علم متوارث چلا آرہا تھا۔ اس فضیلت کے علاوہ ان کو اخلاق فاضلہ اور مکارم پسندیدہ سے بھی بہرۂ وافر حاصل تھا۔ مولانا نعیم اللہ بہرائچی ان کے فضل و کمال اور معرفت و ادراک کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

بالجملہ ذات منبع کمالات حضرت مولانا ثناء اللہ پانی پتی است، از آیات سبحانی و نوری است از انوار تجلیات ربانی، و فاضل، عالم، درویش، عامل و مکمل فقیہ و متکلم و محدث و مفسر و حافظ کلام اللہ است، و موصوف باخلاق حمیدہ و مکارم پسندیدہ، و در امانت و دیانت و صلاح و تقویٰ و خوش خلقی و پاک طینتی، و انجاح مہمات خلائق و کمال کسر نفس بے نظیر، و ہمیشہ بطاعت و عبادت و ریاضت و تدریس علوم ظاہر و باطن و مطالعہ و مباحثہ علوم دینی و تصانیف کتب مشغول۔ ازیں جا است کہ حضرت ایشاں یعنی حضرت میرزا جان جاناں شہید رحمہ اللہ می فرمودند کہ وجود کہ از اجتماع انوار کمالات ظاہری و باطنی و ضیائے صبح صلاح و تقویٰ ایشاں دلم مستنیر نہایت می گردد، و می فرمودند کہ وجود ایشاں بہ اعتقاد فقیر عزیز ترین موجودات است، و از روئے تقویٰ و دیانت روح مجسم

---

[۹۶] کلمات طیبات ص ۱۵۸، ۱۵۹۔

اند، و مروّج شریعت و منوّر طریقت و ملکی صفات اند، ملائکہ کرام تعظیم و تکریم ایشاں می کنند[۱۷]

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی جامع کمالات ہیں۔ ان کی حیثیت اللہ کی ایک نشانی اور تجلیاتِ ربانی کے انوار میں سے نورِ ہدایت کی ہے۔ فاضل و عالم، درویش و عامل، فقیہِ کامل، متکلم و محدث، مفسّر اور حافظِ قرآن ہیں۔ اخلاقِ حمیدہ سے موصوف اور مکارمِ پسندیدہ سے متصف ہیں۔ دیانت و امانت، صلاح و تقویٰ اور خوش خلقی و پاک طینتی سے بہرہ ور ہیں۔ خدمتِ خلق میں مشغول اور کسر نفسی میں بے مثال۔ ہمیشہ اطاعتِ الٰہی، عبادت و ریاضت، علومِ ظاہری و باطنی کی تدریس، فنونِ دینی کے مطالعہ و مباحثہ اور تصنیفِ کتب میں منہمک رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید فرمایا کرتے تھے کہ ان کی ذاتِ گرامی سے، جو مجموعۂ کمالاتِ ظاہری و باطنی، روشنیٔ صبح صادق اور نشانِ صلاح و تقویٰ ہے، میرا دل انتہائی مستنیر ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک ان کا وجود سب سے بہتر اور مغتنمات میں سے ہے۔ وہ پیکرِ تقویٰ و دیانت ہیں، شریعت کی ترویج و اشاعت اور طریقت و سلوک کی راہ کو روشن کرنے والے ہیں۔ فرشتہ صفت ہیں اور فرشتے ان کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔

مولانا نعیم اللہ بہرائچی لکھتے ہیں :

بالجملہ ذاتِ ایشاں با کمالاتِ ظاہر و باطن موصوف است و اوقات بہ طاعت و عبادت معمور اند[۱۸]

ان کی ذاتِ گرامی کمالاتِ ظاہر و باطن سے موصوف ہے اور ان کے اوقاتِ شب و روز اطاعتِ خداوندی اور عبادتِ الٰہی سے معمور ہیں۔

---

[۱۷] "معارف" (اعظم گڑھ) جون ۱۹۲۹ء بحوالہ بشاراتِ مظہریہ۔

[۱۸] مقاماتِ مظہریہ ص ۷۷۔

## فتنۂ معاصرت سے پاک لوگ

علم کی دنیا میں معاصرت کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ کم ہی لوگ ہوں گے جو اپنے عصر اور زمانے کے اہلِ علم کو لائقِ اعتنا اور قابلِ ستائش گردانتے ہوں۔ ہر اہلِ علم اپنے آپ کو دوسرے اہلِ علم سے فائق تر سمجھتا ہے۔ اگر دو عالم ایک ہی فن سے تعلق رکھتے ہوں تو دونوں اپنی مدح وثنا اور دوسرے کی تنقید وتنقیص میں بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس مہلک مرض میں قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقے مبتلا ہیں۔ بس کسی کے سامنے دوسرے کی ذرا بات چھیڑ کر دیکھیے، پتا چلے گا کہ بھرا پڑا تھا۔ ایسے ایسے انکشافات ہوں گے کہ سننے والا حیران ہو کر رہ جائے۔

لیکن اہل اللہ کی مجلس میں یہ بات نہیں ہے۔ مولانا نعیم اللہ بہرائچی جو قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے ہم عصر ہیں، ان کی بے حد تعریف کرتے اور ان کو علم وفضل اور تقویٰ وتدین میں بے نظیر قرار دیتے ہیں۔ ان کے مرشد مرزا مظہر جان جاناں بھی اپنے شاگرد اور مرید کی مدحت وستائش میں رطب اللسان ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو نہ ان کے استاد ہیں نہ مرشد، ان کے وسعتِ علم وکثرتِ مطالعہ کی بنا پر انھیں "بیہقیِ وقت" کہہ کر پکارتے ہیں۔

ایک معاصرت باعثِ فتنہ وفساد ہے اور ایک سکونِ قلب اور اطمینانِ روح وذہن کا سبب۔ اس کی اصل وجہ اخلاص اور تعلق باللہ ہے۔ جن لوگوں کے دل اخلاص سے خالی اور تعلق باللہ سے محروم ہیں، نہ وہ کسی کا احترام کرتے ہیں اور نہ کوئی ان کو خاطر میں لاتا ہے۔ جو حضرات اس نعمتِ عظمیٰ سے مالا مال ہیں، وہ سب کی عزت کرتے ہیں اور سب لوگ ان کی تعظیم بجا لانے کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ ہمارے اسلاف کا شمار اس خوش بخت گروہ میں ہوتا ہے جو دوسروں کے احترام کو علم وکمال کا احترام اور دوسرے کی توہین کو علم وکمال کی توہین سے تعبیر کرتے ہیں۔

## مسائل میں نقطۂ نظر

قاضی ثناء اللہ کا دور ہندوستان میں فقہ وقیاس کے تغلب واستیلا کا دور

تھا۔ ملک کے علما و فضلا کی اکثریت مسائل میں ایک خاص فقہی نقطۂ نظر کو ترجیح دیتی تھی جسے فقہِ حنفی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے اساتذہ و شیوخ بھی، جن میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور میرزا مظہر جان جاناں کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں، وسعتِ علم و مطالعہ کے باوصف اس دائرۂ خاص سے پوری طرح باہر نہیں نکلے تھے۔ تاہم جہاں فرمانِ پیغمبر واضح طور پہ سامنے آجاتا اور سنتِ نبوی (علیہ الف الف تحیۃ و سلام) پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی، وہاں فقہی نقطۂ نظر اور تقلیدِ امام سے خود بھی دست کش ہو جاتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے۔ چنانچہ تفسیر مظہری میں وضاحت سے رقم طراز ہیں:

اذا صح عند احد حديث مرفوع من النبي صلى الله عليه وسلم سالما عن المعارضة ولم يظهر له ناسخ وكان فتوى ابي حنيفة رحمه الله مثلاً خلافه وقد ذهب على وفق الحديث احد من الائمة الاربعة يجب عليه اتباع الحديث الثابت ولا يمنعه الجمود على مذهبه من ذلك كيلا يلزم اتخاذ بعضنا بعضاً اربابا من دون الله[19]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مرفوع اور تعارض و نسخ سے محفوظ حدیث مل جائے، اگرچہ امام ابو حنیفہ کا فتویٰ و قول اس کے خلاف ہی ہو، اور دوسرے ائمہ میں سے کسی ایک امام کا رجحان اس حدیث کے موافق ہو، تو ایسی صورت میں اپنے (تقلیدی) مذہب پر اڑے نہیں رہنا چاہیے، بلکہ حدیث کا اتباع واجب ہے، تاکہ قرآن کے اس ارشاد کے انطباق سے کہ بعض لوگوں نے بعض لوگوں کو رب قرار دے رکھا ہے، بچا جاسکے۔

---

[19] تفسیر مظہری ج ۲ ص ۶۴۔

قاضی صاحب موصوف عورتوں کے قبروں پر جانے اور ان پر چراغ جلانے کی سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

روی الحاکم و صححہ عن ابن عباس لعن اللہ زائرات القبور و المتخذین علیھا المساجد والسرج [۲۰]

حاکم میں ایک حدیث ہے، جسے وہ صحیح قرار دیتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ نیز قبروں کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ جلانے والوں کو ملعون گردانا ہے۔

سورۂ یوسف کی آیت (نمبر ۵۵) قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ج (کہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہِ مصر سے کہا، مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کردو) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفیہ دلیل علیٰ جواز طلب الولایۃ والقضاء [۲۱]

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ولایت و قضا کا منصب طلب کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ یہ منصب نیکی کی ترویج و اشاعت اور برائی کو ختم کرنے کی نیت سے طلب کیا جائے۔

تفسیر مظہری عربی زبان میں نہایت مفصل اور عمدہ تفسیر ہے، جس میں مختلف مباحث کے سلسلے میں فقہا و محدثین کے مسالک کی بہترین اسلوب اور اعتدال و توازن سے وضاحت کی گئی ہے۔

قاضی ثناء اللہ نہایت متبع سنت عالم تھے، وہ ہر معاملے میں اتباعِ سنت کی تاکید کرنے اور امورِ بدعت سے بچنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ ان کی کتاب

---

[۲۰] تفسیر مظہری، ج ۲ ص ۶۵۔

[۲۱] ایضاً، ج ۵ ص ۱۴۱۔

"ارشاد الطالبین" تصوف و طریقت کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں انھوں نے جا بجا بدعات سے دامن کشاں رہنے اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے پر زور دیا ہے۔ اس ضمن میں وہ قرآن اور حدیث سے استدلال کرتے اور انتہائی عمدگی سے مسائل کی وضاحت فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ولایت و تصوف اللہ کی وہ نعمت ہے جو اُن ہی لوگوں کو حاصل ہو سکتی ہے جو اعتقاداتِ صحیحہ رکھتے ہوں، جن کی زندگی قرآن و حدیث و اجماعِ اہلِ سنت کے مطابق ہو، جن کی پہچان اعمالِ صالح ہو جو ادائے فرائض و واجبات و سنن و مستحبات کا پورا اہتمام کرتے ہوں اور ترکِ محرمات و مکروہات و مشتبہات و بدعات جن کا شیوہ ہو[22]۔

لکھتے ہیں کہ اذان کہتے وقت اور اللہ کا ذکر کرتے وقت انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسا کلمہ نہیں کہنا چاہیے جو حدیث میں نہ آیا ہو اور بعد کی اختراع ہو۔ فرماتے ہیں:

پس اگر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ گوید و باوے ضم کند علیؓ ولی اللہ یا ابوبکر ولی اللہ تعزیر کردہ شود[23]۔

یعنی اگر کوئی شخص کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے اور اس کے ساتھ علی ولی اللہ یا ابوبکر ولی اللہ کے الفاظ ملا دے تو وہ قابل سزا ٹھہرے گا۔

تحریر فرماتے ہیں کہ کوئی ولی اور صوفی اور صاحبِ طریقت و سلوک معصوم نہیں ہے معصوم صرف انبیا علیہم السلام ہیں۔

عصمت خاصۂ انبیا است در اولیا گفتن کفر است[24]۔

---

[22] ارشاد الطالبین ص ۳

[23] ایضاً ص ۱۹

[24] ایضاً

عصمت فقط نبیوں کا خاصہ ہے، اولیا کو معصوم قرار دینا کفر ہے۔

اولیاء اللہ کی قبور پر گنبد تعمیر کرنے، ان پر چراغاں کرنے اور اُن پر عرس منعقد کرنے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

قبورِ اولیا بلند کردن و گنبد بر آں ساختن و عرس و امثالِ آں و چراغاں کردن ہمہ بدعت است۔ بعضے ازاں حرام است و بعضے مکروہ۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر شمع افروزان نزد قبر، و سجدہ کنندگان را لعنت گفتہ و فرمودہ کہ قبرِ مرا عید و مسجد نہ کنید[۲۵]

اولیاء اللہ کی قبروں پر عمارت تعمیر کر کے انھیں بلند کرنا، ان پر گنبد بنانا، ان پر عرس وغیرہ کی محفلیں جمانا اور چراغاں کرنا سب بدعت ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں حرام ہیں اور بعض مکروہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر شمع جلانے اور ان پر سجدہ کرنے والوں پر لعنت کی ہے اور فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید اور سجدہ گاہ نہ بناؤ۔

قاضی صاحب ممدوح کی کتاب "مالا بُدّ منہ" فارسی میں ہے اور خالص فقہی نوعیت کی ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف مسائل کی وضاحت کی ہے۔ اس کی کتاب الصلوٰۃ میں نماز میں مسئلہ رفع الیدین کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

وقت رفتن برکوع و سر برداشتن ازاں رفع یدین نزد ابی حنیفہ سنت نیست لیکن اکثر فقہا و محدثین اثبات آں کنند[۲۶]

رکوع کو جاتے اور رکوع سے اُٹھتے وقت امام ابو حنیفہ کے نزدیک رفع یدین کرنا سنت نہیں ہے، لیکن اکثر فقہا و محدثین اس کو سنت قرار دیتے ہیں۔

دوسری رکعت پوری کر کے تیسری رکعت کے لیے اُٹھتے وقت بعض حضرات رفع یدین کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے، اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

---

۲۵؎ ارشاد الطالبین ص ۲۰

۲۶؎ مالا بُدّ منہ، ص ۲۴

... بعد ازاں تکبیر گویاں بسوئے رکعت سوم برخیزد، و رفع یدین دریں وقت نزد اکثر علما سنت است نہ نزد ابی حنیفہ و شافعی[۲۷]

... یعنی دوسری رکعت سے تیسری رکعت کے لیے اللہ اکبر کہتا ہوا اُٹھے تو اس موقع پہ اکثر علما کے نزدیک رفع یدین سنت ہے، لیکن امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک سنت نہیں ہے۔

مالا بدمنہ میں انھوں نے احتکار اور ذخیرہ اندوزی پہ بھی بحث کی ہے اور اس کو ناجائز ٹھہرایا ہے، کیوں کہ معاشی اعتبار سے معاشرے کے لیے یہ سخت تکلیف دِہ ہے۔ لکھتے ہیں:

احتکار یعنی بند کردن و نہ فروختن قوتِ آدمیاں و چہارپایگان در شہرے کہ برائے اہلِ آں مصر باشد، مکروہ است، و نزد امام ابی یوسف در ہر جنس کہ ضررِ احتکارِ آں بعامہ باشد، احتکارِ آں ممنوع است، حاکم محتکر را امر کند کہ زیادہ از حاجتِ خود بہ فروشد، پس اگر نہ فروشد، حاکم بہ فروشد[۲۸]

ذخیرہ اندوزی کرنا اور انسانوں اور چارپایوں کی خوراک کو، جو اسی شہر کے باشندوں کے لیے ہے، فروخت نہ کرنا مکروہ ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک ہر وہ جنس کہ جس کی ذخیرہ اندوزی عوام کے لیے تکلیف کا باعث ہو ممنوع ہے۔ حاکم کو چاہیے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والے کے نام حکم جاری کرے کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ غلّے کو فروخت کر دے، اگر وہ حاکم کے حکم کے باوجود فروخت نہ کرے تو حاکم اسے خود فروخت کرے۔

اشیائے خورونوش کے نرخ مقرر کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں:

---

۲۷؎ مالا بدمنہ ص ۲۵

۲۸؎ ایضاً ص ۷۸

پادشاہ و حاکم را نرخ کردن مکروہ است، مگر وقتیکہ بقالان در گرانیِ غلّہ بسیار تعدی نمایند دراں صورت بہ مشورتِ دانایاں نرخ کنند[۲۹]

پادشاہ اور حاکم کا چیزوں کے بھاؤ مقرر کرنا مکروہ ہے، لیکن جب غلّہ فروش بے تحاشا مہنگائی کرنے لگیں تو اس صورت میں وہ اہلِ فکر و دانش کے مشورے سے بھاؤ مقرر کرے۔

مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے قاضی صاحب ممدوح کی ایک تصنیف "اصولِ فقہ" کے حوالے سے ایک فارسی عبارت تحریر کی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

صدرِ اوّل میں عوام کو کوئی مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت پیش آتی، تو مسائل سے آگاہ اور باخبر لوگوں کے پاس جاتے، ان سے فتویٰ پوچھتے اور جو کچھ وہ بتاتے اس پر عمل کرلیتے۔ انھوں نے اپنے آپ پہ یہ پابندی نہیں عائد کی تھی کہ فلاں فلاں حضرات ہی سے فتویٰ پوچھیں گے، ان کے علاوہ اور کسی سے نہیں پوچھیں گے، جس سے مناسب سمجھتے مسئلہ پوچھ لیتے[۳۰]

## وصیت

قاضی ثناء اللہ نے اسّی سال کی عمر میں اپنی اولاد اور احباب کے لیے ایک وصیت نامہ تحریر فرمایا اور تاکید کی کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ:

در تجہیز و تکفین و غسل و دفن رعایت سنت کنند و دو چادر زرائی کہ حضرت ایشاں شہید رضی اللہ عنہ عنایت فرمودہ بودند دراں تکفین نمایند، و عمامہ خلافِ سنت است ضرور نیست، و نمازِ جنازہ بجماعت کثیر و امام صالح مثل حافظ محمد علی و یا حکیم سکھوا، یا حافظ پیر محمد بجا آرند، و بعد تکبیر اولیٰ سورۂ فاتحہ ہم خوانند، و بعد مُردن من رسوم دنیوی مثل دہم و بستم و چہلم و ششماہی و

---

۲۹ے مالابدمنہ، ص ۷۸۔

۳۰ے تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۲۱۵۔

برسمی ہیچ نکند، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ از سہ روز ماتم کردن جائز نہ داشتہ اند، حرام ساختہ اند، واز گریہ وزاری زناں را منع بلیغ نمایند، در حالتِ حیاتِ خود فقیر ازیں چیزہا راضی نہ بود، باختیارِ خود کردن نہ دادہ[۱۳۱]

(میری) تجہیز وتکفین اور غسل ودفن میں طریقۂ سنت کو ملحوظ رکھیں، جو دو چادریں حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید نے عنایت فرمائی تھیں، انھی میں دفن کریں۔ میت کے سر پر عمامہ باندھنا خلافِ سنت ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں نماز جنازہ میں کثرت سے لوگ شریک ہوں اور امام صالح جیسے حافظ محمد علی یا حکیم سکھوا یا حافظ پیر محمد جنازہ پڑھائیں۔ تکبیر اولیٰ کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھیں۔ دنیا کی جن رسموں کا رواج پڑ گیا ہے جیسے دسواں، بیسواں، چالیسواں، ششماہی اور برسی، یہ میری وفات کے بعد بالکل نہ کریں۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے زیادہ ماتم کرنے کو جائز نہیں ٹھہرایا، حرام قرار دیا ہے۔ عورتوں کو گریہ وزاری کرنے سے سختی کے ساتھ منع کریں۔ میں نے اپنی زندگی میں ان چیزوں کو کبھی پسند نہیں کیا اور جہاں تک میرا بس چلا، ان پر عمل نہیں ہونے دیا۔

قاضی صاحب ممدوح کو فقہِ ائمہ اربعہ پر کامل تبحر حاصل تھا۔ کسی فقہ کی کوئی اہم چیز ان کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔ وہ سب امور کو سامنے رکھ کر "احتیاط" پر عمل کرتے اور اسی کا لوگوں کو حکم دیتے۔

ان میں جو وسعتِ فکر ونظر اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہے اور مختلف مسالکِ فقہ میں انھیں جو گہرائی اور عمق حاصل ہے، اس کی موٹی موٹی چار وجوہ ہیں:

اوّل: شاہ ولی اللہ دہلوی سے شرفِ تلمذ وصحبت۔

دوم: مرزا مظہر جان جاناں سے ارادت وعقیدت۔

---

۱۳۱ کلماتِ طیبات ص ۱۵۳۔

سوم : کثرتِ مطالعہ اور حدیث و سنت سے شغف و محبت۔

چہارم : منصب قضا کی ذمہ داریاں۔ یہ منصب فہم و فراست کو جلا بخشتا، غور و فکر کے پیمانوں کو وسعت عطا کرتا اور قوتِ فیصلہ کی صلاحیتوں کو بڑھاتا ہے۔

### وفات

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اسی سال عمر پاکر غرہ رجب ۱۲۲۵ھ کو پانی پت میں انتقال کیا۔[۳۲]

### قاضی فضل اللہ

قاضی فضل اللہ پانی پتی علومِ مروجہ میں بہرۂ کامل رکھتے تھے، قاضی ثناء اللہ کے برادرِ کبیر تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے حلقۂ طریقت سے منسلک اور ان کے فیضِ صحبت سے بہرہ ور تھے۔ ہر آن ذکر و شغل میں مصروف اور متوجہ الی اللہ رہتے۔ اپنے برادرِ صغیر قاضی ثناء اللہ سے بہ درجۂ غایت تعلقِ خاطر تھا۔ ان کی وفات کے بعد انتہائی اندوہگین اور مغموم و محزون رہنے لگے تھے۔ فرمایا کرتے، میرے بھائی ثناء اللہ کی موت نے ہمیں حزن و ملال میں مبتلا کر دیا ہے۔

### اولاد

قاضی ثناء اللہ کے تین بیٹے تھے۔ قاضی احمد اللہ، قاضی صبغۃ اللہ اور قاضی دلیل اللہ! قاضی احمد اللہ نے علومِ متداولہ اپنے والدِ ماجد اور دیگر علمائے عصر سے پڑھے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے اصحابِ ارادت میں سے تھے۔ اپنے

---

۳۲۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے حالات میں اوپر حوالے میں درج کی گئی کتابوں کے علاوہ یہ کتابیں بھی دیکھیے: تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۸ — خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۸۹ تا ۶۹۰ — الیانع الجنی ص ۶۷ — حدائق الحنفیہ ص ۴۶۵، ۴۶۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۱۲ تا ۱۱۴ — حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ ص ۳۰۲ تا ۳۰۴ — مظہر العلما، ص ۴۷، ۴۸ — علم و عمل ج ۱ ص ۱۷۲، ۱۷۳۔

عہد اور علاقے کے جیّد عالم اور نامور فقیہ تھے، نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ عالم جوانی ہی میں اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نواز اتھا۔ ہر وقت مطالعۂ کتب میں مشغول رہتے۔ معاملاتِ دنیا سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ قرآن مجید کے حافظ اور قرأت و تجوید کے ماہر تھے۔ کمالاتِ ظاہری و باطنی کی دولت سے مالا مال تھے۔ علوم و فنون، للہیت اور خشیتِ الٰہی میں اپنے والد کی مانند تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں ان کی نیکی کی وجہ سے ان پر کمال شفقت و مہربانی فرماتے۔ عین عالمِ جوانی میں ۱۱۹۸ھ کو تیس برس کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حضرت قاضی صاحب کو لائق بیٹے کی وفات سے نہایت صدمہ پہنچا، لیکن صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔

قاضی صبغۃ اللہ، یہ قاضی ثناء اللہ کے فرزندِ دوم تھے۔ علم دین میں کامل تھے۔ حضرت مرزا جان جاناں کے حلقۂ طریقت میں شامل تھے۔ یہ بھی عالمِ شباب میں سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

تیسرے بیٹے قاضی دلیل اللہ تھے، جو فقہ و اصول کے عالم اور علومِ عقلیہ سے مناسبت رکھتے تھے۔ طریقت و سلوک میں مرزا مظہر جان جاناں سے فیض یافتہ تھے[۳۳]۔

---

۳۳ ۔ قاضی صاحب کے بھائی اور بیٹوں کے لیے دیکھیے مقاماتِ مظہری ص ۸، ۷، ۹۔

# ج

## ۴۳۔ مولانا جان محمد لاہوری

برصغیر پاک و ہند میں لاہور کو علم و کمال کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کے علما میں جن بزرگوں نے تیرھویں صدی ہجری میں اپنے کمالاتِ علمی کی وجہ سے شہرت پائی، ان میں مولانا جان محمد لاہوری کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ والد کا نام محمد غوث اور دادا کا ولی اللہ تھا۔ مولانا ممدوح ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) میں پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا ابتدائی دور کن حالات میں گزرا، اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اخذِ علم کے لیے کہاں کہاں کی خاک چھانی، کن بلاد و قصبات کا سفر کیا اور کس استاذ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں، کن حضرات سے کسبِ فیض کے مواقع میسر آئے، یہ سب باتیں تاریخ کی تہوں میں دب گئی ہیں۔

سیالکوٹ کی سکونت ترک کر کے لاہور میں آ بسے تھے اور کشمیری بازار کی ایک مسجد (نور محمد ایمان والا) میں درس و خطابت میں مصروف ہو گئے تھے۔ نہایت مؤثر وعظ کہتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے مواعظِ حسنہ سے متاثر ہو کر باقاعدہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوئے۔ تاریخ لاہور کے مصنف رائے بہادر کنہیا لال جو اُن کے ہم عہد ہیں لکھتے ہیں:

واعظ شیریں بیان مولوی جان محمد لاہوری اپنے وعظ کی سحر بیانی سے قلوب و اذہان کو مسحور کر دیا کرتے تھے۔ آپ سکھوں کے عہد میں کشمیری بازار کی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں یہ ایک وسیع مسجد تھی، جس میں ہزاروں لوگ جمعے کا خطبہ سننے آتے تھے۔ ایک دفعہ جمعے کا وعظ سننے کے لیے مسجد کا متولی نور محمد ایمان والا بھی آیا۔ وعظ سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی دستار اور

قیمتی کوٹ اتار کر مولوی صاحب کو پیش کیا اور نماز سے فارغ ہو کر آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی عظیم الشان حویلی میں لے گیا، اور اپنے اہل و عیال کو دوسرے مکان میں منتقل کر کے ساری حویلی مع ساز و سامان کے آپ کے حوالے کر دی۔ مولوی جان محمدؒ صاحب تا حینِ حیات اسی حویلی میں قیام پذیر رہے۔ بعد میں یہ حویلی آپ کی اولاد کے نام منتقل ہو گئی ہے[۱]

مولانا جان محمد اپنے دور میں خطۂ پنجاب کے مشہور مدرس اور ممتاز واعظ تھے۔ نامور فقیہ، جید عالم، معروف فاضل اور فروع و اصول پر حاوی تھے۔ نیک اور متقی بزرگ تھے۔ علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں انھوں نے بہت خدمات انجام دیں۔ ان سے متعدد علما و فضلا نے کسبِ علم اور اخذ فیض کیا۔ وہ عالم باعمل تھے۔ ہزاروں افراد نے ان کے فیضِ صحبت سے زہد و اتقا کی زندگی اختیار کی اور معصیت سے تائب ہوئے۔ جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا، ان میں مولانا محمد عالم کھوڑوی، مولانا کرامت اللہ، مولانا غلام محمد ملتانی اور مولانا فخرالدین کے اسمائے گرامی لائقِ تذکرہ ہیں۔

مولانا جان محمد لاہوری جہاں بہت بڑے مبلغ و مدرّس اور واعظ و مقرر تھے وہاں بہت اچھے مصنف بھی تھے۔ انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں درج ذیل کتابوں کا ذکر کتبِ تذکرہ و رجال میں موجود ہے:

۱۔ زبدۃ التفاسیر و التذکیر: یہ کتاب وعظ و تذکیر کے سلسلے میں ایک اہم اور ضخیم کتاب ہے۔

۲۔ شرح قصیدۂ بُردہ: قصیدہ بُردہ کی یہ ایک اچھی شرح ہے۔

۳۔ شرح قصیدۂ امالی:

۴۔ رسالہ فی اثباتِ خلافتِ معاویہ: مولانا ممدوح شیعہ کے خلاف

---

[۱] تاریخ لاہور، ص ۷۴، ۱۸۹، ۱۹۰۔

تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے جو کتابیں تصنیف کیں، ان میں یہ رسالہ بھی شامل ہے۔ اس رسالے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو صحیح ثابت کیا گیا ہے۔

۵۔ **رسالہ در ردِّ روافض**: اس کا نام "نور الابصار فی مناقب اصحاب" ہے۔ فارسی میں ہے اور تردید شیعہ میں ہے۔ خلفائے راشدین کے حالات اس میں اچھے انداز میں تحریر کیے ہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ذاکر حسین میں اور ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں محفوظ ہے۔

۶۔ **معراج نامہ**: اس میں واقعہ معراج بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ **رسالہ در عقائد**: اس رسالے میں عقائد سے متعلق تفصیلات معرضِ تحریر میں لائی گئی ہیں۔

۸۔ **رسالہ فی حرمۃ التتن**: اس رسالے میں تمباکو کی حرمت ثابت کی گئی ہے۔

۹۔ **قواعد الاحکام فی شعائر الاسلام**: حدائق الحنفیہ میں اس کا نام "رسالہ عدم فرضیتِ جمعہ" درج ہے اور صاحب نزہۃ الخواطر نے حدائق الحنفیہ کے حوالے سے اس کو "رسالہ فی عدم فرضیۃ صلوٰۃ الجمعۃ فی ھٰذہِ البلاد" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اس میں مسلکِ احناف کے مطابق دیہات میں جمعے کی عدم فرضیت پر بحث کی ہے یا یہ ثابت کیا ہے کہ دورِ غلامی میں جمعے کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، حالاں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اس میں مصنف نے مختلف اور مستند فقہی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو نمازِ جمعہ بہر حال قائم کرنی چاہیے، اس لیے کہ اس سے شعائرِ اسلامی قائم رہتے ہیں — اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

مولانا جان محمد لاہوری نے چھتّر سال عمر پائی، اور ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ (۵ نومبر ۱۸۵۱ء) کو اس دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھا۔ "چراغ دین" سے

سے سالِ وفات نکلتا ہے۔

رائے بہادر کنہیا لال نے تاریخِ لاہور میں ان کے دو بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام مولانا فیض محمد تھا، جو علومِ دینیہ کے ماہر تھے اور باپ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ دوسرے مولانا محمد فضل تھے، جو باپ کے علمی جانشین ہوئے۔ علم طب میں بھی دست گاہ رکھتے تھے۔[۲]

## ۴۴۔ سیّد جعفر علی نقوی

دیارِ ہند کے ان علمائے مشاہیر اور فقہائے عظام کی وسیع فہرست میں، جنھوں نے سید احمد شہید بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی زیرِ قیادت انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جہاد میں سرگرمی سے حصہ لیا، مولانا سید جعفر علی نقوی کا اسم گرامی بھی مرقوم ہے۔ سید جعفر علی نقوی موضع "مجھوا میر" کے رہنے والے تھے، جو یو پی کے ضلع بستی میں نیپال کی ترائی میں واقع ہے۔ والد کا نام نامی سید قطب علی تھا۔

سید جعفر علی نقوی نے جن اساتذۂ کرام سے اخذِ علم کیا، ان میں مولانا محمد اسماعیل شہید کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اپنے دور کے فحول علما میں گردانے گئے۔ مسندِ درس آراستہ کی، اور تشنگان علوم کی کثیر جماعت کو مستفید فرمایا۔ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ جس زمانے میں برصغیر میں سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل دہلوی کی مساعیِ جہاد کا چرچا تھا، یہ حصولِ علم میں مشغول تھے۔ بعد میں تمام سرگرمیوں سے دست کش ہو کر جماعت مجاہدین

---

[۲] تاریخ لاہور، ص ۴۷ ــــ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۵، ۴۷۶ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۱۶ ــــ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۰ ــــ تذکرہ علمائے پنجاب، ج ۱، ص ۱۴۳ تا ۱۴۵۔

میں شریک ہو گئے۔

سید جعفر علی کے والد سید قطب علی تھے جو اپنے علاقے کے اوسط درجے کے زمیندار تھے۔ فضیلتِ علمی اور زہد و تقویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ سید احمد بریلوی کے عقیدت مند تھے۔ سید صاحب حج سے واپس آئے تو سید قطب علی سنز؟ آدمیوں کو ساتھ لے کر رائے بریلی گئے، ان کے چھوٹے بھائی سید حسن علی بھی ساتھ تھے۔ بڑے بیٹے سید جعفر علی ان دنوں لکھنؤ میں تعلیم پا رہے تھے۔ سید صاحب نے ہجرت کا قصد فرمایا تو سید قطب علی بھی تیار ہو گئے لیکن ضعف اور کبر سنی کی وجہ سے سید صاحب نے ان کو روک دیا اور دعا کے لیے درخواست کی سید صاحب سے اس درجے محبت و عقیدت تھی کہ ان کی شہادت کی اطلاع پر بہت روئے۔ ان کے بیٹے (صاحبِ ترجمہ) سید جعفر علی نقوی بھی شریک جہاد تھے۔ بار بار کہتے تھے، کاش! میرا بیٹا جعفر علی مر جاتا اور سید صاحب زندہ رہتے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ اس سرزمین میں سید صاحب کے ہاتھوں غلبۂ اسلام دیکھنے کی آرزو تھی، وہ زندہ نہ رہے تو ہمیں بھی موت کا کوئی غم نہیں۔ سید جعفر علی نے یہ تمام واقعات اپنی کتاب منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء[۳] میں بیان کیے ہیں۔

سید قطب علی نے ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) کے لگ بھگ وفات پائی۔ نہایت متبع سنت تھے۔ وفات سے پہلے اپنے متعلقین کو جو وصیتیں کیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

---

۳۔ سید جعفر علی نقوی کی یہ ایک قلمی کتاب ہے جو سید احمد شہید کے حالات اور بالاکوٹ کے میدانِ جہاد کے واقعات کے سلسلے کی مستند دستاویز ہے۔ کتاب فارسی زبان میں ہے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ کتاب ۶۴۸ ورق کو محیط ہے۔

۱۔ ہمیشہ توحید پر قائم رہو اور اتباعِ سنت میں کبھی مداہنت نہ کرو۔
۲۔ میرے بعد کسی بدعت کا ارتکاب نہ کیا جائے، ورنہ قیامت کے دن تم سے مواخذہ کروں گا۔
۳۔ میری موت پر نوحہ نہ کیا جائے۔ نہ سوم یا کوئی اور رسم کی جائے۔

سیّد جعفر علی اسی بلند بخت باپ کے سعادت مند بیٹے تھے۔ ۱۲۱۸ھ میں مجھوا میر ضلع بستی (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی۔ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔[۴] لکھنؤ جاکر علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ سیّد احمد بریلوی اپنے رفقا کی کثیر تعداد کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کرکے سرحد پار گئے تو سیّد جعفر علی کے جذبۂ جہاد نے بھی جوش مارا، اور انتیس رفقا کے ساتھ وطن سے روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے انھوں نے سیّد احمد بریلوی کو دیکھا تو نہیں تھا، البتہ ان کے بارے میں سنا بہت کچھ تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان سے سرحد پار کا سفر نہایت تکلیف دہ اور صبر آزما تھا۔ مختلف شہروں اور قصبوں سے گزرتے ہوئے وطن سے دہلی پہنچے۔ وہاں حضرت شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب (دونوں بھائیوں) سے ملاقات ہوئی، انھوں نے مجاہدین کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں[۵] کئی روز دہلی میں مقیم رہے اور مجاہدین کے لیے کچھ سامان لے کر اگلی منزل کو روانہ ہوئے۔ سونی پت اور پانی پت سے ہوتے ہوئے انبالہ پہنچے۔ ان کے ایک رفیقِ سفر کا نام منصور خاں تھا۔

انبالہ پہنچ کر وہاں کے ایک رئیس شمس الدین سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا مقصد اگلے سفر کے لیے محفوظ اور مناسب راستہ دریافت کرنا تھا۔ اس وقت

---

[۴] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۱۹۔
[۵] منظورۃ السعدا، ورق ۶۳۰۔

شمس الدین شطرنج کھیل رہا تھا۔ سید جعفر علی کی ظاہری حالت دیکھ کر وہ سمجھا کہ کوئی اَن پڑھ آدمی ہے۔ سید صاحب نے کہا، "شطرنج کھیلنا جائز نہیں"
شمس الدین نے جواب دیا۔ "امام شافعی کے نزدیک جائز ہے"۔ سید صاحب نے فرمایا، "چاروں ائمۂ فقہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ امام شافعی پہلے جواز کے قائل تھے، پھر اس سے رجوع کر لیا تھا"۔ شمس الدین نے سوال کیا۔ "تم حنفی ہو یا شافعی"؟

فرمایا۔ "آپ کو اس سے کیا غرض، مَیں نے صحیح مسئلہ بیان کر دیا ہے"۔ شمس الدین نے خفگی سے کہا۔ "میرے مکان سے نکل جاؤ"۔ کہا۔ "بہت اچھا، نکل جاتا ہوں، مَیں نے آپ کی خیر خواہی سے ایک شرعی مسئلہ بتایا ہے"[۶]۔

اس کے بعد سید جعفر علی مکان سے باہر نکل گئے۔ دوسرے دن مسجد میں شمس الدین سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ ان کا رفیق سفر منصور خاں بھی موجود تھا جو بہت وجیہ اور بارعب آدمی تھا۔ اس نے شمس الدین سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سید جعفر علی سے بات کیجیے"۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہوا، اپنے پہلے طرزِ عمل کی معافی مانگی۔ اگلے سفر کے لیے بات ہوئی تو کافی غور کرنے کے بعد مشورہ دیا کہ پٹیالہ، مالیر کوٹلہ، جگراؤں اور ممدوٹ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے قافلے کے ساتھ اسی راستے پر گام فرسا ہوئے[۷]۔

ممدوٹ مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ اس کا والی اس زمانے میں نواب قطب الدین خاں تھا۔ یہاں پہنچے تو نواب کے بھائی شمس الدین خاں کی معرفت اس سے دریائے ستلج عبور کرنے میں مدد کی درخواست کی۔ تیسرے دن نواب سے ملاقات ہوئی، اس نے خود تو کوئی جواب نہیں دیا، خاموش رہا، البتہ بعض لوگوں نے بتایا کہ نواب کو سکھوں کی حکومت سے خطرہ ہے۔ آپ

---

[۶] منظورۃ السعدا، ورق ۱۳۱-۶۔ [۷] ایضاً

کی مدد کرے گا تو سکھ ناراض ہو جائیں گے اور اس کے لیے ایک مصیبت پیدا ہو جائے گی۔[۸]

بہر حال نواب قطب الدین خاں والیٔ ممدوٹ نے ان کی کوئی مدد نہیں کی، اور وہ بہاول پور کو روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک مقام "حاصل ساڈو" پڑا، جو موجودہ جغرافیائی حساب سے ہیڈ سلیمان کی کے قریب ہے۔ وہاں ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب، ہندوستان) کے موضع "لکھوکے" کے نامور فقیہ اور ممتاز عالم حافظ بارک اللہ لکھوی سے ملاقات ہوئی، جن کو نواب قطب الدین خان نے ریاست بدر کر دیا تھا، اور وہ ریاست بہاول پور کے موضع "حاصل ساڈو" میں جا بیٹھے تھے۔[۹]

حافظ بارک اللہ کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے، سید جعفر علی نقوی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں اور انھیں ایک مشفق بزرگ قرار دیتے ہیں۔

ممدوٹ سے چل کر سید جعفر علی بہاول پور پہنچے۔ وہاں مولانا عبدالحی بڑھانوی کے ایک شاگرد مولانا محمد کامل مقیم تھے، جن کو ریاست کی حکومت کی طرف سے ہندوستانی علما سے محض اس بنا پر ملاقات کی ممانعت کر دی گئی تھی کہ حیاتِ انبیا کے مسئلے میں وہ بہاول پور کے عام علما سے اختلافِ رائے رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ انبیا و صلحا یقیناً اللہ کے نزدیک زندہ ہیں، لیکن ان کے لیے حیاتِ دنیا ثابت کرنا محال ہے۔ سید جعفر علی کی اتفاقاً ان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کے بیٹے مولانا محمد اکمل سے بھی ملاقات ہوئی۔[۱۰]

یہ واقعات سید جعفر علی نقوی کی کتاب "منظورۃ السعدا فی احوال الغزاۃ

---

[۸] منظورۃ السعدا، ورق ۶۳۳، ۶۳۴۔

[۹] ایضاً ورق ۶۳۴ الف۔

[۱۰] ایضاً ورق ۶۳۴ ب۔

والشہداء" میں مرقوم ہیں۔ اس کتاب میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بہاول پور کے ہر مقام میں گیارھویں اور دیگر بدعات کا دور دورہ تھا، لیکن پڑھے لکھے لوگ مولانا محمد کامل کا نام احترام سے لیتے تھے۔ حالاں کہ وہ ان چیزوں کے خلاف تھے۔[۱۱]

بہاول پور میں اس زمانے میں شعائر اسلامی کو خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بہاول پور سے آگے "نور پور" میں ان کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی، جس کی داڑھی مونچھیں ریاست کے وزیر نے اس لیے منڈوا دی تھیں کہ وہ اتباعِ سنت پر زور دیتا تھا۔[۱۲]

بہاول پور سے روانہ ہو کر مجاہدین کا یہ قافلہ تونسہ کے مقام پر پہنچا۔ وہاں ان کی ملاقات شیخ خواجہ سلیمان تونسوی سے ہوئی۔ خواجہ صاحب سے آگے کے سفر کے بارے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے راستے کی مشکلات بیان کیں اور قرآن کی یہ آیت پڑھی: وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ[۱۳]

---

[۱۱] منظورۃ السعدا۔ ورق ۶۳۴ الف، ب۔

[۱۲] ایضاً، ورق ۶۳۴ ب

[۱۳] یہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۵ ہے اور پوری آیت اس طرح ہے:
وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اور نیکی کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

خواجہ سلیمان تونسوی مرحوم نے خدا جانے یہ آیت سفرِ جہاد سے رُک جانے کے سلسلے میں کیوں پڑھی، حالاں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جہاد میں مال خرچ کرو، اس کے لیے کوشش کرو، اور جہاد کو چھوڑ کر گھر میں نہ بیٹھ رہو، ترکِ جہاد سے تم میں ضعف اور جبن آجائے گا، تم پر دشمن غلبہ پالیں گے اور یہ صورتِ حال تمھاری ہلاکت کا باعث بن جائے گی۔ یعنی جہاد کو چھوڑ دینا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دینا ہے، نہ کہ جہاد میں جانا۔ (تفسیر

سید جعفر علی فرماتے ہیں، میں نے ان سے کہا۔ میں اس آیت کا مطلب خوب سمجھتا ہوں، یہ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے متعلق ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔[۱۴]

بہرحال مجاہدین فی سبیل اللہ کا انتیس[۲۹] افراد پر مشتمل یہ قافلہ سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتا اور پُرپیچ راستوں سے گزرتا ہوا، ۹ رمضان المبارک ۱۲۴۵ھ (۴ مارچ ۱۸۳۰ء) کو پنجتار پہنچا۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید اس وقت امب کے مقام میں قیام پذیر تھے۔ پنجتار سے چل کر یہ لوگ ستھانہ پہنچے۔ اس دن امیر المجاہدین بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ روزہ افطار کیا، مسجد میں گئے، مغرب کی نماز امیر المجاہدین سید احمد بریلوی کی اقتدا میں ادا کی اور پہلی مرتبہ ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

وہاں پہنچ کر جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف ہو گئے کہ اتنے طویل اور دشوار گزار سفر کا اصل اور بنیادی مقصد یہی تھا۔ سوا سال وہاں قیام رہا۔

۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو بالاکوٹ کے مقام میں سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل دہلوی کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد مولانا ولی محمد پھلتی کو امیر المجاہدین بنایا گیا، اس لیے کہ جماعتِ مجاہدین میں اب ان ہی کو سب سے زیادہ معزز اور بزرگ مانا جاتا تھا۔ سید جعفر علی ان سے اجازت لے کر ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ (۸ جون ۱۸۳۱ء) کو، واقعۂ بالاکوٹ سے ایک مہینہ تین دن بعد وہاں سے واپس وطن روانہ ہوئے۔ مجاہدین میں سے چند اور احباب بھی ان کے ہمراہ تھے۔

مراجعتِ وطن کے وقت سید جعفر علی نے مولانا ولی محمد پھلتی کی اجازت سے سامانِ سفر میں ایک قلم دان، ایک قینچی، سید احمد شہید کے چند خطوط جن پر ان کے

---

[۱۴] منظورۃ السعداء، ورق ۲۳۷ الف۔

دستخط اور مہریں ثبت تھیں اور مولانا اسماعیل شہید کی چند تحریریں شامل کر لی تھیں۔ یہ سب چیزیں راستے میں چوری ہو گئیں۔ تلاشِ بسیار اور کوشش کے باوجود ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل نہ ہو سکی [۱۵]

واپسی پر وہ راولپنڈی، رہتاس، کھاریاں، لاہور، امرتسر، جالندھر، لدھیانہ اور پھلور سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ اثنائے سفر میں جو واقعات پیش آئے، وہ انھوں نے اپنی کتاب منظورۃ السعداء میں بیان کیے ہیں۔ ان میں بعض واقعات بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

کھاریاں (ضلع گجرات، پنجاب) پہنچے تو بخار میں مبتلا ہو گئے اور بخار نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ سرسام ہو گیا۔ وہاں کے ایک رئیس نے نہایت توجہ اور اہتمام سے علاج کرایا، بہت خدمت کی اور صحت یاب ہو گئے [۱۶]

رقم فرماتے ہیں کہ پنجاب کی سکھ حکومت میں مسلمان بہت زبوں حالی کا شکار تھے۔ اقامت کی طرح "بہ خفضِ صوت" (آہستہ آواز میں) اذان کہتے تھے۔ ان کی آزردگی اور خستگی کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے تھے کہ اس ملک سے جلد باہر لے جائے [۱۷]

جالندھر کے دورانِ قیام کا یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ میں جس مسجد میں مقیم تھا، ایک رات عشا کے بعد وہاں سویا ہوا تھا کہ محسوس ہوا، کوئی آدمی میرے بدن کو چھو رہا ہے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک شخص میرے پاؤں داب رہا ہے۔ میں اسے دیکھ کر متعجب ہوا، اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ روپے پیش کیے۔

---

[۱۵] منظورۃ السعدا، ورق ۱۰۶ الف، ب۔

[۱۶] ایضاً ورق ۱۰۴ ب

[۱۷] ایضاً ورق ۱۰۵ الف۔

میں نے پوچھا، "یہ کیوں؟" اس نے بتایا کہ "میں صنعت و حرفت کرتا ہوں۔ اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔ بیوی بچے نہیں ہیں، جو کچھ کماتا ہوں، اس میں سے خرچ کرنے کے بعد اچھی خاصی رقم بچ جاتی ہے۔ وہ رقم مسافروں پر صرف کر دیتا ہوں۔"[۱۸]

امرتسر، جالندھر، لدھیانہ اور پھلور کے بعض علاقوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں اذان بھی برملا کہی جاتی تھی اور گئو کشی بھی عام ہوتی تھی۔

لدھیانہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ جس مسجد میں قیام کیا، اس مسجد کا امام مجاہدین کو کافر قرار دیتا تھا۔ میری شکل و صورت اور وضع قطع دیکھ کر برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کو سید احمد شہید اور معرکۂ بالا کوٹ کے بعض چشم دید واقعات بتائے۔ ایک شخص کا نام ملا شکور تھا، وہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا "نمک حرام ہمارے ملک پر قابض ہو گئے ہیں، چلو، ہمارے ساتھ ہو کر ہمارا حق دلاؤ۔" سید جعفر علی لکھتے ہیں: میں نے اس کو جواب دیا۔ "ہم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے گئے تھے، کسی بادشاہ یا مدعیِ حکومت کے حق کے لیے نہیں گئے تھے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید کا کسی نے حق نہیں غصب کیا تھا۔" ملا شکور نے کہا، "یہ تو بہت اونچا مرتبہ ہے، مگر حق دار کا حق دلانا بھی تو باعثِ اجر ہے۔"[۱۹]

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ لدھیانہ کے معززین ان سے بہت تعظیم سے پیش آنے لگے۔ ان کی باتیں سن کر لوگوں نے کہا "یہ تو عالم آدمی ہیں۔" وہ احترام سے مصافحہ کرتے، اچھی جگہ بٹھاتے اور عمدہ کھانا کھلاتے، قسم قسم کے آم پیش کرتے۔ ان لوگوں نے سید جعفر علی کو سات دن وہاں ٹھہرائے رکھا اور

---

۱۸؎ منظورۃ السعدا۔ ورق ۶۰۵ ب

۱۹؎ ایضاً۔ ورق ۶۰۱ الف تا ۶۰۸ ب

بہت عزت و اکرام کا برتاؤ کیا۔[20]

لدھیانہ سے سید جعفر علی انبالہ، کرنال اور پانی پت ہوتے ہوئے دہلی پہنچے اور مختلف لوگوں سے ملاقات کی۔ سب نے جہاد کے واقعات اور میدانِ جنگ کے حالات پوچھے۔ سید احمد شہید، مولانا اسماعیل اور ان کے رفقا کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ اور پھر اپنے وطن "مجھوا میر" پہنچے۔[21]

جہادِ بالاکوٹ سے واپسی کے بعد سید جعفر علی نقوی نے دو اہم خدمات انجام دیں۔

ایک یہ کہ اپنے گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر بمقام "کرھی" ایک دینی مدرسہ "ہدایت المسلمین" کے نام سے قائم کیا۔ اس مدرسے میں انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بے شمار علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔ کہتے ہیں، یہ مدرسہ اب تک قائم ہے اور تعلیم و تعلّم کا سلسلہ باقاعدہ طور پر جاری ہے۔

دوسرے یہ کہ سید احمد شہید اور جماعتِ مجاہدین کے حالات میں ایک مفصل کتاب فارسی زبان میں لکھی، جس کا نام "منظورۃ السعدا فی احوال الغزاۃ والشہداء" ہے۔ اس کتاب کا دوسرا نام "تاریخ احمدی" ہے۔ یہ کتاب مستند قیمتی معلومات کا خزانہ ہے۔ لیکن افسوس ہے، ابھی تک چھپی نہیں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

سید جعفر علی نقوی نے رمضان المبارک ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کو اپنے گاؤں (مجھوا میر) میں وفات پائی۔ ان کی تاریخِ ولادت ۱۲۱۸ھ ہے۔ اس حساب سے ستر برس کی عمر ہوئی۔

---

[20] منظورۃ السعدا، ورق ۶۰۸ ب۔

[21] نیز دیکھیے جماعت مجاہدین ص ۱۹۳ تا ۲۱۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۱۹

وفات سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک شان دار جگہ ہے جہاں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید بریلوی، شاہ اسماعیل شہید دہلوی اور کچھ دوسرے حضرات کرسیوں پر تشریف فرما ہیں۔ ایک کرسی خالی ہے۔ کسی نے پوچھا "یہ کرسی کس کے لیے ہے"؟ جواب ملا، "جعفر علی کے لیے"!

سید جعفر علی کی صرف ایک صاحب زادی تھیں، جن کا نام بی بی زینب تھا۔

## ۴۵۔ سید جلال الدین احمد بنارسی

سرزمین بنارس میں جن علمائے کرام نے تیرھویں صدی ہجری میں جنم لیا، ان میں مولانا سید جلال الدین احمد بنارسی کا اسمِ گرامی لائقِ تذکرہ ہے۔ ان کا مختصر شجرۂ نسب یہ ہے۔ جلال الدین بن عبدالاعلیٰ بن کریم اللہ بن ظہور محمد ہاشمی جعفری بنارسی۔!

مولانا ممدوح ۱۲۱۹ھ یا ۱۲۲۱ھ کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی مولانا عبدالاعلیٰ بنارسی (متوفی ۱۲۷۴ھ) مولانا احمد اللہ انامی بنارسی اور مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی سے تحصیلِ علم کی۔ اس زمانے میں درسِ حدیث میں مولانا عبدالحق نیوتنی بنارسی (متوفی ۸ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ) کا شہرہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیا اور سندِ حدیث حاصل کی۔ پھر اسنادِ حدیث سے اس درجے متاثر ہوئے کہ ترکِ تقلید اور نصوصِ کتاب و سنت پر عمل میں ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ علومِ متداولہ اور فنونِ متعارفہ پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔

اپنے دَور کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فقیہ تھے۔ حامل حدیث اور متبع سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھے، نہایت قانع اور متقی تھے۔ ان کی قوتِ حافظہ اس قدر تیز تھی کہ رمضان المبارک میں قرآن مجید کا ایک پارہ اسی دن میں یاد کر کے رات کو نمازِ تراویح میں سنا دیتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے بہترین الفاظ

میں ان کے اوصافِ بوقلموں کا ذکر کیا ہے۔

پہلے غازی پور میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے اور نہایت قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے بعد غازی پور سے بنارس کالج میں فرائضِ تدریس ادا کرنے پر مامور ہوئے، عمر بھر وہیں رہے اور تمام زندگی شائقین کو مختلف علوم و فنون سے بہرہ ور کرتے رہے۔ بنارس کالج کے زمانۂ معلمی میں بہت سے انگریزوں نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ وائسرائے ہند ان کے علم و فضل کی وجہ سے نہایت احترام سے پیش آتا تھا۔

نصوصِ کتاب و سنت پر خود بھی عمل پیرا تھے اور لوگوں کو بھی یہی تلقین کرتے۔ اسلوبِ تبلیغ انتہائی موثر اور دھیما تھا۔ تواضع، انکساری اور نرمیِ گفتار ان کے خاص اوصاف تھے۔ سختی اور شدت سے ہمیشہ گریزاں رہے۔

مولانا خرم علی بلہوری جب مسلکِ اہلِ حدیث سے وابستہ نہیں ہوئے تھے، امام کے پیچھے نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی شدید مخالفت کرتے تھے، اس زمانے میں مولانا جلال الدین احمد بنارسی سے اس مسئلے پر ان کا مناظرہ بھی ہوا تھا، اور علمی حلقوں میں اس مناظرے کی بڑی شہرت ہوئی تھی۔

متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے اور نہجِ تحریر مدلّل اور زور دار تھا۔ ان کی چند تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ فاتحۃ الصواب فی قرأۃ فاتحۃ الکتاب: یہ کتاب فارسی میں ہے ۱۲۵۶ھ میں تصنیف کی۔

۲۔ زبدۃ الالباب: یہ اردو زبان میں "فاتحۃ الصواب فی قرأۃ فاتحۃ الکتاب" کا خلاصہ ہے۔

۳۔ زبدۃ القوانین: یہ کتاب صرف و نحو کے قواعد و اصول سے متعلق ہے۔

۴۔ انبساط عبارۃ الکافیہ بالبیان الشافیہ: یہ علمِ نحو کی چھوٹی کی کتاب

"کافیہ" کی شرح ہے، افسوس ہے ناتمام رہی۔

۵۔ قواعدِ اردو: اردو زبان کے بعض قواعد کے بارے میں ہے، لیکن مکمل اسے بھی نہیں کر پائے۔

۶۔ ایک کتاب قواعدِ لغت سے متعلق ہے۔

۷۔ فرہنگِ اخوان الصفا۔

مولانا سید جلال الدین احمد ہاشمی جعفری بنارسی نے اٹھاون سال عمر پائی اور ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) میں اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رخصت ہوئے۔[۲۲]

## ۴۶۔ منشی جمال الدین صدیقی دہلوی

منشی جمال الدین صدیقی تیرھویں صدی ہجری کے عالم و فاضل اور صاحبِ خیر و صلاح بزرگ تھے۔ والد کا نام وحید الدین، دادا کا محی الدین اور پردادا کا شیخ حسام الدین تھا۔ سلسلۂ نسب، فقیہِ نامدار حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ اس خاندان کے تمام ارکان، اصحاب علم و فضیلت تھے۔

شیخ حسام الدین کے دادا شیخ جلال الدین تھے، جو اپنے عصر کے علمائے کرام میں خاص شہرت و ناموری کے مالک تھے۔ وہ یوپی کے ضلع سہارن پور میں ایک مقام "بوریہ" میں اقامت پذیر تھے۔ وہاں سکھوں کا دستِ ستم دراز ہوا تو ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور دہلی سے بہ جانبِ شمال تیس میل کے

---

۲۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۲۰ — تذکرہ مشائخ بنارس ص ۶۶، ۶۷ — تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۳۴۵، ۳۴۶ — اردو ترجمہ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۴۸۔

فاصلے پر قصبہ "کوتانہ" میں بود و باش اختیار کرلی۔

کوتانہ ہی میں ۱۲۱۷ھ میں منشی جمال الدین پیدا ہوئے، جنھوں نے فضل و عرفان کے ماحول میں پرورش پائی۔ سنِ بلوغت کو پہنچے تو حصولِ علم کی غرض سے دہلی کا قصد کیا۔ دہلی میں منشی جمال الدین کا ایک معزز گھرانے کی خاتون سے رابطہ پیدا ہوگیا، جو اُن کی والدہ سے معرفت و شناسائی رکھتی تھیں، اس خاتون نے ان کا تیس روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کردیا۔

دہلی کو اس زمانے میں مہدِ فضل و کمال اور گہوارۂ علم و عرفان کا درجہ حاصل تھا۔ علما کی کثیر جماعت اس شہر میں فروکش تھی اور ہر عالم بوقلموں اوصاف و کمالات کا حامل تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی، شاہ عبدالقادر دہلوی، مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، شیخ محمد یعقوب دہلوی، مولانا مملوک علی نانوتوی، شاہ غلام علی علوی، مولانا محمد آفاق نقشبندی، اور دیگر متعدد حضرات کا سلسلۂ علم و فیض جاری تھا، وہ ان سب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی نہ کسی طریقے سے سب سے استفادہ و استفاضہ کیا۔ ابتدا میں تحصیل علم کے لیے مولانا مملوک علی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ اس زمانے میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مجالسِ وعظ و ارشاد بھی شہر کے مختلف حصوں میں منعقد ہوتی تھیں، ان میں بھی باقاعدہ شرکت کرتے اور شاہ صاحب سے مستفید ہوتے رہے۔

منشی ممدوح کا یہ عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے، وہاں مختلف لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ رفتہ رفتہ شطرنج کی محفلیں جمنے لگیں اور تعلیم و تعلم اور مجالسِ وعظ میں شرکت کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ اتفاق سے وہ خاتون جو تیس روپے ماہانہ ادا کرتی تھیں، انتقال کر گئیں اور پھر خود بھی بیمار پڑ گئے۔ یارانِ محفل نے جب ان کو مفلوک الحال اور علیل بلکہ قابلِ امداد دیکھا تو کنارہ کشی اختیار کرلی اور یہ تنہا اور بے سہارا رہ گئے۔

ادھر شاہ عبدالعزیز کا یہ حال تھا کہ ان کو ہر مجلسِ وعظ میں دیکھتے اور ان کی باقاعدہ حاضری اور دلچسپی سے خوش ہوتے تھے، اور اسی وجہ سے ان سے بہت شناسا بلکہ مانوس ہو گئے تھے۔ اب دفعتاً ان کو غیر حاضر پایا تو پریشان ہوئے اور ان کی تلاش شروع ہوئی۔ خبرِ علالت سنی تو عیادت کے لیے گھر پر گئے، تسلی دی، دعا فرمائی اور ضروریات کے لیے پوچھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ شاہ صاحب کے اس بے پناہ ایثار اور دل جوئی سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ شطرنج وغیرہ کا سلسلہ ختم کیا، از سرِ نو تحصیلِ علم میں مصروف ہوئے اور آئندہ کے لیے پابندِ سنت رہنے کا تہیہ کیا۔ اوپر جن علمائے عظام کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے مستفید ہوئے اور تکمیل تعلیم کی۔

منشی جمال الدین صدیقی کو شعر وسخن سے بھی لگاؤ تھا اور اس زمانے کی دہلی میں شعرا کی ایک بڑی جماعت موجود تھی، ان میں سے حکیم مومن خاں مومن (متوفی ۱۲۶۲ھ) محمد ابراہیم ذوق (متوفی ۲۳ صفر ۱۲۷۱ھ) اور امام بخش صہبائی (شہید ۱۲۷۳ھ) سے ان کے مراسم پیدا ہوئے، اور ان کی بزم شعر وسخن میں شریک رہے۔ اس عہد کے دیگر شعرائے دہلی اور سخنورانِ لکھنؤ کے مشاعروں میں بھی ان کو شرکت کے مواقع میسر آتے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد تلاشِ معاش کے سلسلے میں اندور پہنچے، اور ریذیڈنٹ اندور کے دفتر میں پندرہ یا بیس روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد بھوپال کا ارادہ کیا جو ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے مشہور تھی۔ اس وقت بھوپال کے منصبِ حکومت پر نواب سکندر بیگم فائز تھیں۔ بھوپال میں ایک نامور شخصیت مولوی اسلام اللہ خاں تھے، ان کے نام حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کا سفارشی خط لیا۔ خط لے کر بھوپال آئے، اس وقت اُن کی عمر تیس برس کی تھی۔ مولوی اسلام اللہ خاں کو خط پیش کیا تو انھوں نے اپنی ایک عرضی کے ساتھ ان کو نواب قدسیہ بیگم کے پاس بھیج دیا۔

قدسیہ بیگم نے ان کو غیر ملکی قرار دے کر ریاست میں کوئی ملازمت دینے سے انکار کر دیا۔ مولوی اسلام اللہ خاں کی خدمت میں دوبارہ آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے ایک دوسری عرض داشت کے ساتھ بھوپال کی رئیسۂ معظمہ نواب سکندر بیگم کے دربار میں بھیجا اور اپنی عرض داشت میں یہ فقرہ بھی لکھا کہ "جمال الدین ایک ایسی تلوار ہے جو بھوپال سے لندن تک کاٹ کرے گی"۔ اس فقرے سے وہ خاص طور پر متاثر ہوئیں اور ان کو فوراً ملازمت دے دی۔ ابتدا میں وہ ایک معمولی خدمت پر مامور ہوئے تھے، لیکن اپنی حسنِ مساعی اور اعلیٰ اوصاف کی وجہ سے ۱۲۶۳ھ میں لالہ خوش وقت رائے کے انتقال کے بعد نائب اوّل کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے۔

منشی جمال الدین صدیقی نہایت دیانت دار، باہمت، صاحب عزم اور شریف الطبع آدمی تھے۔ انتہائی منتظم اور مدبر بھی تھے۔ بہ درجۂ غایت نیک اور متقی تھے۔ ان کے اوصافِ بوقلموں سے متاثر ہو کر ملکۂ بھوپال سکندر بیگم نے ۱۲۶۳ھ میں ان سے نکاحِ ثانی کر لیا اور ان کو ریاست کا مدار المہام مقرر کیا۔ ریاست کے تمام اہم معاملات کو وہ طے کرنے کے مجاز تھے۔ خان بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور تمغۂ طلائی عطا کیا گیا۔ روس اور ترکی کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو انھوں نے سلطان ترکی عبدالحمید خاں غازی کی خدمت میں کافی رقم ارسال کی تھی، اس بنا پر سلطان ممدوح نے ان کو تمغۂ مجیدی درجۂ سوم سے نوازا۔

اپنے زمانے اور علاقے کے ذی شان بزرگ تھے اور نامور علما میں گردانے جاتے تھے۔ متحمل مزاج، سخی و جواد، متواضع، کثیر العبادت، عارف و عابد اور صاحب صدق و خلوص تھے۔ یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور مسکینوں کی بے حد مالی مدد کرتے تھے۔ باجماعت نماز ادا کرتے اور زیادہ وقت مساجد میں مصروفِ عبادت رہتے۔ ان کے دروازے پر کوئی دربان اور حاجب نہ تھا۔ ہر شخص ہر

وقت ان کے سامنے اپنی حاجت بیان کر سکتا تھا۔ بہت خوش شکل اور خوب سیرت تھے۔

ان میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اتنے بڑے اعزاز کے مالک ہونے کے باوجود طلبا کو باقاعدہ قرآن، حدیث اور کتبِ فقہ کا درس دیتے تھے۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور کتاب و سنت کی نشر و اشاعت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید خرید کر مستحقین میں تقسیم کرتے، تاکہ لوگ قرآن کی تلاوت کریں اور اس کے احکام و اوامر سے بہرہ مند ہوں۔ قرآن مجید کے فارسی اور ترکی تراجم و تفاسیر خطیر رقم خرچ کر کے انھیں شائع کرانے اور پھر انھیں ترکستان اور افغانستان میں کثیر تعداد میں تقسیم کرنے کا اہتمام کیا۔

شیخ علی بن احمد مہائمی (متوفی ۲۸ جمادی الاخری ۸۳۵ھ) کی تفسیر رحمانی چار جلدوں میں اپنے خرچ پر مصر سے شائع کرائی۔ ۱۲۸۵ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ مع ان کی ایک دوسری تصنیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء کے مطبع صدیقی بریلی سے طبع کرائی۔ علاوہ ازیں اپنے نفقۂ خاص سے بہت سی اہم کتابیں قاہرہ میں چھپوائیں اور مستحقینِ علم میں تقسیم کیں۔

مدار المہام منشی جمال الدین خان بہادر مصنف بھی تھے۔ ”کوکب دری“ کے نام سے انھوں نے قرآن مجید کا فرہنگ لکھا اور اس میں بڑی محنت کی۔

ان کی ایک بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ بھوپال میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں اور بہت سے اسلامی و دینی مدرسے قائم کیے۔ ان میں جو خطیب، امام، مؤذن اور مدرس مقرر کیے، ان کی تنخواہیں خود ادا کرتے اور طلبائے علم کو معقول وظیفے عنایت فرماتے۔ مسافروں کے لیے شہر میں سرائیں بنوائیں۔ تعلیم و تدریس میں خاص طور سے دلچسپی لیتے اور خود بھی طلبا کو مختلف علوم کی کتابوں کا

درس دیتے تھے۔ ان کے عہدِ مدار المہامی میں بھوپال کو ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی ریاست کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، اور یہ سب ان کی اور ان کے بعد نواب سید محمد صدیق حسن خاں کی مساعیِ جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ ان آثارِ حسنہ کی جھلک اب تک خطۂ بھوپال میں باقی ہے اور لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

اس قسم کے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے جو خدمتِ دین، اشاعتِ اسلام اور عوام کی فلاح و بہبود کو اپنا وظیفۂ حیات قرار دے لیتے ہیں۔

رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو ان کے خیرات و حسنات کا دروازہ اور کھل جاتا اور صدقات کی تقسیم اور افطاریوں کا سلسلہ وسیع تر ہو جاتا۔

مدار المہام منشی جمال الدین صدیقی نے دو مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ پہلا حج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے کیا۔ اس حج میں ان کی صاحبزادی زکیہ بیگم (جو بعد میں حضرت نواب سید محمد صدیق حسن خاں کے عقد میں آئیں) ان کے ساتھ تھیں۔ دوسرا حج ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں بھوپال کی رئیسہ معظمہ نواب سکندر بیگم صاحبہ کی معیت میں کیا۔

یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک کا نام رحیمی بیگم تھا اور دوسری کا زکیہ بیگم۔ زکیہ بیگم قضائے الٰہی سے بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کا نکاح ثانی انھوں نے ۲۵ شعبان ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) میں نواب سید محمد صدیق حسن خاں سے کر دیا تھا۔ نکاح حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے شاگرد اور داماد مولانا عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی بڑھانوی (متوفی ۱۲۹۹ھ) نے پڑھایا تھا۔

غرض منشی جمال الدین صدیقی اپنے عہد کے عالم و فاضل اور فقیہ عمدہ خصال تھے۔ ۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) کو شب کے گیارہ بجے فوت ہوئے۔

نمازِ جنازہ نواب سید محمد صدیق حسن خاں نے پڑھائی اور کثیر جماعت نے اس میں شرکت کی۔ اس کے بعد بہت بڑی تعداد میں اور لوگ بھی آ گئے، تو دوسری مرتبہ شیخ حسین عرب نے جنازہ پڑھایا۔ لیکن لوگوں کی تعداد برابر بڑھتی

رہی اور بار بار نماز جنازہ پڑھی گئی — اور بار بار نمازِ جنازہ پڑھی جاتی رہی اس طرح گیارہ مرتبہ جنازہ پڑھا گیا۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وادخلہ الجنۃ [۲۳]

## ۴۷۔ مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی

برصغیر پاک وہند میں گزشتہ تین سو سال سے لکھنؤ کے علمائے فرنگی محلی کو علم و فضل کی دنیا میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ درس و تدریس تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ اور وعظ و ارشاد میں ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا، ان کی متنوع خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہر میدان میں ان کی حیثیتِ علمی کا اہلِ علم نے کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ ان علمائے عالی قدر میں ایک معروف عالمِ دین مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی تھے، والدِ ماجد کا اسمِ گرامی شیخ علاء الدین انصاری لکھنوی (متوفی ۱۰ شوال ۱۲۴۲ھ) اور جدِ امجد کا نام نامی مولانا انوار الحق انصاری (متوفی ۲۶ شعبان ۱۲۳۶ھ) تھا۔ یہ اور ان سے اوپر اس خاندان کے تمام ارکان اصحابِ فضل و کمال تھے۔

مولانا ممدوح کا پایہ تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستانی فقہا و علمائے حنفیہ میں بہت اونچا ہے۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اپنے عمِ محترم مولانا نور الحق انصاری لکھنوی (متوفی ۲۳ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ) سے کسبِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مدراس گئے اور وہاں کے مدرسہ والا جاہیہ میں منصب تدریس پر فائز ہوئے۔ اس سے قبل ان کے والدِ گرامی اس منصب پر متعین تھے اور ملک العلما کے خطاب سے سرفراز تھے۔

---

[۲۳] حالات کے لیے دیکھیے مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والاجاہی، ج ۲ ص ۴۳ تا ۵۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۲۲، ۱۲۳ — انحاف النبلا ص ۱۷۔

خلافیاتِ فقہی سے متعلق مولانا جمال الدین انصاری کا مطالعہ وسیع اور گہرا تھا۔ اپنے عہد کے بہت بڑے مناظر اور بحاث تھے۔ مخالفوں کی شدید مخالفت کرتے اور اس میں کسی کی کوئی رعایت نہ فرماتے۔ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "تقویۃ الایمان" کے بعض مقامات پر سخت تنقید کرتے اور اس میں اتنا آگے نکل جاتے کہ ان کی برملا تکفیر و تضلیل کرتے، جو شخص "تقویۃ الایمان" کی تحسین کرتا یا مولانا محمد اسماعیل شہید کا دفاع کرتا اسے بھی کافر قرار دیتے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ لائقِ تذکرہ ہے کہ اس زمانے میں ایک عالم کبیر اور محدثِ جلیل مولانا محمد علی رام پوری (متوفی ۱۲۵۸ھ) مدراس میں قیام پذیر تھے اور ارشاد و موعظت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ بہت موثر وعظ کہتے تھے اور لوگ ان کے دلدادہ تھے۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدت مند تھے اور ان سے اخذِ طریقت کیا تھا۔ اپنے مواعظ میں وہ تقویۃ الایمان کے حوالے بھی دیتے۔ حضرت مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی اس سلسلے میں ان کے اس درجے شدید مخالف ہوئے کہ انھیں مدراس کی سکونت ترک کرنا پڑی۔

بہر حال مولانا جمال الدین انصاری لکھنوی اپنے عصر میں برصغیر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فقیہ تھے۔ علمِ فقہ کے تمام گوشوں پر ان کی نظر تھی اور مسائلِ فقہیہ کی تبیین و توضیح میں ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔

اس فقیہ نام دار نے ۸ ربیع الثانی ۱۲۷۶ھ کو مدراس میں وفات پائی اور مقبرہ والاجاہیہ میں مدفون ہوئے۔[۲۴]

## ۴۸- قاضی جمال الدین کشمیری

تیرھویں صدی ہجری کے علمائے کشمیر میں قاضی جمال الدین کشمیری کو

---

[۲۴] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۲۱، ۱۲۲ ـــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۳ ـــ احوالِ علمائے فرنگی محل ص ۲۳، ۲۴۔

بہت اہمیت و ناموری حاصل ہے۔ وہ اپنے زمانے اور علاقے کے مشہور شیخ اور ممتاز فقیہ تھے۔ دیارِ کشمیر کے نامور فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وادیٔ کشمیر کے معروف عالم و فقیہ مفتی قوام الدین کشمیری (متوفی ۹ ذی قعدہ ۱۲۱۹ھ) سے کسبِ علم کیا اور فقہ و اصول کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ تصوف و طریقت کے لیے شیخ فضل اللہ نوری کے بابِ عالی پر دستک دی اور ان کے حلقۂ سلوک میں شریک ہوئے۔ جب علومِ ظاہری و باطنی میں مہارت پیدا ہوگئی اور خاص مرتبہ و مقام حاصل کر لیا تو مسندِ درس آراستہ کی اور خدمتِ علم میں مشغول ہوگئے۔

گزشتہ صدی میں کشمیر کے جن علما و فقہا نے فہم و فراست کے لحاظ سے شہرتِ دوام حاصل کی ان میں قاضی جمال الدین کا اسمِ گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہے۔ وہ بے شمار اوصاف کے حامل تھے اور ان کی ذات مرجع خلائق تھی۔ ان سے خلقِ کثیر نے فیض پایا اور بے شمار اربابِ علم نے استفادہ کیا۔ کشمیر کے فقہائے احناف میں ان کا نام اور کام اعزاز و احترام کا نشان تھا۔ اہلِ علم کے ہر حلقے میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور مختلف مسائل کے سلسلے میں ان کے فتوے سند مانے جاتے تھے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور جمیل تخلص کرتے تھے۔ کشمیر کے اس عالم و فقیہ اور شاعر و ادیب نے ۲۷ شعبان ۱۲۴۳ھ کو وفات پائی[۲۵]۔

## چند دیگر فقہائے کرام:

ان حضراتِ فقہائے برصغیر کے علاوہ ردیف ج میں چند دیگر فقہائے کرام کے اسمائے گرامی بھی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں مرقوم ہیں، لیکن ان کے حالات میسر نہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

---

۲۵۔ تاریخ کشمیر حصہ سوم، ص ۹۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۲۴۔

۱۔مولانا جلال الدین بن جمال الدین کشمیری: حنفی المسلک فقیہ تھے۔نہایت نیک، متقی، متواضع اور بلند اخلاق عالم تھے۔کتب تفسیر و حدیث اور فقہ کے ماہر تھے۔اپنی خانقاہ میں مصروفِ عبادت رہتے تھے، جو خود ہی تعمیر کرائی تھی۔علمائے کشمیر میں ممتاز تھے۔سلوک و تصوّف کی کتابوں سے بالخصوص دلچسپی رکھتے تھے۔۱۲۱۷ھ میں وفات پائی۔

۲۔مفتی جمال الدین ہاشمی سورتی: فقہ و اصول کے ماہرین میں سے تھے۔مولد و منشا سورت (ہندوستان) ہے۔کتبِ فقہ کی تحصیل اپنے والدِ محترم مفتی عبداللہ ہاشمی سورتی سے کی، جو اپنے علاقے میں منصبِ افتا و قضا پر متمکن تھے۔والد کی وفات کے بعد یہ اس منصب پر فائز ہوئے اور عرصے تک یہ خدمت انجام دیتے رہے، لیکن بعد میں اس سے الگ ہو گئے تھے اور افادۂ طلبا اور عبادت کو اپنا مستقل مشغلہ قرار دے لیا تھا۔۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۶ھ کو فوت ہوئے۔

# ح

## ۴۹ - مولانا حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی

علمائے فرنگی محل کی وسیع فہرست میں مولانا حبیب اللہ انصاری کا اسم گرامی بھی شامل ہے - ان کا سلسلہ نسب یہ ہے :

حبیب اللہ بن محب اللہ بن احمد عبد الحق بن محمد سعید بن قطب الدین شہید سہالوی - یہ تمام لوگ، ارباب فضل و کمال تھے اور اپنے اپنے دور میں ان کے درس و تدریس کے سلسلے جاری تھے - رحمہم اللہ تعالیٰ -

مولانا حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی کا مولد و منشا لکھنؤ ہے - ان کے گھر فرنگی محل میں علم کی نہر جاری تھی، اس سے سیراب ہوئے اور علوم و فنون میں مرتبۂ کمال کو پہنچے - انھوں نے اپنے دور کے چار فحول علمائے کرام سے تحصیل کی، اور حسن اتفاق سے یہ چاروں ان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشہور و ممتاز ہیں -

ایک مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی سے - یہ ان کے بڑے بھائی تھے اور جلیل القدر عالم اور مصنف تھے - ان کی وفات ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ کو لکھنؤ میں ہوئی -

دوسرے مولانا انوار الحق انصاری سے، یہ بھی جید عالم تھے علوم حکمیہ میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے - انھوں نے بہتر سال کی عمر میں وفات پائی -

تیسرے مولانا احمد حسین انصاری فرنگی محلی سے، یہ بھی عالم و فاضل اور معروف مدرس و معلم تھے - نہایت ذہین اور سریع الادراک تھے -

چوتھے مولانا محمد حسن بن غلام مصطفیٰ انصاری فرنگی محلی سے، جو ذکاوت و فطانت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اور کثیر الدرس اور کثیر التصانیف عالم تھے علمی دنیا

میں "ملا حسن" کے عرف سے معروف ہیں، معقولات میں بالخصوص اپنے تمام اقران سے فائق تر تھے۔

مولانا حبیب اللہ انصاری کے چاروں استاد ان کے خاندان ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اور علوم و فنون میں بہت شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے فیضِ صحبت سے مولانا حبیب اللہ نے بڑا نام پایا اور برصغیر پاک و ہند کے فقہائے حنفیہ میں ممتاز گردانے گئے۔ فقہ و اصول اور دیگر علومِ متداولہ میں مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ لیکن انتظام جائداد اور امورِ خانہ داری کی وجہ سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع نہیں کرسکے اور اس طرف راغب ہونے کے مواقع میسر نہیں آئے۔ دنیوی کاروبار میں مشغول رہے اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔

ان کے بیٹے مولانا ولی اللہ انصاری فرنگی محلی تھے، جو تیرھویں صدی ہجری کے بہت بڑے مدرس اور مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب "اغصان الاربعہ" ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے والدِ گرامی مولانا حبیب اللہ کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگرچہ فقہیات پر انھیں عبور حاصل تھا اور فقہی مسائل وضاحت و تفصیل سے بیان کرتے تھے، لیکن درس و تدریس سے انھیں دلچسپی نہ تھی اور طبیعت اس طرف مائل نہیں ہوئی۔

مولانا حبیب اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر کے مطابق ۱۲۱۶ھ میں وفات پائی۔ مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں تاریخ وفات ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ لکھی ہے۔[۱]

## ۵۰۔ مولانا حبیب اللہ البوری

برصغیر کے فقہائے شافعیہ میں مولانا حبیب اللہ بن محمد درویش بن

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۲۸۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۵۲، ۵۳۔ احوالِ علمائے فرنگی محل ص ۲۸، ۲۹۔

عبدالقادر قرشی شافعی البوری اونچے مرتبے کے عالم و فقیہ تھے ۔ ان کے والد مولانا محمد درویش بھی جید عالم تھے ۔ لائق بیٹے نے باپ سے فقہ واصول کی کتابیں پڑھیں اور جلیل القدر عالم کی حیثیت سے شہرت پائی ۔ فرماں روائے دکن کو ان کی فراوانیٔ علم کا پتا چلا تو انھیں دکن کے شہر ”ادھونی“ کی صدارت پیش کی گئی ۔ طویل عرصے تک اس عہدے پر مامور رہے ۔ پھر بسالت جنگ کے بیٹے داراجاہ کا تقرب حاصل ہو گیا ۔

مولانا حبیب اللہ البوری صالح ، ذکی اور فطین عالم تھے ۔ خط نہایت عمدہ تھا ۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور تصنیف و تالیف کا بہترین ذوق رکھتے تھے ۔ ان کی تصنیفات میں ان کتابوں کا علم ہو سکا ہے ۔

۱ ۔ آئینۂ توجیہ : یہ ”التنبیہ“ کی شرح ہے اور فقہِ شافعی سے متعلق ہے ۔ اپنے موضوع میں یہ پُرازمعلومات کتاب ہے اور فارسی میں ہے ۔

۲ ۔ الشہاب المحرقہ فی ردعلی المہدویہ : یہ کتاب فرقہ مہدویہ کے رد میں ہے اور تحقیق سے لکھی ہے ۔ فارسی میں ہے ۔

۳ ۔ رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمہ : فارسی زبان میں ہے ۔

مولانا حبیب اللہ شافعی البوری نے ۱۲۲۲ھ کو اپنے گاؤں ”البور“ میں وفات پائی ، جو اعمالِ رائچور میں واقع ہے اور وہیں دفن ہوئے[۲]

## ۵۱ ۔ مرزا حسن علی صغیر لکھنوی

تیرھویں صدی ہجری میں لکھنؤ اور اس کے اطراف و جوانب میں علم حدیث کا فیض جس بزرگ نے عام کیا ، وہ صاحبِ ترجمہ مرزا حسن علی صغیر ہاشمی لکھنوی ہیں ۔ تدریسِ حدیث اور اشاعتِ سنت کی مناسبت سے لفظ ”محدث“

---

۲ نزہۃ الخواطر ، ج ۷ ، ص ۱۴۸ ۔

ان کے نام کا جزو بن گیا ہے اور طبقۂ علما میں وہ "مرزا حسن علی صغیر محدث" کے نام سے مشہور ہیں۔ فرنگی محل جو عرصۂ دراز سے اصحابِ علم کا کعبۂ مقصود تھا، اس کے اربابِ فضل بھی تحصیلِ حدیث و فقہ کے لیے مرزا حسن علی صغیر کی بارگاہِ علم میں حاضری کو سعادت سمجھتے تھے، چنانچہ متعدد علمائے فرنگی محل نے ان سے استفادہ کیا اور تحصیلِ علم کی۔

اس زمانے میں لکھنؤ میں "مرزا حسن علی" نام کے دو بزرگ اقامت فرما تھے اور دونوں علم و فضل میں یگانہ و منفرد تھے، ایک حسن علی صغیر اور دوسرے حسن علی کبیر۔ حسن علی صغیر لکھنؤ کے محلہ یحییٰ گنج میں سکونت پذیر تھے اور حسن علی کبیر محلہ محمود نگر میں۔ یہاں مرزا حسن علی صغیر کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جو محلہ یحییٰ گنج میں مقیم تھے۔

مرزا حسن علی صغیر لکھنوی کی ولادت و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدا میں ممتاز ماہرِ معقولات مولانا حمد اللہ سندیلوی کے فرزندِ گرامی مولانا حیدر علی سندیلوی سے اخذِ علم کیا۔ بعد ازاں عازمِ دہلی ہوئے اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی اور شاہ عبد القادر دہلوی کے حلقۂ درس میں شمولیت اختیار کی۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے بھی استفادہ کیا اور سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔ علم حدیث سے ان ہی کے شرفِ صحبت سے تعلق پیدا ہوا، اور پھر اس میں روز بروز اعتنا بڑھتا گیا۔ ان کا شمار اپنے دور کے اصحابِ فقہ و اصول اور ماہرینِ حدیث میں ہوتا تھا۔ پہلے حنفی المسلک تھے، لیکن جب علمِ حدیث اور اس کے متعلقات سے قلبی وابستگی پیدا ہوئی تو شافعی مسلک اختیار کر لیا، اور شافعی اس دور میں "اہلِ حدیث" کو کہا جاتا تھا۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ یہ مغل ہیں، لیکن یہ خود اپنے آپ کو اولادِ بنی ہاشم سے شمار کرتے تھے اور اپنا نام "مبرک جمال الدین حسن علی الہاشمی" لکھتے تھے۔ ان کے والد کا پہلا نام "مرزا بندہ علی بیگ تھا" لیکن بعد میں اسے "عبد العلی" سے بدل دیا گیا۔

مرزا حسن علی کا تذکرہ کرتے ہوئے "الیانع الجنی" کے مصنف شیخ محسن بن

یحییٰ ترہٹی لکھتے ہیں کہ وہ حدیث میں بحرِ زخار تھے اور باقی علوم میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ مذہب شافعی کے مطابق فرائضِ عبادت انجام دیتے تھے۔

وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مندرجۂ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱: تحفۃ المشتاق فی نکاح والصداق۔

۲: برھان الخلاف۔

۳: رسالۃ فی تحریم النجوم والرمل والجفر۔

ان کے علاوہ مختلف فقہی مسائل سے متعلق فتوؤں کا بہت بڑا ذخیرہ جو فارسی میں ہے اور متعدد رسائل ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

مرزا حسن علی ہاشمی لکھنوی نے ہفتے کے روز ۲۶ صفر ۱۲۵۵ھ کو مرضِ استسقا سے لکھنؤ میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور وہیں دفن کیے گئے۔

"تراجم علمائے حدیث ہند" کے مصنف مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے سالِ وفات ۱۲۲۶ھ لکھا ہے، جو قرینِ صحت نہیں ہے۔[۵۳]

# ۵۲- سیّد حسین حسینی نصیر آبادی

سید حسین بن دلدار علی بن محمد معین حسینی نقوی نصیر آبادی ثم لکھنوی فاضل کبیر، شیخ عالی قدر اور علامۂ وقت تھے۔ مشاہیر مجتہدینِ شیعہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ۱۴ ربیع الاول ۱۲۱۱ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو

---

۵۳ قسطاس البلاغہ، ص — الیانع الجنی ص ۷۷ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۷، ۴۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۳۶، ۱۳۷ — تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۵۲۰ تا ۵۲۲ — ابجد العلوم ص ۹۱۷ — علم و عمل، ج ۱، ص ۲۵۳ —

بعض کتابیں اپنے والدِ گرامی سیّد دلدار علی سے جو اپنے دور کے نامور شیعہ مجتہد تھے، پڑھیں اور بعض کتب درسیہ کی تکمیل اپنے بڑے بھائی سیّد محمد سے کی۔ ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے پھر خود مسندِ تدریس آراستہ کی اور بہت سی اہم شخصیتوں نے ان کی شاگردی کا فخر حاصل کیا، جن میں مفتی عباس تستری، غنی نقی زید پوری، سید حسین مرعشی، مرزا احسن عظیم آبادی اور علی اظہر شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بھانجے ہادی بن مہدی، ان کے فرزندانِ گرامی اور خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

سید حسین نے بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ کچھ اپنے والد سید دلدار علی کی زندگی میں اور کچھ ان کی وفات کے بعد۔ اجتہاد کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا۔ ایک رسالہ تقلید موتیٰ اور ایک رسالہ نماز میں پہلی دو رکعتوں میں شک سے متعلق تحریر کیا۔ یہ رسائل والد کی زندگی میں تصنیف کیے۔

اس کے علاوہ والد کی وفات کے بعد ان کی یہ کتابیں ضبطِ تحریر میں آئیں:

۱۔ مناھج التدقیق و معارج التحقیق: یہ ایک مبسوط و مفصل کتاب ہے اور متعدد دقیق و انیق مسائل پر مشتمل ہے، لیکن نامکمل ہے۔

۲۔ الذخر الرائق: یہ مسائلِ فقہ میں ہے اور باب الطہارۃ تک ہے۔ یہ بھی نامکمل ہے۔

۳۔ رسالہ فی مسئلہ اصالۃ الطہارۃ۔

۴: حاشیہ علی شرح الکبیر: طباطبائی کی شرح الکبیر کی کتاب الصوم، کتاب الصدقہ و کتاب الہبہ پر حاشیہ۔

۵۔ روضۃ الاحکام: فارسی میں ہے اور طہارۃ، صلوٰۃ، صوم اور میراث کے ابواب چھپ چکے ہیں، تاہم کتاب نامکمل ہے۔

۶۔ مسئلہ میراث سے متعلق ایک مبسوط رسالہ۔

۷۔ رسالہ حسینیہ: صحت عقاید سے متعلق ہے اور شیخ احمد احسائی اور سید کاظم رشتی کی تردید میں ہے۔

۸۔ الحدیقۃ السلطانیہ۔

۹۔ الرسائل الایمانیہ: فارسی میں ہے، اس کے مقصد اوّل میں توحید، عدل، نبوّت، امامت اور معاد کا ذکر ہے۔ مقصد ثانی میں عبادات کا بیان ہے۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ اور بھی کئی رسالے اور بہت سے فتاوے کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

اس شیعہ عالم و فقیہ نے ۱۲۷۳ھ میں وفات پائی۔[۴۵]

## ۵۳۔ سید حسین احمد حسینی ملیح آبادی

سید حسین احمد بن علی احمد بن علی امجد حسینی ملیح آبادی تیرھویں ہجری کے مشاہیر علمائے ہند میں سے تھے۔ اپنے دور کے شیخ، محدث اور فقیہ تھے۔ ان کے آبا و اجداد اصلاً سرہند (مشرقی پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ والد گرامی سید علی احمد سرہند سے لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور کچھ عرصہ بعد لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے ملیح آباد میں اقامت اختیار کر لی تھی اور پھر اسی شہر کو اپنا مستقل وطن قرار دے لیا تھا۔ وہیں ۲۵ صفر ۱۲۰۱ھ کو صاحب ترجمہ سید حسین احمد کی ولادت ہوئی اور وہیں تربیت پائی۔ عمر کے کچھ مراحل طے کیے تو دل میں حصولِ علم کے شوقِ بے پناہ نے کروٹ لی اور وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ، اس کا گرد و نواح اور دہلی مراکزِ علما و فضلا تھے اور ان کے درس و تدریس کے ہنگامے بپا تھے۔ سید حسین احمد نے

---

[۴۵] نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

ان مراکزِ علم وعلما سے خوب استفادہ کیا اور علوم وفنون کے تمام گوشوں سے بہرہ اندوز ہوئے۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی، مولانا نور الحق لکھنوی، مرزا حسن علی محدث لکھنوی، سید مخدوم حسینی لکھنوی، مولانا عبدالرحیم صفی پوری (کلکتہ) مولانا حیدر علی بن حمداللہ سندیلوی اور حکیم محمد صادق فیض آبادی وغیرہ حضراتِ علما کی خدمت میں پہنچے اور ان سے اکتسابِ علومِ متداولہ کیا۔

پھر عازمِ دہلی ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے درِ فضیلت پر دستک دی، ان سے کتبِ حدیث پڑھیں اور سند واجازہ سے مشرف ہوئے۔ شیخ عمر محدث مکی سے بھی حصولِ فیض کیا۔

جب فارغ التحصیل ہو چکے تو خود سلسلۂ تدریس کا آغاز فرمایا، اور بے شمار علما وطلبا نے ان کے حضور زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل کی، جن میں مولانا عبدالحلیم انصاری فرنگی محلی اور مولانا عبدالرزاق ایسے اعاظمِ رجال شامل ہیں۔

سید حسین احمد ملیح آبادی کے متنوع اوصاف ہیں، سے ایک صفت یہ تھی کہ نہایت عبادت گزار، متواضع اور حلیم الطبع عالم تھے۔ طلبائے علم کو بھی اس کی تلقین فرماتے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ دعوت وارشاد کا فریضہ بھی انجام دیتے اور نرمی وملائمت سے لوگوں کو دینِ حق کی طرف بلاتے۔

تصنیف وتالیف سے زیادہ تعلق نہ تھا، تاہم بعض عنوانات پر چند رسالے تصنیف کیے، جو یہ ہیں:

۱۔ رسالہ جوازِ قرأتِ فاتحہ خلف الامام: اس میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی وضاحت ہے۔

۲۔ رسالہ در اثباتِ بیعتِ مروّجہ:

۳۔ بحثِ وجود سے متعلق شاہ رفیع الدین دہلوی کے رسالے کی شرح۔

۴۔ رسالہ در حلیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

۵- تصوّف کے بارے میں چند رسائل۔
چھوٹے چھوٹے یہ چند رسائل ان کی زندگی میں اہلِ علم کے حلقوں میں پہنچ گئے تھے اور بہت مقبول ہوئے تھے۔
جو لوگ ان کی خدمت میں آتے ان کے مکارمِ اخلاق، کثرتِ علم اور تحقیق و تدقیق سے نہایت متاثر ہوتے۔ ان کا اندازِ کلام بہت دھیما اور پیارا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے نمونۂ اسلاف تھے اور ان کے شب و روز خدمتِ دین میں بسر ہوتے تھے۔ ہندوستان کے اس رفیع المرتبت عالم و فقیہ نے ۹ رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ کو رحلت فرمائی اور ملیح آباد سے متصل موضع دودھیا میں اپنے والدِ ماجد کے جوار میں مدفون ہوئے۔[۵]

## ۵۴- سیّد حیات حسینی دہلوی

سیّد حیات بن ابو الحیات حسینی دہلوی مسلکاً حنبلی تھے اور فقہِ حنابلہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ نہایت نیک، عابد و زاہد اور نرم مزاج عالمِ دین تھے۔ سرزمینِ ہند میں پیدا ہوئے اور یہیں پرورش پائی۔ دہلی میں سکونت پذیر تھے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ اس زمانے میں وطن سے نکلے اور حجازِ مقدس جا پہنچے۔ پھر نجف، کربلا اور بغداد کا عزم کیا۔ ان مقامات کی سیر و سیاحت کے بعد دہلی آئے اور عرصے تک وہاں اقامت گزیں رہے۔ دہلی سے پھر حرمین شریفین کے لیے رختِ سفر باندھا اور مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے اور اسی وجہ سے مدنی کی نسبت سے شہرت پائی۔
سیّد حیات حسینی اگرچہ حنبلی تھے لیکن چاروں ائمہ کرام کی فقہ پر عبور رکھتے

---

[۵] تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۰، ۵۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۷ ص ۱۴۳۔ تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۵۱۳، ۵۱۴۔

تھے اور بغیر کسی تعصب اور مسلکی رورعایت کے وہی بات کہتے، جو اُن کی میزانِ تحقیق میں پوری اترتی۔

انھوں نے فارسی میں ایک رسالہ تصنیف کیا جو ائمہ اربعہ کے مذاہب فقہ سے متعلق ہے۔ اس رسالے کی افادیت کے پیشِ نظر مدینہ منورہ کے بعض اہلِ علم کے کہنے پر انھوں نے اس کو عربی میں بھی منتقل کیا۔ یہ رسالہ علمی اعتبار سے بہت مشہور ہوا اور پڑھے لکھے طبقے نے اس میں بڑی دلچسپی لی۔[۵۶]

## ۵۵۔ مولانا حیدر انصاری لکھنوی

مولانا حیدر بن محمد مبین بن محب اللہ انصاری فرنگی محلی لکھنوی، عالی مرتبت فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ ولادت اور نشو و نما لکھنؤ میں ہوئی اور اپنے والدِ مکرم مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی (متوفی ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ) سے اکتسابِ علم کیا۔ پھر خود بسلسلۂ تدریس کا آغاز فرمایا۔ اس زمانے میں والئ اودھ نواب سعادت علی خاں کی طرف سے انھیں تین روپے روزانہ وظیفہ ملتا تھا تاکہ اطمینانِ قلب کے ساتھ اور معاشی تفکرات سے آزاد ہو کر درس اور افادۂ طلبا میں مشغول رہ سکیں۔ نواب سعادت علی خاں کی وفات کے بعد امرائے مملکت نے ان کو مزید مرکزِ احترام ٹھہرایا اور بڑے بڑے وظائف اور صلات سے سرفراز کیا۔

مولانا حیدر انصاری مسلکِ اہلِ سنت سے وابستہ تھے اور اسی عقیدہ و عمل کے حامل تھے جو سلف سے منقول و مروی ہے، لیکن اودھ کا وزیر شیعہ تھا اور اس کے دل میں ان کے خلاف بغض پیدا ہو گیا تھا، اس نے مولانا کو ہدفِ ایذا بنانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا کو وزیر کے مذموم ارادے کا پتا چلا تو لکھنؤ سے نکلے اور کلکتے چلے گئے، وہاں سے مکہ مکرمہ کا قصد فرمایا اور ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۰ھ کو واردِ

---

[۵۶] نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۵۰۔

مکہ ہوئے۔
مکہ مکرمہ پہنچ کر انھوں نے وہاں کے علمائے حدیث سے مستفید ہونے کا عزم کیا۔ وہاں سید یوسف بن البطاح الاہدل یمانی اور شیخ عمر مکی کا غلغلۂ درسِ حدیث بلند تھا، اس میں شمولیت کی اور ان حضرات سے صحیحین پڑھیں۔
حج میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا، لہذا مکہ مکرمہ سے جمادی الاخریٰ میں مدینہ منورہ پہنچے اور شیخ عبدالحفیظ العجیمی مکی اور علامہ محمد عابد سندھی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور ان سے سندِ حدیث حاصل کی۔ قوتِ حفظ و ادراک اس قدر تیز تھی کہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ آتے ہوئے، اثنائے سفر میں پورا قرآنِ مجید حفظ کر لیا تھا اور پھر مسجدِ حرام میں نمازِ تراویح میں باقاعدہ سنانے کا شرف حاصل کیا۔ ماہِ شعبان کے آخر میں مکہ مکرمہ آگئے تھے۔
حج سے فارغ ہو کر ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۴۰ھ کو مکہ سے روانہ ہوئے اور غرۂ محرم ۱۲۴۱ھ میں، مراجعتِ وطن کے لیے جدہ سے کشتی میں سوار ہوئے۔ جدہ سے ابھی پانچ میل کا سفر طے کیا ہو گا کہ کشتی سمندر میں غرق ہو گئی، جس میں ان کے بیس رفقائے سفر بھی سمندر کی خوف ناک لہروں کی نذر ہو گئے اور بہت سی قیمتی کتابیں بھی ضائع ہو گئیں، لیکن خود محفوظ رہے۔ اس حادثے کی اطلاع امیر جدہ کو پہنچی تو اس نے ان کے لیے ایک کشتی کا انتظام کیا، جس کے ذریعے وہ انیس دن بعد بمبئی کے ساحل پر اترے۔ کشتی سے اترتے ہی ان کی ملاقات حیدر آباد (دکن) کے شمس الامرا سے ہوئی۔ وہ نہایت اکرام و اعزاز سے پیش آیا، اپنے ساتھ حیدر آباد لے گیا اور والیِ حیدر آباد سے تقرب پیدا کرا دیا، جس سے ان کے مستقبل کی دنیا بالکل بدل گئی۔ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا اور ایک جاگیر عطا کی گئی جس سے بارہ ہزار روپے نقد سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔
مولانا حیدر انصاری معقولات و منقولات میں مہارت رکھتے تھے اور کئی کتب و رسائل کے مصنف تھے۔ ایک رسالہ منطق سے متعلق لکھا، وظائفِ حیدریہ کے نام

سے وظائف و اوراد کے بارے میں ایک رسالہ تصنیف کیا۔ مختلف درسی کتابوں پر تعلیقات و حواشی سپردِ قلم کیے۔

اس عالم و فقیہ نے ۱۳ محرم ۱۲۵۶ھ کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی۔[۷۵]

# ۵۶- سیّد حیدر علی ٹونکی

مولانا سید حیدر علی بن عنایت علی بن فضل علی حسینی بخاری دہلوی ثم ٹونکی، علمائے ربانی اور فضلائے اتقیا میں سے تھے۔ اپنے عہد کے عالم کبیر، شیخِ وقت اور فقیہ بلند مرتبت تھے۔ ولادت و نشو و نما دہلی میں ہوئی۔ صغر سنی ہی میں عازم رام پور ہوئے، وہاں سید غلام جیلانی اور شیخ عبدالرحمٰن کوہستانی سے علمِ نحو اور علوم عربیہ کی کتابیں پڑھیں۔ کچھ دن شیخ رستم علی رام پوری کے حلقۂ درس میں رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ گئے اور مولانا محمد مبین انصاری فرنگی محلی کی شاگردی اختیار کی۔ عرصے تک ان سے مصروفِ استفادہ رہے۔ لکھنؤ سے دہلی کی راہ لی اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی اور ان کے برادرِ کبیر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے اکتسابِ علم کیا۔ حکیم محمد شریف خاں دہلوی (متوفی ۱۲۲۲ھ) سے علمِ طب کی تحصیل کی۔ طریقت و سلوک کے لیے سید احمد شہید بریلوی سے رجوع کیا اور ان سے فیض یاب ہوئے۔

مولانا حیدر علی ٹونکی نہایت ذکی، ذہین اور سریع الادراک تھے۔ معرفتِ کتاب و سنت میں فائق تر، خلافیات میں ماہر اور علومِ نقلیہ و عقلیہ میں بحرِ زخار تھے۔ اصل وطن چوں کہ دہلی تھا، اس لیے دہلوی کی نسبت سے پکارے گئے۔ رام پور میں سید غلام جیلانی کی صاحب زادی سے شادی کر لی تھی اور کچھ مدت وہاں مقیم رہے تھے، لہٰذا رام پوری کہلائے۔ رام پور سے کلکتہ گئے۔ فرماں روائے رام پور نواب احمد علی خاں

---

[۷۵] احوال علمائے فرنگی محل، ص ۲۵، ۲۶ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۵۱، ۱۵۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۸۶

کے عہدِ آخر میں ٹونک پہنچے۔ اس نے ان کے ہاتھ پر نیابتاً بیعتِ جہاد کی تھی۔ ٹونک میں نواب وزیر الدولہ کی سرکار میں رسائی حاصل کی۔ نواب مذکور ان کی گوناگوں صلاحیتوں اور کثرتِ علم وادراک سے بہت متاثر تھا، اس نے ان کو اپنے خاص ندیموں اور مصاحبوں میں شامل کیا، اور ریاست کے اہم امور کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی۔ عہدۂ دیوانی جو ایک بہت بڑا عہدہ ہے، اس پر مامور کیے گئے۔ یہ ربیع الاوّل ۱۲۶۰ھ (مارچ ۱۸۴۴ء) کا واقعہ ہے۔ قیامِ ٹونک کی وجہ سے ٹونکی مشہور ہوئے۔ ان میں بڑی خوبی یہ تھی کہ تمام سرکاری ذمے داریوں کے باوجود باقاعدہ طلبا کو درس دیتے اور مستفید فرماتے تھے۔

مولانا حیدر علی ٹونکی سے لاتعداد علما و طلبا نے استفادہ کیا اور ان کے علوم و فنون سے بہرہ ور ہونے کی سعادت حاصل کی۔ ان حضراتِ عالی قدر میں شیخ اوحد الدین بلگرامی، قاضی بزرگ علی مارہروی، قاضی عنایت رسول چریاکوٹی، قاضی ہدایت علی گیلانی، قاضی امام الدین ٹونکی، شیخ ابراہیم نگرنہسوی، شیخ احمد بن محمد شروانی اور بہت سے اصحابِ علم شامل ہیں۔

نواب سید محمد صدیق حسن خاں قنوجی ابجد العلوم میں رقم فرماتے ہیں کہ مولانا حیدر علی ٹونکی قصیر القامت اور نحیف البدن تھے۔ فاضلِ جلیل اور ممتاز عالم تھے۔ علم طب سے بھی پوری طرح آشنا تھے اور طبابت کرتے بھی تھے۔ مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی پر مولانا فضل امام خیر آبادی نے جو اعتراضات وارد کیے، ان کا مدلل جواب دیا اور مولانا شہید کو اپنے موقف میں حق بجانب ٹھہرایا۔ ان کا شمار سید احمد شہید بریلوی کے خلفائے خاص میں ہوتا تھا۔

متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ صیانۃ الناس عن وسوسۃ الخناس: یہ کتاب اردو میں ہے۔

۲۔ رسالہ اثباتِ رفع الیدین: اس میں ثابت کیا ہے کہ رفع الیدین نماز میں چار مواقع پر کرنی چاہیے۔ یہ رسالہ مولانا محبوب علی دہلوی کے رد میں تحریر کیا، فارسی میں ہے۔

اس علامۂ عصر نے ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ (۱۸ اگست ۱۸۵۶ء) کو ٹونک میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ نزہۃ الخواطر کی روایت کے مطابق وفات کے وقت ستر برس کی عمر تھی۔ اس حساب سے سالِ ولادت ۱۲۰۲ھ بنتا ہے ؎۵۸

## ۵۷۔ مولانا حیدر علی فیض آبادی

مولانا حیدر علی بن محمد حسن بن محمد ذاکر بن عبدالقادر دہلوی فیض آبادی، تیرھویں صدی ہجری کے کبار علما، مایہ ناز متکلمین اور لائقِ فخر فقہائے ہند میں سے تھے فیض آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ حصولِ علم کا آغاز اپنے وطن فیض آباد میں کیا اور مرزا فتح علی، سید نجف علی اور حکیم میر نواب کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے، فیض آباد کے یہ سب علما شیعہ تھے، لیکن حیدر علی کے لوحِ ذہن پر دورِ اول کے ان اساتذہ کرام کے مذہبی افکار و تصوّرات مرتسم نہیں ہوئے، وہ بہ دستور اپنے عقیدہ و عمل پر قائم رہے۔

فیض آباد سے دہلی گئے، وہاں مولانا رشید الدین، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز قبلہ گاہِ علما و فضلا تھے، ان کے درِ فضیلت پر دستک دی اور خوب استفادہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز سے تو عرصے تک وابستگی اختیار کیے رکھی، یہاں تک ہر شعبۂ علم و فن سے متمتع ہوئے۔

دہلی سے لکھنؤ کا رخ کیا اور طویل مدت تک علمائے لکھنؤ سے علمی صحبتیں رہیں۔

بحث و جدال، مناظرہ و کلام، کثرتِ معلومات اور حدیث و فقہ کی جزئیات پر عبور و استحضار میں اپنے اقران و معاصرین میں ممتاز و منفرد تھے۔ کتبِ شیعہ پر گہری نظر تھی اور ان کے مشمولات و مندرجات کے ہر پہلو سے آگاہ تھے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے

---

؎۵۸ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۵۳، ۱۵۴ — ابجد العلوم، ص ۹۱۷ — الیانع الجنی، ص ۷۷ — حدیقۂ راجستان، ٹونک، ص — جماعت مجاہدین، ص ۲۵۲ — تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۸۸ تا ۴۹۴

شیعہ علما ان کے مقابلے میں اترنے اور میدانِ مناظرہ میں ان کا سامنا کرنے سے گریز کی راہیں تلاش کرتے تھے۔ اس عالمِ اجل کے کثرتِ معلومات، زورِ استدلال اور قوتِ بیان کا ہر مخالف و موافق نے اعتراف کیا اور ذہنی و فکری صفائی کی ہر شخص نے کھلے الفاظ میں تحسین کی۔

یہ عالم ذی قدر لکھنؤ سے بھوپال کو روانہ ہوا، اور ایک مدت تک وہاں قیام رہا۔ پھر حیدر آباد کا عزم کیا۔ وہاں ان کی صلاحیتوں سے اثر پذیر ہو کر نواب مختار الملک نے محکمۂ عدل و قضا کی ذمے داریاں ان کے سپرد کیں۔ پھر تمام عمر اس منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری رہا۔

ان کی تصنیفات حجم و ضخامت اور دلائل و براہین کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں اور مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ منتہی الکلام: یہ ایک مفصل و مدلل کتاب ہے۔

۲۔ ازالۃ الغین عن بصارۃ العین: تین جلدوں میں۔

۳۔ نضارۃ العینین عن شہادۃ الحسنین۔

۴۔ کاشف اللئام عن تدلیس المجتھد الفمقام۔

۵۔ الداہیۃ الحاطمہ علی من اخرج من اہل البیت فاطمہ۔

۶۔ دوبینۃ الثعالیب والغرابیب فی انشاء المکاتیب۔

۷۔ اثبات بیعتِ مرتضویہ۔

۸۔ اثبات زوجیۃ عمر بن الخطاب بسیدتنا کلثوم بنت علی۔

۹۔ تکملہ فتح العزیز: کئی بڑی بڑی جلدوں میں ہے۔ یہ کتاب نواب سکندر بیگم ملکۂ بھوپال کے کہنے پر تصنیف کی۔

مولانا حیدر علی فیض آبادی نے ۱۲۹۹ھ کو حیدر آباد (دکن) میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۵۹]

---

۵۹ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۵ ـــــ نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۱۵۴، ۱۵۵

## چند دیگر فقہائے کرام

ردیف ح میں مندرجہ ذیل فقہائے گرامی کے حالات کتبِ رجال میں مختصر طور سے درج ہیں:

۱۔ سید حسین بن رمضان علی نونہروی: شیعی المسلک فقیہ تھے۔ غازی پور (یو۔پی) کے قریب بمقام نونہرہ پیدا ہوئے۔ درسی کتابیں فرنگی محل لکھنؤ کے اساتذہ سے پڑھیں۔ سید حسین بن دلدار علی مجتہد لکھنوی سے کتبِ فقہ کی تکمیل کی۔ ۱۲۷۱ھ میں فوت ہوئے۔

۲۔ شیخ حسین مرعشی لکھنوی: کبار فقہا و علمائے شیعہ میں سے تھے۔ سید حسین مجتہد لکھنوی کے شاگرد تھے۔ علومِ عالیہ و آلیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔

۳۔ حسین بخش کاکوروی: نامور حنفی المسلک فقیہ تھے۔ ۱۲۰۳ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ حصولِ علم کے بعد تدریس و تصنیف کو اپنا مشغلہ ٹھہرایا۔ عرصے تک انگریزی حکومت کی ملازمت میں رہے۔ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب "نفحۃ الہند" ہے، جو ادب سے متعلق ہے، دوسری "الآثار الباقیہ" علمِ اعداد میں ہے۔ تیسری "اختلاف البصریین والکوفیین" ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ علمِ نحو کے کن کن مسائل میں کوفے اور بصرے کے نحویوں کا اختلاف ہے۔ چوتھی کتاب "ضروریات الادب" ہے جو علمِ بدیع کے بارے میں ہے۔ ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۸ھ کو اٹاوہ میں وفات پائی۔

۴۔ مولانا حسین علی صدیقی قنوجی: معروف فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ ولادت قنوج میں ہوئی۔ تحصیلِ علم کے بعد سلسلۂ تدریس شروع کیا اور بہت سے طلبا و علما کو مستفید فرمایا۔ "تمرین المتعلم" ان کی تصنیفات میں سے ہے جو مشکل ترین صیغ و تعلیقات سے متعلق ہے۔ اپنے والدِ ماجد مولانا عبدالباسط صدیقی قنوجی کی وفات سے پانچ ماہ بعد ۱۲۲۳ھ کو صرف چوبیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔

۵۔ شیخ حسین علی قائنی اخباری بریلوی: شیعہ تھے۔ متعدد کتابیں تصنیف

کیں، جن میں ایک کتاب "معتمد الکلام" ہے، یہ کتاب مولانا رشید الدین کی "ایضاح لطافۃ المقال" کے رد میں ہے۔ ایک رسالہ الوزیریہ ہے، جو اصول و اخبار کے بارے میں ہے۔ یہ انھوں نے وزیر الدین اخباری کے لیے لکھا۔ ایک اور رسالہ اصول و اخبار سے متعلق حکیم مرزا علی خاں کے حکم سے تحریر کیا۔ علاوہ ازیں میر زاہد پر حاشیہ لکھا۔ ۱۲۴۸ھ کے قریب فوت ہوئے۔

۶- قاضی حفیظ الدین کاکوروی: ۱۱۵۱ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور اپنے والد گرامی قاضی امام الدین کاکوروی اور چچاؤں سے تحصیل علم کی۔ فاضل فقہا اور نامور علما میں گردانے گئے۔ محکمۂ قضا پر فائز ہوئے اور تمام عمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۲۶۱ھ کو کاکوری میں وفات پائی۔

۷- شیخ حفیظ اللہ لکھنوی: علمائے فرنگی محل سے تعلق رکھتے تھے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ حصولِ علم کے بعد فیض آباد کے منصب عدل و قضا پر فائز ہوئے۔ خدمتِ تدریس بھی انجام دیتے رہے۔ ۲۰ ربیع الثانی ۱۲۷۹ھ کو رحلت فرمائی۔

۸- شیخ حکیم الدین کاکوروی: ممتاز فقہائے حنفیہ میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۱۹۴ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے۔ نشو و نما بھی وہیں ہوئی۔ اپنے والد شیخ نجم الدین کاکوروی، شیخ عماد الدین اور شیخ فضل اللہ عثمانی سے اکتسابِ علم کیا۔ پھر محکمۂ افتا میں متعین کیے گئے۔ بعد ازاں خدمتِ عدل و قضا پر مامور ہوئے۔ پھر منصبِ صدارت سپرد کیا گیا۔ نہایت نیک، متدین، بارعب، عالی قدر اور علم و اہلِ علم کے قدردان تھے۔ ہمیشہ مطالعۂ کتب اور مذاکرۂ علم میں مشغول رہتے۔ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۹ھ کو فوت ہوئے۔

۹- مولانا حمید الدین حیدر آبادی: حنفی المسلک فقیہ اور صاحب فضل و صلاح عالم تھے۔ طویل عرصے تک حیدر آباد (دکن) کے منصبِ عدل و قضا پر متمکن رہے۔ ۱۲۹۵ھ میں حج بیت اللہ کیا۔ حیدر آباد میں وفات پائی۔

۱۰- مولانا حمید الدین چاٹگامی: تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے ہند میں سے اپنے علاقے کے مشہور فقیہ اور عالم تھے۔ "احادیث الخوانین" کے نام سے چاٹگام کی تاریخ سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی، جو فارسی زبان میں ہے۔

# خ

## ۵۸ - مولانا خادم احمد لکھنوی

لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل میں مولانا خادم احمد بن محمد حیدر بن محمد مبین انصاری فرنگی محلی کا اسمِ گرامی لائق تذکرہ ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کے فقہائے حنفیہ میں ان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مولد و منشا لکھنؤ ہے۔ اپنے عم محترم مولانا محمد معین فرنگی محلی سے کسبِ علم کیا اور درجۂ کمال پر پہنچے۔ پھر اپنے علمائے سلف کی طرح وعظ و تذکیر، درس و تدریس اور فتویٰ نویسی میں مشغول ہو گئے۔ ان کے وعظ نہایت موثر اور دلآویز ہوتے تھے۔ ان کے وجود سے فرنگی محل کی رونق قائم تھی اور اس سے جو گوناگوں روایات وابستہ ہیں، ان کی وجہ سے وہ زندہ و تاباں تھیں۔ اپنے والد گرامی مولانا محمد حیدر فرنگی محلی سے بیعت تھے۔

مولانا خادم احمد فرنگی محلی کے عہد میں ایک بہت ہی الم ناک واقعہ پیش آیا، جس کے بارے میں انھوں نے فتویٰ بھی جاری کیا۔ وہ واقعہ مختصر الفاظ میں اس طرح ہے کہ ہندوؤں کے شہر اجودھیا میں ان کے مشہور مذہبی مقام "ہنومان گڑھی" میں ایک بہت بڑی مسجد تھی جو بہت عرصہ قبل تعمیر کی گئی تھی۔ ہندو اس سے خوش نہ تھے اور کہتے تھے کہ یہ مسجد ان کے مندر کی جگہ پر تعمیر کی گئی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے دورِ آخر میں جب کہ وہ عالم نزع میں تھی، ہندوؤں نے اس مسجد پر قبضہ کر کے اس کو مندر بنا لیا۔ اس سے مسلمانوں میں قدرتی طور پر اشتعال پیدا ہوا، اور ایک شخص شیخ غلام حسین مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ میدان میں نکلے اور ہندوؤں کے قبضے سے مسجد کی بازیابی کے لیے کوشاں ہوئے۔ ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ مسلح تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے شیخ غلام حسین اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا اور قرآنِ مجید اور اسلامی کتابوں کو جلا دیا۔ اس زمانے

میں ایک جلیل القدر عالم مولانا امیر علی امیٹھوی تھے - ان کو اس المیے کا پتا چلا تو ان کی حمیتِ دینی جوش میں آئی، لکھنؤ پہنچے اور اودھ کے والیانِ حکومت اور لکھنؤ کے عوام و خواص کو غیرت دلائی اور کفار سے لڑائی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اودھ کا حکمران واجد علی شاہ تھا جو عیاش اور منکرات و منہیات کا دلدادہ تھا۔ اس کا وزیر نقی علی شیعہ تھا اور دیوان ہندو تھا۔ یہ سب امرا و حکام راشی اور احکامِ اسلام سے بے پروا تھے۔ جب خود حکمران غلط کردار ہو تو ظاہر ہے، ماتحت اسی کے نقشِ قدم چلیں گے۔ انھوں نے مولانا امیر علی کو اس اقدام سے روکا اور کہا کہ ہندوؤں کو کچھ نہ کہا جائے اور مسجد انہی کے قبضے میں رہنے دی جائے۔ ان عمّالِ حکومت نے اس سے اگلا قدم یہ اٹھایا کہ بعض علما کی طرف رجوع کیا اور روپے پیسے کے ذریعے سے ان سے فتویٰ لیا کہ اس مسئلے میں ہندوؤں کے خلاف خروج جائز نہیں، اور مولانا امیر علی امیٹھوی کی تگ و دو خلافِ اسلام ہے۔ فتویٰ دینے والے ان علما میں صاحبِ ترجمہ مولانا خادم احمد لکھنوی بھی شامل تھے۔

لیکن مولانا امیر علی امیٹھوی مردِ مجاہد تھے، وہ اپنے رفقا کے ساتھ مسجد کی بازیابی کے لیے میدانِ جہاد میں نکلے، ادھر انگریزی فوج مقابلے کو آئی اور اودھ کی حکومت نے بھی اپنے سپاہی مولانا ممدوح کی مخالفت میں روانہ کیے۔ اس کے علاوہ "علمائے کرام" کے فتوے بھی تھے جو مولانا کے خلاف جاری کیے گئے تھے۔ مولانا ممدوح جب اپنے رفقا کی معیت میں اجودھیا پہنچے تو شاہی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اور سب مجاہدینِ حق جامِ شہادت نوش کر گئے۔ یہ حادثہ ۲۶ صفر ۱۲۷۲ھ کو بدھ کے روز دوپہر کے وقت پیش آیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب معرکۂ قتال گرم ہوا تو مولانا امیر علی امیٹھوی کے بعض ارادت مندوں نے ان سے عرض کیا کہ وہ اجازت دیں کہ انھیں کسی محفوظ مقام میں پہنچا دیا جائے تاکہ وہ دشمن کی زد سے بچ جائیں، ان کی زندگی بہت ضروری ہے، لیکن وہ نہیں مانتے اور یہ مصرع پڑھا:

سرِ میدان کفن بر دوش دارم

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا امیر علی امیٹھوی کے اس اقدام کے خلاف فتویٰ جاری کرنے کے بعد، لیکن ان کی شہادت سے بھی پہلے مولانا خادم احمد فرنگی محلی پر بیماری کا حملہ ہوا، صرف دو دن بیمار رہے اور ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ کو ظہر کے وقت طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔

مولانا خادم احمد فرنگی محلی بہت اچھے مصنف اور شارح تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ التقریر المعقول فی بحث الحاصل والمحصول: یہ رسالہ علمِ نحو کی انتہائی کتاب کافیہ کی شرح جامی سے متعلق ہے۔

۲۔ در بیان دائرۂ ہندیہ متعلقہ شرح وقایہ

۳۔ رسالہ در بحثِ طہر متخلل: یہ خالص فقہی مسئلے کے بارے میں ہے۔

۴۔ وسیلۃ الشفا فی احوال الصحابہ۔

۵۔ زاد التقویٰ فی آداب الفتویٰ۔

۶۔ اعلام الھدیٰ فی تحریم المزامیر والغناء۔

۷۔ ھدایۃ الانام فی اثبات تقلید الائمۃ الکرام۔

۸۔ تعلیقات بر شرح جامی۔

۹۔ حاشیہ شرح وقایہ۔

۱۰۔ حاشیہ نور الانوار۔

۱۱۔ حاشیہ بر شرح سلم از ملا حسن۔

مولانا خادم احمد انصاری فرنگی محلی کا شمار اپنے عصر اور علاقے کے مشاہیر علما و فقہا میں ہوتا تھا۔[۱]

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۶ ــــ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۶ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۵۵، ۱۵۶ ــــ تذکرہ احوالِ علمائے فرنگی محل ص ۱۳۱ ــــ تذکرہ علمائے فرنگی محلی ص ۵۷، ۵۸

# ۵۹۔ مولانا خرّم علی بلہوری

مولانا خرم علی بلہوری اپنے عہد کے اصحاب صلاح و تقویٰ علما و فقہا میں سے تھے۔ مولد و منشا بلہور ہے، جو صوبہ یو۔پی میں واقع ہے۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے گھر سے نکلے اور خاندان شاہ ولی اللہ کے ممتاز اساتذہ سے تحصیل کی۔ اخذ طریقت سید احمد شہید بریلوی سے کیا اور طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے۔ پھر باندہ گئے اور نواب ذوالفقار خاں بہادر رئیس باندہ سے وابستہ ہوگئے۔ نواب مذکور کے حکم سے حدیث و فقہ کی بعض ضخیم و اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا، جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

منقول ہے کہ جہاد کے لیے سید احمد شہید کے ساتھ سرحد گئے تھے، پھر وہاں سے واپس آگئے تھے، اس لیے کہ سید صاحب نے ان کو دعوت و تبلیغ کے لیے مقرر فرما دیا تھا۔ موثر وعظ کہتے تھے اور احیائے سنت و رد بدعت میں بہت سرگرم تھے۔

جلیل القدر عالم، فہم حدیث میں یکتا اور مسائل فقہ کی وضاحت و تبیین میں سرآمد روزگار تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف اور حدیث و فقہ کی بعض اہم اور ضخیم کتابوں کے مترجم تھے، جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ مشارق الانوار: یہ امام صغانی لاہوری (متوفی ۶۵۰ھ) کی نہایت عمدہ تصنیف ہے۔ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک مستند ذخیرہ ہے، جسے فاضل مصنف نے فقہی ابواب پر مرتب کیا۔ کسی زمانے میں یہ کتاب باقاعدہ نصاب درس میں شامل تھی۔ مولانا خرم علی نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ کتاب پر مقدمہ بھی تحریر کیا جو قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ تحفۃ الاخیار کے نام سے ستمبر ۱۹۰۰ء (جمادی الاولیٰ ۱۳۱۸ھ) میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپا۔ غالباً یہ اس کی سب سے پہلی اشاعت تھی۔ اس کے بعد کئی دفعہ یہ ترجمہ طبع ہوا۔

۲۔ غایۃ الاوطار اردو ترجمہ درالمختار: کتب فقہ میں "درالمختار" حنفی فقہ کی مشہور کتاب ہے جو مسائل فقہیہ کی جزئیات کو محتوی ہے۔ کتاب چار جلدوں میں

پھیلی ہوئی ہے اور مستند و معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ مولانا خرم علی نے ۱۲۵۰ھ میں نواب ذوالفقار خان بہادر کے حکم سے اس کا اردو ترجمہ شروع کیا۔ کافی حصے کا ترجمہ ہو چکا تھا، لیکن موت نے مہلت نہ دی اور ترجمہ مکمل نہ ہو سکا۔ باقی ترجمہ مولانا محمد احسن نانوتوی نے کیا۔ علم فقہ کی یہ بہت بڑی خدمت ہے جو مولانا خرم علی نے کی۔ یہ چاروں جلدیں ۱۸۷۶ء میں مطبع نول کشور کان پور اور لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔

۳۔ شفاء العلیل اردو ترجمہ القول الجمیل : حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف میں القول الجمیل، تصوف و طریقت، اس کے سلاسل، آدابِ موعظت و تذکیر اور اپنے بعض خاندانی اعمالِ مجرّبہ کے بارے میں ایک عمدہ تصنیف ہے۔ مولانا خرم علی نے شفاء العلیل کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا جو مطبع مجیدی کان پور سے ۱۳۳۵ھ میں شائع ہوا۔

۴۔ خدا کی قدرت : مولانا ممدوح بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار کا یہ ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ اس میں مسائل کتاب و سنت کو بہترین طریقے سے نظم کیا ہے۔ بہت عرصہ پیشتر یہ مجموعۂ اشعار مطبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد (دکن) میں شائع ہوا تھا۔

۵۔ نصیحۃ المسلمین : یہ رسالہ اتباعِ توحید و سنت کے موضوع پر ہے۔ بہت اچھا رسالہ ہے۔ مولانا خرم علی نے یہ ۱۲۲۸ھ میں تحریر فرمایا تھا۔ متعدد مرتبہ چھپ چکا ہے۔ مکتبہ سلفیہ لاہور نے اسے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا۔

۶۔ رسالہ فاتحہ خلف الامام : یہ اس دور کی تصنیف ہے، جب وہ مسلکِ حنفی سے وابستہ تھے۔ اس میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کی مخالفت کی ہے۔ بعد میں مسلکِ اہلِ حدیث اختیار کر لیا تھا اور مولانا محمد اسماعیل شہید سے وابستہ ہو گئے تھے۔

۷۔ جہادیہ : یہ ایک نظم ہے جو فضائلِ جہاد کے بیان میں ہے۔ سید احمد شہید کی فوج میں جنگ کے دوران یہ نظم پڑھی جاتی تھی۔ یہ نظم "سید احمد شہید" میں "جہادیہ" کے

عنوان سے مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے درج کی ہے [۵۲]

۸- آداب الحرمین :

بہر حال مولانا خرم علی بلہوری تیرھویں صدی ہجری کے نامور ہندی عالم و فقیہ اور فاضل تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی بہرہ ور تھے۔ سید احمد شہید سے انھوں نے بیعتِ جہاد و سلوک لکھنؤ میں کی تھی۔ انداز کلام اثر آفرین اور دل کش تھا۔ اتباعِ سنت اور اطاعتِ رسول میں رشکِ اقران تھے۔ مجاہد فی سبیل اللہ اور جنگ جُو تھے۔

اس بے مثال عالم نے ایک روایت کے مطابق ۱۲۷۱ھ میں اور ایک روایت کے مطابق ۱۲۷۶ھ میں سفر آخرت اختیار کیا [۵۳]

## ۶۰- مفتی خلیل الدین کاکوردی

علمائے کاکوری نے برصغیر پاک و ہند کی علمی و فقہی تاریخ میں بڑا نام پایا اور بہت شہرت حاصل کی۔ ان علمائے عظام اور فقہائے ذی شان نے مختلف اوقات اور مقامات میں افتا کی مسندیں بچھائیں، عدل و قضا کے مناصب کو زینت بخشی اور درس و تدریس کے غلغلے بلند کیے۔ ان حضرات میں ایک بزرگ مفتی خلیل الدین کاکوروی تھے، جن کے والدِ گرامی کا نام نجم الدین اور جدِ محترم کا حمید الدین کاکوردی تھا۔ دونوں اصحابِ فضل و کمال اور علوم میں سرآمدِ روزگار تھے۔ مولانا نجم الدین قاضی القضاۃ تھے۔ ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۲۹ھ کو فوت ہوئے اور مولانا حمید الدین کاکوروی نے غرۂ ذیقعدہ ۱۲۱۵ھ کو وفات پائی۔

مفتی خلیل الدین اسی خاندانِ عالی قدر کے گوہرِ شب چراغ تھے۔ علومِ عقلی و نقلی

---

[۵۲] سید احمد شہید حصہ دوم ص ۲۵۸ تا ۲۶۰

[۵۳] تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۶، ۵۷ ـــــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۵۸، ۱۵۹ ـــــ جماعت مجاہدین ص ۲۹۴ ـــــ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۵۰۹ تا ۵۱۲

میں یکتائے دہر تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین وفطین تھے۔ ۱۲۰۳ھ کو کاکوری میں پیدا ہوئے، اپنے والد مکرم قاضی نجم الدین اور مولانا روشن علی جون پوری کے حلقۂ شاگردی میں شمولیت کا فخر حاصل کیا، علم وفضل میں اس درجے ترقی کی کہ اپنے تمام اقران ومعاصرین سے سبقت لے گئے۔ کان پور کی مسندِ افتا پیش کی گئی اور عرصے تک اس پر متمکن رہے۔

پھر والیِ اودھ نواب سعادت علی خاں نے لکھنؤ بلالیا اور رصد خانے کا اہتمام ان کے سپرد کیا، بلکہ رصد خانہ انہی کی تجویز وتحریک سے قائم کیا گیا تھا، اس لیے کہ یہ علومِ ریاضی کے ماہر اور عالم تھے۔ نواب سعادت علی خاں کی وفات تک منتظمِ رصد خانہ رہے۔ پھر غازی الدین حیدر نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لی تو انھیں سفارتِ کلکتہ پر مامور کر دیا اور وہ کلکتے چلے گئے۔ اس خدمت کے بدلے پانچ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

مفتی خلیل الدین کاکوروی اپنے دور کے ممتاز مصنف اور مترجم بھی تھے مندرجہ ذیل کتابیں ان کی یادگارِ علمی ہیں۔

۱۔ ترجمہ باب التعزیرات در المختار: در المختار فقہ حنفی کی مستند اور ضخیم کتاب ہے۔ مسٹر رنگٹن ممبر کونسل کی فرمائش پر، انھوں نے اس کے باب التعزیرات کی فارسی میں شرح سپردِ قلم کی۔

۲۔ مرآۃ الاقالیم: فارسی میں ہے اور فنِ ہیئت کے قواعد پر مشتمل ہے۔

۳۔ جغرافیۃ الطرق والشوارع: فارسی میں ہے اور اس میں مملکتِ اودھ کا جغرافیہ بیان کیا ہے۔

۴۔ رسالہ طول البلد وغایۃ النہار: یہ بھی فارسی میں ہے۔

۵۔ رسالہ در تحقیق مرضِ ہیضہ: فارسی میں تصنیف کیا۔

۶۔ رسالہ در ابطال ظل مثلث۔

مفتی خلیل الدین نے اٹھتر برس کی عمر پا کر ۱۲۸۱ھ میں انتقال کیا[۴۵]

---

[۴۵] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۷۰، ۱۷۱ — تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۴۰ تا ۱۵۱ —

# ۶۱۔ قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری

قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری کے والد ماجد کا اسم گرامی ملا عرفان تھا۔ ملا عرفان دراصل خراسان کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کی نشوونما ہوئی۔ ابتدا میں علمائے خراسان ہی سے علم حاصل کیا، اس کے بعد واردِ ہند ہوئے، لکھنؤ پہنچے اور بحر العلوم مولانا عبدالعلی انصاری فرنگی محلی سے استفادہ کیا۔ پھر رام پور چلے گئے تھے، اس لیے "ملا عرفان رام پوری" کہلائے۔ جید علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری، انہی کے فرزندِ ارجمند تھے، جو اپنے عہد کے شیخ و فاضل اور عالمِ کبیر تھے۔ فقہ و اصول کے نامور علما میں سے تھے۔

قاضی خلیل الرحمٰن کی ولادت رام پور میں ہوئی اور وہیں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے والد مولانا عرفان رام پوری، مفتی شرف الدین رام پوری اور ملا محمد حسن انصاری لکھنوی سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عازم ٹونک ہوئے اور نواب امیر خاں کے عہد میں قاضی القضاۃ کے منصب عالی پر مامور کیے گئے۔ لیکن جب مولانا حیدر علی واردِ ٹونک ہوئے تو بعض فقہی اور علمی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے دونوں کے درمیان

---

علم و عمل ج ۱، ص ۱۴۵، ۱۴۶ ——— تذکرہ علمائے ہند اردو ترجمہ ص ۵۱۳

مفتی خلیل الدین کا سالِ ولادت جیسا کہ متن میں تحریر کیا گیا ۱۲۰۳ھ ہے۔ ان کے والد قاضی نجم الدین کاکوروی نے ۱۲۲۹ھ میں وفات پائی تھی اور بیٹے نے اپنے والد (قاضی نجم الدین) سے حصولِ علم کیا تھا، لیکن تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمہ (ص ۵۱۳) میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ مفتی خلیل الدین کاکوروی ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے علم حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کو یا تو سہو ہو گیا ہے یا یہ کتابت کی غلطی ہے۔ باپ ۱۲۲۹ھ میں وفات پا جائے اور بیٹا ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہو، اور پھر باپ سے علم بھی حاصل کرے، یہ کیوں کر ممکن ہے؟ یہ کتابت ہی کی غلطی ہو سکتی ہے۔

مناظرے اور مجادلے ہونے لگے۔ پھر قاضی صاحب ممدوح حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اور وطن واپس آئے تو ریاست جاورہ میں اقامت اختیار کرلی۔ اس وقت امیرِ جاورہ غوث محمد خاں تھا، وہ نہایت عزت واکرام سے پیش آیا اور ان کے مرتبے کے مطابق ملازمت عطا کی۔

قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری یوں تو تمام علوم متداولہ میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، لیکن ریاضی، علومِ ادب، تاریخ اور طب میں بالخصوص دسترس حاصل تھی۔ بہت اچھے مصنف اور شارح بھی تھے، مسطورہ تحت کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

۱۔ الدائر شرح علی منار الاصول۔

۲۔ تعلیقات علی حاشیہ غلام یحییٰ۔

۳۔ تعلیقات رسالہ میرزاہد۔

۴۔ جواب الاشکال المسمیٰ بجذر الاصم۔

۵۔ حاشیہ علی شرح المواقف۔

۶۔ رسم الخیر۔

۷۔ رسم الخیرات۔ یہ دونوں رسالے (رسم الخیر و رسم الخیرات) رسمِ فاتحہ وغیرہ سے متعلق ہیں۔

۸۔ مائۃ عامل: یہ کتاب اپنے بیٹے عبدالعزیز کے لیے تصنیف کی۔ اس کی مفصل شرح بھی لکھی۔

۹۔ منظومۃ فی العروض۔

۱۰۔ منظومہ فی جواب سوال [۵]

## ۶۲۔ مولانا خیر الدین زبیری سورتی

ہندوستان کا علاقہ سورت ہمیشہ علما وفقہا اور فضلا واتقیا کا مرکز رہا ہے۔ اس

---

۵ تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۲۲، ۱۲۳ —— علم وعمل ج ۱، ص ۷۰ —— نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۶۰، ۱۶۱ —— تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۵۶۸

سرزمینِ مردم خیز نے تیرھویں صدی ہجری میں جن اصحابِ کمال کو جنم دیا، ان میں مولانا خیرالدین زبیری سورتی کا اسمِ گرامی لائق تذکرہ ہے۔ والد کا نام نامی محمد زاہد اور دادا کا حسن محمد زبیری تھا۔ سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم حضرت زبیر بن عبدالمطلب سے ملتا ہے، اسی لیے زبیری کہلائے۔ شہر سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ مولانا عبدالغفور اور شیخ محمد بن عبدالرزاق حسینی اُچی ایسے ممتاز اساتذہ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا، اور نواحِ سورت میں اپنے دور کے محدث و فقیہ شمار کیے گئے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے مطابق بیعتِ طریقت شیخ نوراللہ سے کی۔ پھر اُن کے شاگرد شیخ نصراللہ سے مستفیض ہوئے۔ بعض ازاں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ مدینہ منورہ پہنچے تو شیخ محمد حیات سندھی کا سلسلۂ درسِ حدیث جاری تھا، اس میں شرکت کی اور سند و اجازۂ حدیث سے سرفراز ہوئے۔ اپنے وطن سورت واپس آئے تو خود مسندِ درسِ حدیث بچھائی اور پچاس سال یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ بعض کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں شواہد التجدید، ارشاد الطالبین اور تصوف و سلوک کے کچھ رسائل شامل ہیں۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی نے حدیقۂ احمدیہ کے حوالے سے ان کے بعض رسائل سے ان کے چند اقوال بیان کیے ہیں۔ مثلاً:

- ظاہر و باطن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو، اور اس کو اپنے عمل میں ظاہر کرو۔
- جو بات صحیح احادیث اور فقہ کے مستند ذخیرے میں پاؤ، اس پر کسی دلیل کا مطالبہ نہ کرو۔ حدیث اور فقہ ہی اصل دلیل ہے۔
- جب صحیح حدیث سے بات ثابت ہو جائے تو شک و ریب کے وہ کانٹے جو ذہن و فکر کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے ہیں، نکل جانے چاہئیں، اس لیے کہ تجلیِ ذاتِ حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت پر موقوف ہے، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران: ۳۱)

اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

— لوگوں کے افعال و کردار کی نکیر نہ کرتے پھرو، اگر وہ مذموم و ناپسندیدہ ہیں تو ان کو زبان سے نصیحت کرو۔

— اقوالِ صوفیا کو ہدفِ اعتراض نہ ٹھہراؤ، اگر ان کے قول و فعل کو بہ ظاہر خلافِ شرع پاؤ تو ان کی تاویل کرو۔ آئینۂ قلب کو کدورت، خیانت اور دھوکے بازی کے گرد و غبار سے صاف رکھو۔ اس لیے کہ میدانِ تاویل بہت وسیع ہے، اگر شعورِ تاویل سے خود کو عاجز پاؤ تو سکوت سے کام لو۔ اس سلسلے میں حضرت موسیٰ اور خضر کے واقعہ کو سامنے رکھو، حضرت موسیٰ پیغمبر تھے اور خضر کا عمل ان کے امورِ نبوت سے مختلف تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو نہیں سمجھ پائے تو ایک جاہل و ناواقف آدمی مرادِ عارف کو کیوں کر حیطۂ فہم میں لا سکتا ہے۔ نہ اُسے قبول کرو، نہ اس سے انکار کرو، بس سکوت سے کام لو، بہتری سکوت ہی میں ہے، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ شرائعِ سابقہ کو نہ مدارِ عمل ٹھہرایا جاتا ہے اور نہ ہدفِ انکار بنایا جاتا ہے۔

— اکابر صلحا کے نزدیک سب سے بڑی معصیت اعتراض ہے، کیوں کہ اعتراض فاعلِ حقیقی کی طرف لوٹتا ہے اور خیر و شر کا فاعل، اللہ ہے۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس: ۸)

پھر اس (انسان) کو بُرائی اور پرہیزگاری کی سمجھ دی۔

نیز فرمایا:

اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ۔ (ہود: ۱۲۳)

— سالک کو چاہیے کہ خیر اور شر کو مرکزِ توجہ ٹھہرائے بغیر، شہودِ حق میں مستغرق و منہمک رہے، جیساکہ وہ عالمِ طفولیت میں تھا۔

— نہایت درحقیقت بدایت کی طرف رجوع سے تعبیر ہے۔

— رزق اور دیگر معاملات میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ

تمھیں اسی قدر دیتا ہے، جس قدر کہ تمھارے مناسب حال اور مطابق مقام ہوتا ہے، جیسا کہ ماں باپ شفقت و مہربانی سے بچے کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ماں باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے اور وہ اپنی مخلوق پر سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

بہرحال مولانا خیر الدین زبیری سورتی بہت بڑے عالم و فقیہ اور سالک و صوفی تھے۔ انھوں نے ۱۰ رجب ۱۲۰۶ھ کو شہر سورت میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے[۵۶]

---

[۵۶] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۶۱، ۱۶۲ بحوالہ حدیقۂ احمدیہ۔

# د

## ۶۳: سیّد دلدار علی نقوی نصیر آبادی

سید دلدار علی حسینی نقوی، فاضل وقت، شیخ اور علامہ و مجتہد تھے۔ مسلکاً شیعہ تھے۔ والد کا نام سید محمد معین اور دادا کا سید عبد الہادی تھا۔ سید نجم الدین سبزواری کی نسل سے تھے۔ سلسلۂ نسب جعفر بن علی نقی سے ملتا ہے۔ دیارِ ہند کے یہ پہلے شیعہ عالم ہیں جنھوں نے اپنے علم و فضل اور کثرتِ معلومات و وسعتِ مطالعہ کی بنا پر اجتہاد کا دعویٰ کیا اور جمعہ و عیدین کی نمازوں کے لیے قیامِ جماعت کی طرح ڈالی۔ ہندوستان کے جلیل القدر عالمِ حدیث، فقیہ اور اصولی تھے۔

سید دلدار علی حسینی نقوی کی ولادت ۱۱۶۶ھ کے قریب یوپی کے شہر نصیر آباد میں ہوئی جو رائے بریلی سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے۔ حصولِ علم کے لیے آلہ آباد گئے، وہاں شیخ غلام حسین دکنی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور اکثر کتبِ درسیہ ان سے پڑھیں۔ پھر سندیلہ کا قصد کیا، وہاں مشہور ماہرِ علومِ حکمیہ ملا حمد اللہ سندیلوی کے فرزندِ مکرم مولانا حیدر علی سندیلوی کا سلسلۂ درس و افادہ جاری تھا، ان سے ملا حمد اللہ کی شرح تصدیقاتِ سلّم پڑھی اور بعض کتابوں کی تکمیل مولانا باب اللہ جون پوری سے کی۔

اس کے بعد ہندوستان سے باہر نکلے اور ۱۱۹۳ھ میں عازمِ عراق ہوئے اور نجف، کاظمین اور مشہد وغیرہ مقامات کی سیر کی۔ طوسی کی "الاستبصار" اور "الفوائد الحارہ" آقا باقر محمد البہبہانی سے پڑھیں۔ "شرح المختصر النافع" کا کچھ حصہ خود اس کے مصنف علی بن محمد علی طباطبائی سے پڑھا۔ حدیث کی بعض کتابوں کے لیے کربلا کے مقام میں مہدی بن ابو القاسم شہرستانی کی شاگردی کی۔ جب نجف گئے تو "الوافی" اور "معالم الاصول" کے کچھ حصے مہدی بن مرتضیٰ طباطبائی سے پڑھے، بعد ازاں انہی کی معیت میں کاظمین، عسکریین اور سُرّ مَن رَایٰ کا سفر کیا اور اس اثنا میں ان سے فیضِ کثیر حاصل کیا۔ اس کے

بعدہٗ ۱۱۹۴ھ میں مشہد کا سفر کیا، وہاں مہدی بن ہدایت اللہ موسوی اصفہانی سے ملاقات ہوئی، ان کی صحبت میں رہے، ان سے اخذِ علم کیا اور اجازہ سے سرفراز ہوئے۔

بعد ازاں واردِ ہند ہوئے اور کچھ عرصہ اپنے شہر نصیرآباد میں قیام رہا، پھر لکھنؤ آئے۔ اس زمانے میں سلطنتِ اودھ کا وزیر حسن رضاخاں تھا جو شیعہ تھا، اس سے تعلقات بڑھے تو اس نے ان کو اپنے بیٹوں کا معلّم اور اتالیق مقرر کر دیا، اور بلند مرتبے سے نوازا۔ مدت تک اس خدمت پر مامور رہے۔

اس زمانے میں شیعہ امامیہ بلادِ ہند کے مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے تھے۔ نہ مذہبِ شیعہ کی دعوت و تبلیغ کا کوئی انتظام تھا اور نہ کوئی ایسا مرکز تھا، جہاں یہ اپنا اجتماع یا اجلاس منعقد کر سکیں۔ شیخ محمد علی کشمیری ایک مشہور شیعہ عالم تھے جو فیض آباد میں مقیم تھے، انھوں نے ملک بھر کے شیعہ امرا و حکام کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ شیعہ فرقے کے لوگوں کو جمعے اور عیدین کی نمازیں باجماعت پڑھنے کی ترغیب دیں۔ اسی اثنا میں شیخ علی اکبر چشتی جو مشہور صوفی اور مردِ صالح تھے، لکھنؤ گئے، اودھ کا شیعہ وزیر حسن رضاخاں ان کا عقیدت مند تھا، وہ شیخ ممدوح سے ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ پر پہنچا تو وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز کے بعد حسن رضا ان سے ملا تو انھوں نے اقامتِ جماعت کی تاکید و تلقین فرمائی اور شیعہ مذہب کی روشنی میں اس کے فضائل بیان کیے۔ اب وزیر مذکور کو شیعہ عالم شیخ محمد علی کشمیری کی وہ بات یاد آئی جو اقامتِ جماعت کے لیے کچھ عرصہ پیشتر ان سے ہوئی تھی، چنانچہ اس نے اس کی پابندی کا عہد کیا اور والیِ اودھ نواب آصف الدولہ سے گفتگو ہوئی تو وہ بھی اس پر راضی ہو گیا۔ اس کے بعد صاحبِ ترجمہ سید دلدار علی نقوی نے جو شیعہ کے مجتہد تھے، نواب آصف الدولہ کے حکم سے ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ میں باجماعت نماز ادا کرنی شروع کی۔

سید دلدار علی نقوی وہ شیعہ مجتہد تھے، جنھوں نے اپنے مذہب کے احقاق و اشاعت اور دوسرے مذہبوں ـــــ بالخصوص احناف اور صوفیا وغیرہ ـــــ کے

ابطال و تردید کے لیے بے حد کوششیں کیں اور تبلیغ کے دائرے کو دور تک پھیلا دیا۔ اس کے نتیجے میں علاقہ اودھ میں اس مذہب کو بہت فروغ ہوا۔

سید ممدوح نے اپنی بعض تصانیف عراق بھیجیں اور اپنے شیوخ سے شرف اجازہ حاصل کیا، چنانچہ علامہ مہدی بن مرتضیٰ طباطبائی نجفی، علی بن محمد علی طباطبائی کربلائی اور مہدی بن ابو القاسم موسوی شہرستانی نے ان کو اجازہ سے مشرف کیا۔

سید موصوف بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ **اساس الاصول**: یہ کتاب ادلۂ اربعہ کے اثبات میں ہے۔

۲۔ **ابطال الفوائد المدنیہ**: میر محمد مومن استر آبادی کی کتاب کا رد ہے۔

۳۔ **عماد الاسلام**: یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد توحید کے، دوسری عدل کے، تیسری نبوت کے، چوتھی امامت کے اور پانچویں جلد معاد کے بارے میں ہے۔

۴۔ **منتہی الافکار**: اصول فقہ سے متعلق یہ ایک مبسوط کتاب ہے۔

۵۔ **شرح باب الزکوٰۃ**: ملا مجلسی کی حدیقۃ المتقین کے باب الزکوٰۃ کی شرح۔

۶۔ **شرح باب الصوم**: یہ ملا مجلسی کی حدیقۃ المتقین کے باب الصوم کی شرح ہے۔ یہ شرح دو جلدوں میں ہے۔

۷۔ **الشہاب الثاقب**: مذہب صوفیا کے رد میں۔

۸۔ اسی موضوع پر ایک اور رسالہ۔

۹۔ **المواعظ الحسینیہ**۔

۱۰۔ **صوارم الالٰہیات فی قطع شبہات عابدی العزیٰ واللات**: تحفہ اثنا عشریہ کے باب الالٰہیات کے رد میں ہے۔

۱۱۔ **حسام الاسلام**: یہ تحفہ اثنا عشریہ کے باب النبوات کے رد میں ہے۔

۱۲۔ **احیاء السنۃ**: یہ تحفہ اثنا عشریہ کے باب المعاد کے رد میں ہے۔

۱۳۔ **ذو الفقار**: یہ تحفہ اثنا عشریہ کے بارھویں باب کی تردید میں ہے، جس میں

ولا اور مسئلہ برا پر بحث کی ہے۔

۱۴۔ رسالہ فی اثبات الغیبیہ : اس میں صاحب العصر والزمان کے سلسلے میں تحفۂ اثنا عشریہ کا رد کیا گیا ہے۔

۱۵۔ رسالۃ فی اثبات الجمعۃ والجماعۃ فی غیبۃ الامام۔

۱۶۔ رسالۃ الاسانید : یہ اپنے بیٹے سید محمد کے لیے تحریر کیا۔

۱۷۔ مسکن القلوب : یہ ان کی آخری دور کی کتاب ہے جو اپنے بیٹے مہدی کی وفات کے بعد ۱۲۳۱ھ میں تصنیف کی۔

۱۸۔ رسالہ فی مسائل الخراج : ۱۲۳۴ھ میں لکھا۔

۱۹۔ رسالہ ذہبیہ : سونے اور چاندی کے برتنوں کے بارے میں ہے۔

۲۰۔ اشارۃ الاحزان : حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق ہے۔

۲۱۔ حاشیۃ علی شرح ہدایت الحکمۃ از صدر الدین شیرازی : یہ اوائل عمر کی تصنیف ہے۔

سید دلدار علی نقوی نے ۱۹ رجب ۱۲۳۵ھ کو غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں وفات پائی اور اسی شہر میں مقبرۂ حسینیہ میں مدفون ہوئے۔[1]

---

[1] نجوم السماء ص ۲۰۴ ـــــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۶۶ تا ۱۶۸ ـــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۰، ۶۱ ـــــ رودِ کوثر ص ۶۳۲ تا ۶۳۴

# ذ

## ۶۴- مولانا ذو الفقار علی دیوی

دیوہ، صوبہ یوپی کا ایک مشہور مقام ہے جو زمانۂ قدیم سے علم و علما کا مرکز چلا آرہا ہے۔ سلوک و تصوف میں بھی اس کو ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں یہاں جن حضرات نے جنم لیا اور فضیلت و کمال میں شہرت پائی، ان میں مولانا ذو الفقار علی دیوی کا نامِ نامی لائقِ تذکرہ ہے۔ یہ اپنے دور کے شیخ و فاضل اور علامہ تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: ذو الفقار علی بن محبوب علی بن محمد رفیع بن شیخ الاسلام بن عبدالباقی بن مفتی عبدالسلام اعظمی دیوی۔

مولانا ذو الفقار علی دیوہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ مولانا احمد حسین انصاری فرنگی محلی اور بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی سے حصولِ علم کیا اور فقہ و اصول اور علومِ عربی کے بلند مرتبت علما میں گردانے گئے۔

رائے بریلی بھی گئے، وہاں شیخ محمد عدل نقشبندی بریلوی کا سلسلۂ فیض جاری تھا، ان سے منسلک ہوئے اور اخذِ طریقت و تصوف کیا۔ عرصے تک ان کی خدمت میں رہنے اور مستفید و مستفیض ہونے کے مواقع میسر رہے۔ رائے بریلی میں مسندِ درس بھی بچھائی اور اس اثنا میں بے شمار علما و طلبا نے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔

رائے بریلی سے لکھنؤ آئے اور لکھنؤ کے منصبِ عدل و قضا پر متمکن ہوئے۔ اس کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا، علاوہ ازیں کئی درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات لکھے۔[1]

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۷۱

# ۶۵- قاضی ذوالفقار علی حیدرآبادی

برصغیر میں ارضِ دکن کو تہذیب و ثقافت اور علم و عرفان کی کثرت و فراوانی اور ارتقا و تقدم میں ہمیشہ درجۂ امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس سرزمین کو جن بزرگانِ دین اور فقہائے ذی شان نے رونق بخشی ان میں قاضی ذوالفقار علی بن قاضی یوسف حنفی کا اسمِ گرامی شامل ہے۔ یہ دراصل شاہ جہان پور کے رہنے والے تھے، پھر حیدرآباد آگئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ حنفی المسلک تھے اور اپنے علاقے کے نامور عالم و فقیہ تھے۔ پہلے ان کے والد (قاضی یوسف) حیدرآباد کے قاضی تھے، ان کی وفات کے بعد سکندر جاہ کے عہد میں ۱۲۴۰ھ میں اس منصب پر انھیں فائز کیا گیا۔ پھر تا زندگی یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۲۶۰ھ میں فوت ہوئے۔[۱]

---

[۱] تزک محبوبی — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۷۱

ر

## ۶۶- مولانا رشید الدین دہلوی

مغل حکومت کے دورِ زوال یعنی تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسویں میں دار الحکومت دہلی کی علمی رونقیں زوروں پر تھیں اور متعدد علما و فضلا تبلیغ دین، اشاعتِ اسلام اور درس و تدریس میں مصروف تھے۔ بہت سے اہلِ کمال مختلف علاقوں کی سکونت ترک کر کے دہلی میں آ بسے تھے اور پھر اسی شہر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ ان حضرات میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے والد کا نام امین الدین، دادا کا وحید الدین اور پردادا کا عبدالسلام تھا۔ آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے اور وہاں سے نقل مکانی کر کے دہلی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

رشید الدین خاں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ کتبِ درسیہ مفتی علی کبیر بنارسی سے پڑھیں، لیکن زیادہ تر حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی خدمت میں رہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ عبدالقادر دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ طویل عرصے تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے اور علومِ مروّجہ کے تمام گوشوں میں مہارت پیدا کی، یہاں تک کہ یکتائے روزگار اور یگانۂ دہر قرار پائے، علومِ معقول و منقول اور فروع و اصول میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ علامۂ زماں، شیخ عصر اور فاضلِ دوراں تھے۔ دہلی کی زمامِ تدریس ان کے ہاتھ میں تھی۔ جامع الاصول والفروع تھے۔ علاوہ ازیں عبادت گزار، حامیٔ کتاب و سنت، قامعِ بدعات و محدثات، بہت بڑے مدرس، نامور محقق، خطیب و مقرر اور منجھے ہوئے مناظر تھے۔ فکر و خیال کی سلامتی اور عمل و کردار کی پختگی میں عدیم المثال تھے۔

زیادہ عرصہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کی خدمت میں رہے، شاہ صاحب ان پر انتہائی شفقت فرماتے اور ان کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ذہن رسا

پایا تھا، طبیعت میں اثر پذیری کا غلبہ تھا، اور شاہ صاحب کی نظرِ التفات بھی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام علوم میں رشکِ اقران ہوئے۔ شیعیت کے موضوع سے متعلق ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور اس سلسلے کی جزئیات پر عبور رکھتے تھے۔ مناظرہ و مجادلے میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ شیعہ کے خلاف بہت کچھ لکھا اور ان کے علما سے جو مناظرے اور مباحثے کیے، وہ مشہور ہیں۔ تحریر و تقریر میں مخالف ان کے مقابلے میں عاجز و درماندہ ہو جاتا تھا۔

حکامِ وقت مولانا رشید الدین خاں کے علم و ادراک اور تقویٰ و زہد سے بہت متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ عہدۂ قضا قبول فرمالیں تاکہ عوام و خواص سب کو آسانی سے انصاف مہیا ہوتا رہے۔ لیکن انھوں نے یہ نازک اور اہم ذمے داری قبول کرنے سے گریز فرمایا اور اس منصب سے دور رہے۔ بالآخر جب اصرار زیادہ بڑھا اور ارکانِ حکومت نے کسی بڑے منصب پر متمکن ہونے پر زور دیا تو مدرسۂ شاہ جہان کی مدرسی قبول فرمائی اور اس منصب کو تمام مناصب پر ترجیح دی۔ سو روپے ماہانہ تنخواہ تھی اور اس کا بڑا حصہ فقرا و مساکین اور غربا و مستحقین پر خرچ ہو جاتا تھا، خود تنگ دستی اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن نہ کبھی کسی ایسے منصب کی خواہش کی جو زیادہ آمدنی کا باعث ہو، اور نہ یہ مطالبہ کیا کہ خدمتِ تدریس کا معاوضہ سو روپے سے بڑھایا جائے۔ جو ملتا تھا، اسی پر کفایت کرتے تھے۔

مولانا رشید الدین خاں دہلوی اپنے عہد کے عظیم القدر مصنف و مؤلف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ الشوکۃ العمریہ۔

۲۔ الصولۃ الغضنفریہ: یہ کتاب لکھنؤ کے شیعہ علما کے جواب میں نکاحِ متعہ کی بحث سے متعلق لکھی۔

۳۔ ایضاح لطافۃ المقال۔

۴۔ تفضیل الاصحاب۔

۵۔ اعانۃ الموحدین واہانۃ الملحدین: یہ کتاب کلکتے کے رام موہن رائے کے جواب میں لکھی جس نے دینِ ہنود کو چھوڑ کر "برہمو سماج" کے نام سے ایک نیا دین ایجاد کیا تھا۔

۶۔ المکاتیب: مولانا رشید الدین خاں اور شیخ احمد عرب یمانی شروانی (مصنف نفحۃ الیمن) کے خطوط[1] کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جو ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔

فارسی میں تو مہارت رکھتے ہی تھے، عربی بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ تمام وقت علوم دینیہ میں مشغولیت اور مباحثاتِ علمی میں مصروفیت میں گزرتا۔ دہلی کے حلقۂ اہلِ علم کی آبرو تھے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری تذکرہ علمائے ہند کے اردو ترجمہ میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے بارے میں مولوی عبدالقادر رام پوری کے حوالے سے لکھتے ہیں: "تعلیم و تعلم کی خوب مشق تھی، ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے، مگر مناظرے میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے، نمائش کے زیادہ پابند تھے۔ ہر فن کی بہت کچھ معلومات رکھتے تھے۔ جو کچھ کہتے دراز و طویل، بالخصوص مباحثہ اختلافیہ دینیہ میں یہی طریقہ تھا اور سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں رد و قدح کی گنجائش نہیں رہی۔"

---

[1] نفحۃ الیمن عربی ادب کی ایک مشہور ابتدائی کتاب ہے، پاک و ہند کے عربی مدارس میں عام طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے مصنف کا نام شیخ احمد یمنی شروانی ہے۔ وہ بارھویں صدی ہجری کے آخر یا تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں برصغیر آئے۔ یہاں کے تمام بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی لیکن زیادہ تر کلکتے میں مقیم رہے۔ عربی ادب میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ "نفحۃ الیمن" انھوں نے صدر مدرس مدرسہ کلکتہ لیمڈون کی فرمائش پر لکھی اور اتنی مقبول متداول ہوئی کہ تمام ہندوستان کے مدارسِ عربیہ دینیہ کے نصاب میں شامل ہو گئی۔ لکھنؤ کے فرماں روا غازی الدین حیدر سے بھی ان کے مراسم تھے۔ اس کے کہنے سے "مناقب حیدریہ" لکھی۔ شیخ احمد یمانی شافعی المسلک فقیہ تھے۔

آخر عمر میں حج بیت اللہ کا ارادہ تھا لیکن پورا نہ ہو سکا۔ ستر برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ بیماری اور ضعف کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ۱۲۴۳ھ کو موت کی آغوش میں چلے گئے۔[۵۲]

## ۶۷۔ مولانا رضا علی خاں بریلوی

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر بانس بریلی میں جن علما و فقہا نے جنم لیا اور ناموری حاصل کی، ان میں مولانا رضا علی بریلوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: رضا علی بن کاظم علی بن اعظم شاہ بن محمد سعادت یار خاں افغانی۔ یہ دراصل بھڑیچ پٹھان تھے۔ بھڑیچ، پٹھانوں کا ایک گروہ ہے، جس کو روہیلہ کہتے ہیں۔

مولانا رضا علی خاں کے اسلاف میں سے بعض بزرگ ہندوستان آئے اور سلاطینِ دہلی سے تقرب پیدا کیا، اس کے نتیجے میں ان کے آبا و اجداد چھ ہزاری کے مناصبِ جلیلہ سے سرفراز ہوئے اور بڑے بڑے عہدوں پر ان کو متمکن کیا گیا۔ ان حضرات نے بانس بریلی کو اپنا مسکن قرار دیا۔

اس خاندانِ عالی قدر میں ۱۲۲۴ھ کو مولانا رضا علی پیدا ہوئے اور اسی شہر میں پرورش پائی۔ اس زمانے میں رام پور کے ممتاز عالم قاضی خلیل الرحمٰن رام پوری کا سلسلۂ درس ٹونک میں جاری تھا، مولانا رضا علی نے ٹونک کا عزم کیا اور قاضی صاحب ممدوح کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور ان سے کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ تیئیس سال کی عمر میں اکتسابِ علومِ عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ اس قدر ذہین اور تیز فکر تھے کہ علومِ متداولہ کی تمام کتابوں پر نظر تھی، بالخصوص علمِ فقہ

---

۵۲ ابجد العلوم ص ۹۱۷ —— علم و عمل ج ۱ ص ۲۱۳ —— تذکرہ علمائے ہند ص ۶۳ —— الیانع الجنی ص ۷۷ —— نزہۃ الخواطر ۷ ص ۱۷۹ —— تذکرہ اہلِ دہلی ص ۷۰ تا ۷۲ —— واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۴۰۹، ۴۱۰ —— آثار الصنادید ص ۲۶۴، ۲۶۵ —— تاریخی مقالات ص ۲۴۷، ۲۴۸ —— تذکرہ علمائے ہند اردو ترجمہ ص ۱۹۱، ۱۹۲

میں کامل عبور حاصل تھا۔ بہت اچھے واعظ تھے اور موثر و دل پذیر وعظ کہتے تھے۔ لینت کلام، سبقتِ سلام، زہد و قناعت، حلم و تواضع اور مکارم اخلاق میں اپنی مثال آپ تھے۔ بعض امور میں اپنے اماثل و اقران سے فائق تر تھے۔

مولانا رضا علی خاں بریلوی برصغیر پاک و ہند کے مشہور و ممتاز عالم مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے جدِ امجد تھے۔ مولانا احمد رضا خاں کے والدِ ماجد کا اسم گرامی نقی علی خاں تھا۔

مولانا رضا علی خاں نے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی [۳۵]

## ۶۸۔ مفتی رضی الدین کاکوروی

دیارِ ہند کے شہر کاکوری کو عرصۂ دراز تک علما و فقہا اور فضلا و زعما کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہاں کے کئی علمائے کرام قضا و افتا کے مناصبِ جلیلہ پر فائز رہے ہیں اور خاص طور پر مغل بادشاہوں نے ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے امرا و وزرا کے ہاں بھی ان کو اعزاز و اکرام حاصل رہا ہے۔

علمائے کاکوری میں مفتی رضی الدین کاکوروی نے تیرھویں صدی ہجری میں بڑی شہرت پائی، یہ اپنے علاقے کے شیخ و فاضل اور اونچے مرتبے کے عالم و فقیہ تھے۔ والد کا نام قاضی علیم الدین اور دادا کا قاضی نجم الدین تھا۔ کاکوری اور اس کے اطراف و جوانب میں ان اصحابِ فضل کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور فقہائے حنفیہ میں ان کا علمی و فقہی مرتبہ بہت بلند تھا۔

مفتی رضی الدین کی ولادت ۱۲۱۶ھ کو کاکوری میں ہوئی اور وہیں پرورش پائی۔ ان کے والد قاضی علیم الدین کاکوروی اپنے زمانے کے جید عالم اور مفتی و قاضی تھے، لائق بیٹے نے ان سے کسبِ علم کیا۔ مزید تحصیل کے لیے اس دور کے جلیل القدر فاضل شیخ فضل اللہ عثمانی نیوتنی کی شاگردی اختیار کی جو اس عہد کے محدث و فقیہ اور ان کے دادا

---

[۳۵] تذکرہ علمائے ہند ص ۶۴ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۷۹

قاضی نجم الدین کاکوروی کے تلمیذ تھے۔ بعد ازاں حدیث کی کتابیں اپنے والد کے عمِ محترم شیخ امین الدین محدث سے پڑھیں۔ اخذِ طریقت بھی انہی سے کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب دہلی میں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کی مسندِ تدریس آراستہ تھی اور ملک و بیرونِ ملک سے گروہ در گروہ اصحابِ علم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ علمِ حدیث کی تعلیم میں برصغیر میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اور ہر طرف ان کے فضل و کمال کا شہرہ تھا۔ مفتی رضی الدین کاکوروی نے ان کے درِ فیض پر حاضری دی اور ان سے کتبِ حدیث پڑھیں۔

جب تحصیلِ علم سے فارغ ہو چکے اور سند و اجازہ سے بہرہ ور ہو گئے تو دہلی کا منصبِ افتاان کے سپرد کیا گیا۔ یہ ایک بہت ہی ذمہ دارانہ منصب اور عظیم عہدہ تھا، جس پر اسی شخص کو مامور و متعین کیا جاتا تھا جو تمام علوم متداولہ بالخصوص قرآن وحدیث اور فقہ میں ماہر ہوتا تھا۔ مفتی رضی الدین کو اسی بنا پر دار الحکومت دہلی کا یہ اعزاز بخشا گیا کہ وہ ہر اعتبار سے اس کے اہل تھے۔ ایک مدت تک وہ دہلی میں یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد ملک کے مختلف بلاد و امصار میں گئے اور لوگوں کو خوب مستفید و مستفیض فرمایا۔

مفتی صاحب ممدوح نے ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ کو کاکوری میں وفات پائی[۵۴]

## ۶۹۔ شیخ رفیع الدین فاروقی مرادآبادی

شیخ رفیع الدین مرادآبادی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: رفیع الدین بن فرید الدین بن عظمت اللہ بن عصمت اللہ بن قاضی عبد القادر فاروقی لکھنوی ثم مرادآبادی — اپنے عصر کے عالمِ کبیر، شیخِ وقت اور مشہور فاضل تھے۔

۱۱۳۴ھ کو مرادآباد میں پیدا ہوئے اور اپنے شہر کے اساتذہ سے کسبِ علم کیا۔ اس

---

[۵۴] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۸۰ بحوالہ مجمع العلما

زمانے میں دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا غلغلۂ درس بلند تھا، رفیع الدین نے دہلی کے لیے رختِ سفر باندھا اور حضرت شاہ صاحب کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بھی ان کی علمی صحبتیں رہیں، جن میں بہت سے دقیق و اہم مسائل زیرِ بحث آتے تھے۔ اس کے بعد اپنے وطن مراد آباد تشریف لے گئے، وہیں درس و افادے کا سلسلہ شروع کیا اور مدت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

بعد ازاں ۱۲۰۱ھ میں ارادۂ حج کے لیے گھر سے نکلے، سورت پہنچے تو شیخ محمد حیات سندھی کے شاگردِ عالی مرتبت شیخ خیر الدین سورتی (متوفی ۱۰ رجب ۱۲۰۶ھ) کا معرکۂ درس و تدریس جاری تھا، اس میں شرکت کی، ان سے صحیح بخاری پڑھی اور سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔

شیخ خیر الدین سورتی سے استفادے کے بعد کشتی پر سوار ہوئے اور شیخ ولی اللہ برہان پوری (متوفی ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۰۷ھ) کی معیت میں سفرِ حجاز پر روانہ ہوئے۔ حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، متعدد مشائخ و علما سے ملے اور ان سے فیض یاب ہوئے۔ ۱۲۰۳ھ کو واپس ہندوستان آئے اور حالاتِ حرمین اور سفرِ حجاز کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی۔

شیخ رفیع الدین مراد آبادی تیرھویں صدی ہجری کے مشہور افاضل اور ممتاز فقہا میں سے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے، جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ قصر الامال بذکر الحال والمال۔

۲۔ سلوا الکیئب بذکر الحبیب۔

۳۔ شرح الاربعین النوویہ۔

۴۔ کنز الحساب۔

۵۔ تذکرۃ المشائخ۔

۶۔ تذکرۃ الملوک۔

۷۔ تاریخ الافاغنہ۔

۸۔ کتاب الاذکار۔

۹۔ ترجمہ عین العلم۔

۱۰۔ شرح غنیۃ الطالبین۔

۱۱۔ الافادات العزیزیہ: اس میں انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی وہ تحریریں جمع کی ہیں، جو انھوں نے تفسیر کے سلسلے میں ان کو لکھ کر بھیجیں۔ یہ کتاب بہت سے عمدہ تفسیری فوائد پر مشتمل ہے۔

شیخ رفیع الدین مراد آبادی نے ۸۹ سال عمر پاکر ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۲۳ کو مراد آباد میں مرضِ استسقا سے انتقال کیا[۵]

## ۷۰۔ شاہ رفیع الدین دہلوی

ہندوستان میں قرآن وحدیث اور دیگر علومِ متداولہ کی جو خدمت خاندانِ ولی اللٰہی نے کی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی بارھویں صدی ہجری میں خطۂ ہند کے جلیل القدر محدث اور رفیع المرتبت مصنف تھے۔ ان کو اللہ نے چار بیٹے عطا فرمائے اور چاروں اپنے زمانے کے بے نظیر عالم تھے۔ ان کے اسمائے گرامی علی الترتیب یہ ہیں:

۱۔ سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ وفات ۷ شوال ۱۲۳۹ھ

۲۔ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی۔ وفات ۶ شوال ۱۲۳۳ھ

۳۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی۔ وفات ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ

۴۔ حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی۔ وفات ۱۲۲۷ھ

---

۵ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۶ (۱۵ ذی الحجہ ۱۲۱۸ھ مرقوم ہے) ——— نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۸۲ (۲۵ ذی الحجہ ۱۲۲۳ھ لکھا ہے) ——— اتحاف النبلاء ص ۲۵۱ (میں ۱۲۱۸ھ مرقوم ہے) ——— حدائق الحنفیہ ص ۴۶۳ (۱۵ ذی الحجہ ۱۲۱۸ھ ہے)

حضرت شاہ ولی اللہ کے ان چار فرزندانِ گرامی میں سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز اور سب سے چھوٹے شاہ عبدالغنی ہیں، لیکن وفات سب سے پہلے چھوٹے یعنی شاہ عبدالغنی نے پائی، اس کے بعد، ان سے بڑے شاہ عبدالقادر نے، پھر ان سے بڑے شاہ رفیع الدین نے اور سب کے بعد سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز نے اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

شاہ رفیع الدین دہلوی، مترجم قرآن، محدث دوراں، فقیہ زماں اور عدیم المثال متکلم و اصولی تھے۔ فرید العصر اور نادر الدہر عالم تھے۔ ۱۱۶۳ھ (۱۷۴۹ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے والدِ گرامی شاہ ولی اللہ سے حصولِ علم کیا اور سند و اجازہ سے سرفراز ہوئے۔ اخذِ طریقت شیخ محمد عاشق پھلتی سے کیا۔ بیس برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے تھے، پھر مسندِ درس و افتا کو زینت بخشی۔ علوم دینیہ اور فنونِ عقلیہ میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ ادب و شاعری میں بھی مرجع اربابِ استعداد تھے۔

شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد درس و تدریس کے فرائض ان کے فرزندِ کبیر شاہ عبدالعزیز انجام دیتے تھے۔ افتا کی ذمے داریاں بھی انھی کے سپرد تھیں۔ لیکن جب شاہ عبدالعزیز کبرسنی کو پہنچ گئے اور نابینا ہوگئے، جسمانی طور سے کمزور اور کثرت امراض میں مبتلا ہوگئے تو یہ تمام اہم ذمے داریاں شاہ رفیع الدین کی طرف منتقل ہوگئیں۔ ان باکمال حضرات میں سے بھی جو شاہ عبدالعزیز سے سندِ فضیلت حاصل کرچکے تھے، متعدد لوگ شاہ رفیع الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے تبحر علمی سے استفادہ کیا اور سند و اجازہ کی سعادت حاصل کی۔

شاہ رفیع الدین ہر شعبۂ فن میں ماہر اور ہر گوشۂ علم میں کامل تھے۔ حفظ و اتقان کی نعمت سے مالا مال تھے اور تمام صلاحیتوں سے اللہ نے انھیں نوازا تھا۔ اتقا و پرہیزگاری، متانت و سنجیدگی، عدل و راست بازی، انصاف شعاری، عجز و انکساری اور حلم و بردباری وغیرہ تمام اوصاف ان کی ذات میں جمع تھے۔ حرص و آز سے بے زار اور دنیا کے طمع و لالچ سے نفور تھے۔

انھوں نے اپنے اوقاتِ شب و روز کو چند حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور جو حصہ

وقت جس کام کے لیے خاص تھا، اس میں وہی کام کرتے تھے۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، فتووں کے جواب، وظائف و اوراد، عبادت، گھر کے ضروری کام کاج، یہ ان کے اہم مشاغل تھے اور ہر ایک کے لیے وقت متعین تھا۔

وہ عربی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ شیخ بوعلی سینا چوتھی صدی ہجری کا مشہور فاضل اور فنِ طب کا موجد و ماہر گزرا ہے، اس نے عربی میں ایک پُرزور قصیدہ نفس اور ماہیت و حقیقتِ نفس کے بارے میں لکھا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا نہایت عمدہ جواب پیرایۂ نظم میں دیا تھا۔ شاہ رفیع الدین نے اس کو مخمس کیا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے بارے میں انھوں نے ایک شان دار قصیدہ کہا۔

شاہ رفیع الدین صاحب متعدد کتب و رسائل کے مصنف تھے، جن میں سے ہر ایک کو اپنے موضوع میں بہت اہمیت حاصل ہے، ان میں چند تصانیف یہ ہیں:

۱۔ رسالہ در عروض

۲۔ دمغ الباطل

۳۔ اسرار المحبۃ

۴۔ رسالہ در اثبات شقِ قمر

۵۔ رسالہ در مقدمہ علم

۶۔ رسالہ در تاریخ

۷۔ رسالہ در آثارِ قیامت

۸۔ رسالہ در تحقیقِ الوان

۹۔ رسالہ فی عقد الانامل

۱۰۔ کتاب تکمیل الصناعۃ

۱۱۔ رسالہ در حجاب

۱۲۔ رسالہ در برہان تمانع

۱۳۔ رسالہ در علم منطق

۱۴۔ رسالہ فی امور عامہ

۱۵۔ حاشیہ علی میر زاہد

شاہ صاحب کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآنِ مجید کا اردو میں لفظی ترجمہ کیا، جو آج بھی اسی طرح مقبول و متداول ہے، جیساکہ پہلے تھا۔

انھوں نے اس زمانے میں ترجمہ کیا جب کہ اس کی کوئی مثال سامنے نہیں تھی اور اردو زبان بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی۔ نہ اس کے قواعد مرتب ہوئے تھے اور نہ واضح اصول متعین ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں قرآنِ مجید کا ترجمہ کرنا ہر لحاظ سے انتہائی مشکل تھا، یہ مشکل کام اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آسان کر دیا۔ یہ ایک عظیم صدقۂ جاریہ ہے، جس سے بے شمار لوگ مستفید ہوئے اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔

شاہ صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ فنِ ریاضی کے بہت ماہر تھے، شاہ عبدالعزیز نے اپنے ملفوظات میں اس کا ذکر کیا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگرچہ شاہ رفیع الدین تمام علوم میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن علمِ ریاضی میں ان کو بالخصوص یدِ طولیٰ حاصل ہے۔

شاہ رفیع الدین نے اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں ۶ شوال ۱۲۳۳ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ شاہ عبدالعزیز ان پر انتہائی شفقت فرماتے تھے، ان کے علم و فضل اور تحقیق و کاوش پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کبر سنی کو پہنچ گئے اور نابینا ہو گئے تو اپنی جگہ انھی کو مقرر فرمایا اور درس و افتا کی ذمے داریاں انھی کے سپرد کر دیں۔ لیکن ان کے لیے یہ انتہائی حزن و ملال کی بات تھی کہ وہ بھی ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے۔

جب شاہ رفیع الدین کا جنازہ اٹھا تو شاہ عبدالعزیز نے باوجود کمزور اور نابینا ہونے کے جنازے کو ہاتھ لگانے اور کندھا دینے کی کوشش کی، یہ منظر بڑا دردناک تھا[۵۶]

---

۵۶۔ شاہ رفیع الدین کے حالات کے لیے دیکھیے: آثار الصنادید ص ۲۶۶ تا ۲۶۸ ——

شاہ رفیع الدین کے چار بیٹے تھے۔ شاہ محمد موسیٰ، محمد عیسیٰ، محمد مخصوص اللہ اور حسن جان۔ شاہ محمد موسیٰ کی شادی اپنے عم محترم شاہ عبدالعزیز کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔

شاہ رفیع الدین کے یہ چاروں بیٹے اگرچہ اصحابِ فضیلت و کمال تھے، لیکن شاہ محمد مخصوص اللہ اپنے علم و فضل اور نیکی و تقویٰ میں خاص طور پر مشہور تھے۔ تمام علوم شاہ عبدالعزیز سے پڑھے اور بہت جلد اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ طویل عرصے تک طلبا کی تعلیم و تدریس میں بھی مشغول رہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عقاید و کلام اور اصول وغیرہ علوم میں مجتہدانہ نظر رکھتے تھے اور ہر علم میں ماہر تھے۔ عابد و زاہد تھے اور طبیعت قانع پائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آخر عمر میں سر رشتۂ تدریس سے الگ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور اپنے آپ کو عبادتِ الٰہی کے لیے وقف کر دیا تھا۔

مولانا امام خاں نوشہروی لکھتے ہیں کہ زاہد و عابد شب زندہ دار تھے۔ تدریس و تعلیم کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ ان کے شاگردوں کی جماعت میں سر سید احمد خاں بھی شامل ہیں۔ عاملِ آمین و رفع الیدین تھے، سر سید بھی ان کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اس سنتِ نبوی پر عمل پیرا رہے۔

منقول ہے کہ مغلیہ خاندان کی شہزادیاں حویلی میں تشریف لانے کی زحمت دیتیں اور پر تکلف کھانوں کے خوان خدمتِ عالی میں پیش ہوتے، آپ ان پر دعا پڑھتے اور

---

ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز ص ۱۵۹ تا ۱۶۱ — واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۸ — ابجد العلوم ص ۹۱۵ — الیانع الجنی ص ۷۵، ۷۶ — تذکرہ علمائے ہند ص ۶۶ — علم و عمل ج ۱ ص ۲۴۸، ۲۴۹ — حدائق الحنفیہ ص ۴۶۹، ۴۷۰ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۸۲ تا ۱۸۶ — یادگارِ دہلی ص ۱۰۳ — تاریخی مقالات ص ۲۴۵، ۲۴۶ — رود کوثر ص ۵۹۶ — حیاتِ ولی ص ۶۲۸ تا ۶۳۴ — تراجم علمائے حدیث ہند ص ۶۵، ۶۶ —

مساکین کو بانٹ دیتے۔ طلبائے علم اعتراض کرتے تو فرماتے میں اس کھانے کو متوفی کی ملکیت میں دے دیتا ہوں۔ پھر اعتراض ہوتا تو فرماتے "میاں اس بہانے سے مساکین کو کھانا مل جاتا ہے۔"

ان کے مدرسے میں بھی انواع و اقسام کے کھانوں کے خوان آتے، لیکن سب چیزیں غربا و مساکین کو بانٹ دی جاتیں۔

شاہ محمد مخصوص اللہ نے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) کو دہلی میں وفات پائی۔ ان کی ایک صاحب زادی تھیں، ان کا نام امۃ الغفار تھا، صحاحِ ستہ پڑھی ہوئی تھیں اور عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔[۵۷]

## ۷۱۔ شیخ رؤف احمد رام پوری

شیخ رؤف احمد بن شعور احمد بن محمد شرف بن رضی الدین فاروقی، رام پوری، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ نہایت نیک، فاضل اور متقی بزرگ تھے۔ اپنے دور کے مفسر و محدث اور فقیہ تھے۔ شاہ ابو سعید دہلوی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ مولد و منشا رام پور ہے۔ مفتی شرف الدین رام پوری سے حصولِ علم کیا۔ بعد ازاں عازمِ دہلی ہوئے اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے حلقۂ درس میں شرکت کی۔ ان سے خوب استفادہ کیا۔ اخذِ طریقت شیخ درگاہی اور اس کے بعد شاہ غلام علی سے کیا۔ عرصے تک منصبِ مشیخت پر فائز اور مسندِ دعوت و ارشاد پر متمکن رہے۔ بے شمار حضرات نے ان سے فیض پایا اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے قالب میں ڈھالا۔

بعد ازاں بھوپال گئے اور وہاں اقامت گزیں ہوئے۔ قیامِ بھوپال کے زمانے

---

[۵۷] آثار الصنادید ص ۲۶۸ —— واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۵۸۹ —— حیاتِ ولی ص ۶۳۴، ۶۳۵ —— تراجم علمائے حدیث ہند ص ۱۱۳ تا ۱۱۵ —— تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۳ —— تاریخی مقالات ص ۲۴۸ ——

میں انھوں نے اسلام کی بہت خدمت کی اور لوگوں کو صراطِ مستقیم پر گام زن رہنے کی تلقین فرماتے رہے۔

اچھے شاعر تھے اور رافت تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔

شیخ رؤف احمد فاروقی، مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں یہ کتابیں شامل ہیں:

۱۔ تفسیر رؤفی : یہ دو جلدوں میں قرآنِ مجید کی تفسیر ہے اور اردو زبان میں ہے۔

۲۔ درالمعارف : اس نام سے انھوں نے اپنے مرشد شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات جمع کیے تھے۔

۳۔ رسالہ در اذکار و اشغال : وظائف و اوراد اور اذکار و اشغال کے سلسلے میں یہ ایک رسالہ ہے۔

۴۔ ارکانِ اسلام : یہ کتاب اردو میں ہے۔

۵۔ مثنوی یوسف زلیخا : یہ بھی اردو میں ہے۔

۶۔ معراج نامہ : اردو نثر میں ہے۔

۷۔ سلوک العارفین : یہ فارسی میں ہے۔

۸۔ شرابِ رحیق : فارسی میں ہے۔

۹۔ جواہرِ علویہ : یہ کتاب بھی فارسی میں ہے۔

۱۰۔ مثنوی اسرارِ غیب :

۱۱۔ مراتب الوصول :

۱۲۔ رسالہ صادقہ مصدوقہ :

۱۳۔ دیوانِ رافت : یہ اردو اور فارسی میں ان کا مجموعۂ کلام ہے۔

اس عالم و فقیہ نے ۱۲۴۹ھ میں وفات پائی۔

مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند (صفحہ ۶۷) میں لکھا ہے کہ انھوں نے

تفسیر رؤفی کی تصنیف کا آغاز ۱۲۳۹ھ میں کیا اور اختتام ۱۲۴۸ھ میں ہوا۔ بھوپال سے حج کے لیے روانہ ہوئے تھے کہ ۱۲۰۳ھ کو جہاز میں وفات پا گئے۔

ظاہر ہے، رحمان علی کے درج کردہ یہ سنین صحیح نہیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شیخ رؤف احمد رام پوری ۱۴ محرم ۱۲۰۱ھ کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام رحمان بخش ہے۔ علومِ عقلیہ کی تحصیل کے بعد شیخ درگاہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بارہ سال ان سے منسلک رہے۔ پھر شاہ غلام علی کی خدمت میں دہلی گئے اور سلوک و تصوف میں اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے ــــ ۱۲۴۸ھ میں تفسیر رؤفی تصنیف کی اور اس سے ایک سال بعد ۱۲۴۹ھ میں وفات پا گئے۔ عبدالغفور نے مندرجہ ذیل قطعے میں تاریخ کہی:

رافت آں قبلہ اربابِ کمال     از جہاں رفت بسوئے جنت
بہر تاریخ رحیلش نساخ     شد رقم قدوۂ جنت رافت[۵۸]

## ۲۷- مفتی ریاض الدین کاکوروی

فقہائے کاکوری ہیں مفتی ریاض الدین بن قاضی علیم الدین بن قاضی نجم الدین کاکوروی قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے عہد کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے، اور تقویٰ و صلاح کے اوصاف سے متصف تھے۔ ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر اپنے والد قاضی علیم الدین اور شیخ فضل اللہ عثمانی نیوتنی سے اکتسابِ علم کیا۔ فنِ

---

۵۸ شیخ رؤف احمد مجددی رام پوری کے حالات کے لیے یہ کتابیں دیکھیے:
تذکرہ کاملانِ رام پور ص ۱۴۳ تا ۱۴۷ ــــ حدائق الحنفیہ ص ۴۷۲، ۴۷۳ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۸۸ ــــ انتخابِ یادگار ص ۱۴۳ تا ۱۴۵ ــــ جواہر علویہ ص ۲۷۱، ۲۷۲ ــــ تذکرہ علمائے ہند اردو ترجمہ ص ۱۹۸، ۱۹۹ ــــ خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۷۰۳، ۷۰۴ ــــ تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان ص ۴۶۸ ــــ تذکرہ گلشنِ بے خار ص ۸۴، ۸۵ ــــ تذکرہ علمائے ہند (فارسی) ص ۶۶، ۶۷

حدیث اور اس کے متعلقات کے حصول پر بالخصوص عنانِ توجہ مرتکز فرمائی اور مولانا حسین احمد ملیح آبادی، مرزا حسن علی لکھنوی، مولانا نورالحسن کاندھلوی اور اپنے عم مکرم شیخ حمیدالدین کاکوروی سے علومِ حدیث کی تکمیل کی اور سند و اجازہ حاصل کیا۔ اخذِ طریقت بھی شیخ حمیدالدین کاکوروی سے کیا۔

جب علوم و فنون سے فارغ ہو چکے اور تصوف و طریقت سے بہرہ اندوز ہو گئے تو خود درس و افادے کا سلسلہ شروع کیا اور عرصۂ دراز تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں ان سے بے شمار علما و طلبا نے فیض حاصل کیا۔

نہایت قوی الحفظ اور ذکی و فطین تھے۔ اللہ نے ان کو بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ علوم و فنون کے سب پہلوؤں پر گہری اور عمیق نظر رکھتے تھے۔ اپنے اقران و معاصرین میں عزت و احترام کے مالک تھے۔

اس زمانے میں رام پور کا حکمران نواب کلب علی خاں تھا۔ اس کو ان کی خصوصیاتِ گوناگوں کا علم ہوا تو رام پور تشریف لانے کی زحمت دی اور ریاست کا منصبِ افتا پیش کیا۔ یہ اس عہد کا ایک عظیم منصب تھا، جس پر اسی شخص کو مامور و متعین کیا جاتا تھا، جو تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ علوم کا ماہر ہوتا تھا۔ اس منصبِ جلیلہ پر وہ کافی عرصہ فائز رہے۔

اس کے بعد حیدرآباد تشریف لے گئے، وہاں کے قیام پر تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ غرۂ صفر ۱۲۹۵ھ کو حیدرآباد میں انتقال کر گئے[۵۹]

## دیگر فقہائے کرام

ذیل میں ردیف ر کے ان فقہائے کرام کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کے چند سطور سے زیادہ حالات میسر نہیں ہو سکے۔

۱۔ **مولانا رجب علی بن امام بخش بن جاراللہ جون پوری:** حنفی المسلک فقیہ اور

---

۵۹ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۸۸، ۱۸۹ بحوالہ مجمع العلما

ممتاز شیخ و فاضل تھے۔ بہت بڑے واعظ اور مبلّغ بھی تھے۔ ولادت و تربیت جون پور میں ہوئی۔ کتبِ درسیہ مولانا سخاوت علی جون پوری، مولانا قدرت علی ردولوی اور مولانا احمد علی چریا کوٹی سے پڑھیں۔ اخذِ طریقت امیر المجاہدین سید احمد شہید بریلوی سے کیا۔ نہایت صالح، راست باز، دیانت دار، عالی ہمت، بارعب اور مبلّغ دین تھے۔ آخرِ عمر میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی۔

۲۔ **مفتی رحمت علی حسینی دہلوی** : فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ "میرلال" ان کا عرف تھا۔ دارالسلطنت دہلی کے مفتی تھے۔ مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کی طرف سے تاج العلما ضیاء الفقہا سید رحمت علی خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ حلیم الطبع، متواضع، جامع صفاتِ پسندیدہ اور مستجمع اوصافِ حمیدہ تھے۔ اربابِ فضل اور حامیانِ ہنر و کمال میں سے تھے۔

۳۔ **شیخ رحمت اللہ الہ آبادی** : عالم و فاضل اور فقیہِ نامور تھے۔ مسلکاً حنفی تھے، تذکیر و موعظت میں مشہور تھے۔ بصارت سے محروم تھے لیکن بصیرت کی نعمت سے مالا مال تھے۔ رسومِ مشائخ کے پابند نہ تھے۔ جمعۃ المبارک کو الہ آباد کی جامع مسجد میں وعظ کہتے تھے، جس میں بڑی تعداد میں لوگ شامل ہوتے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں فتویٰ جاری کیا تھا کہ انگریز کی مخالفت کرنا اور اس سے برسرِ پیکار ہونا حرام ہے۔ لوگوں نے اس فتوے پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا، مگر شیخ رحمت اللہ الہ آبادی اپنے موقف پر قائم رہے اور کسی کی مخالفت کو درخورِ اعتنا نہیں گردانا۔ جب انگریزوں کا ملک پر پورا تسلط ہو گیا اور مخالفت ختم ہو گئی تو انگریزی حکومت نے الہ آباد کے نواح میں شیخ رحمت اللہ کو چار گاؤں بہ طور جاگیر عطا کیے۔ ۱۲۹۳ھ کو وفات پائی۔

۴۔ **مولانا رحمت اللہ جبوری سورتی** : فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ قراءتِ سبعہ پر عبور رکھتے تھے اور اس نواح میں قراءتِ قرآن میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ عرصۂ دراز تک سورت شہر میں معرکۂ تدریس بپا کیے رکھا۔ دوسری مرتبہ حجِ بیت اللہ کو گئے تھے کہ واپسی میں کشتی سمندر میں غرق ہو گئی اور پانی کی لہروں

کی نذر ہو گئے۔ یہ حادثہ ۱۲۶۴ھ کو پیش آیا۔

**۵۔ مرزا رحیم اللہ عظیم آبادی** : درویش محمد کے عرف سے معروف تھے۔ مسلکاً شافعی تھے۔ نامور فاضل اور شیخ تھے۔ کبار مشائخ نقشبندیہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شاہ غلام علی علوی دہلوی سے اخذ طریقت کیا۔ بخارا، عراق اور عرب وغیرہ شہروں اور ملکوں کی سیاحت کی۔ حج بیت اللہ بھی کیا، ماوراء النہر بھی گئے، سبزوار میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ حدیث، فقہ اور اصول کے عالم کبیر تھے۔ پہلے حنفی تھے، آخر عمر میں مسلکِ شافعی سے منسلک ہو گئے تھے۔ ۱۲۶۰ھ کو سبزوار میں کسی نے ان کو قتل کر دیا تھا۔

**۶۔ مولانا رضا رفیقی کشمیری** : مولانا رضا رفیقی کشمیری کے والد محترم کا نام محمد اور جدّا مجد کا مصطفیٰ رفیقی کشمیری ہے۔ ابوحمزہ کنیت تھی۔ ۱۲۰۵ھ کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد، چچاؤں اور نانا شیخ نعمت اللہ ٹوپی گر سے علم حاصل کیا۔ یہاں تک کہ اکابر فقہائے حنفیہ میں گردانے گئے۔ تفسیر اور حدیث کے بھی عالم تھے۔ علم سے فارغ ہونے کے بعد خود مسندِ تدریس بچھائی۔ بہت متواضع، نرم مزاج، حلیم الطبع اور شفیق تھے۔ چھوٹا بڑا جو بھی ملتا، سب کو سلام کہنے میں سبقت کرتے۔ ماہِ شعبان ۱۲۷۶ھ میں رحلت فرمائی۔

**۷۔ قاضی رکن الدین انصاری کیرانوی** : والد کا نام محمد احمد اور دادا کا خلیل الرحمن انصاری تھا۔ ولادت فتح پور میں ہوئی۔ صغر سنی ہی میں کیرانہ آ گئے تھے، جہاں ان کے چچا قاضی نور الحق انصاری اقامت پذیر تھے۔ ان سے صرف، نحو اور منطق کی بعض کتابیں پڑھیں۔ پھر دارانگر چلے گئے، وہاں شیخ سالم بن کمال الدین انصاری فتح پوری کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے چند کتبِ درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر دہلی کا عزم کیا، وہاں نامور عالم ملا حسن لکھنوی سے انتہائی درسی کتابیں پڑھیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے وطن کیرانہ واپس آ گئے، کیرانہ کے منصبِ قضا پر ان کے والد قاضی محمد احمد انصاری متمکن تھے، والد کی وفات کے بعد یہ منصب ان کے سپرد ہوا، اور تیس سال اس پر فائز رہے۔ مصنف بھی تھے۔ ایک رسالہ مسئلۂ وراثت سے متعلق تصنیف کیا

اور ایک رسالہ شیعہ کے رد میں لکھا۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۲۸ھ کو فوت ہوئے۔ فقہائے حنفیہ میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔

۸- **مولانا روح الفیاض الہ آبادی**: اپنے وقت اور علاقے کے شیخ اور فاضل تھے۔ فقہ و اصول میں مہارت رکھتے تھے۔ صوبہ یوپی کے شہر الہ آباد میں شیخ محمد اجمل کا مدرسہ جاری تھا، اس کی مسندِ تدریس کو رونق بخشی اور تمام عمر یہ خدمتِ دینی انجام دیتے رہے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ۱۲۵۲ھ میں انتقال کیا۔

۹- **مولانا روح اللہ لاہوری**: ولادت ۱۱۷۱ھ میں ہوئی۔ حدیث، فقہ، صرف، نحو، معانی وغیرہ تمام علومِ دینیہ و متداولہ کی تحصیل کی اور درجۂ کمال کو پہنچے۔ مولانا محمد سلیم لاہوری کے شاگرد تھے۔ اس زمانے میں لاہور پر سکھوں کی حکومت تھی اور رنجیت سنگھ وغیرہ سب حکام اُن کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ لاہور میں سکھوں کی سخت شورش اور ہنگامہ آرائی کے باوجود مولانا روح اللہ نے آثارِ شرحِ محمدی کو جاری و قائم رکھا۔ علما میں اس درجے قدر و منزلت کے حامل تھے کہ سب انہی کے فتوے کو معمول بہا ٹھہراتے اور قبول کرتے ـــــ درس و تدریس میں بے نظیر تھے۔ علم و تحقیق میں درجۂ امامت پر فائز تھے۔ آخر عمر میں حج و زیارت سے متمتع ہوئے۔ خاصا عرصہ مکہ مکرمہ میں رہے اور قرآنِ مجید حفظ کیا۔ کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ واپسی کے وقت شہر یمن میں وفات پائی۔ یہ ۱۲۴۴ھ کا واقعہ ہے۔

# ز

## ۷۳- قاضی زین العابدین انصاری یمانی

قاضی زین العابدین کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے : زین العابدین بن محسن بن محمد بن مہدی بن محمد بن ابوبکر انصاری خزرجی سعدی یمانی --! اپنے عہد کے عالم کبیر اور شیخ وفاضل تھے۔ ارضِ ہند کے علمائے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ملک یمن کے ایک مقام "حدیدہ" میں پیدا ہوئے، نشوونما بھی وہیں پائی۔ قاضی زین العابدین کے دو بھائی --- شیخ حسین اور شیخ محمد --- جید علمائے وقت میں سے تھے، قاضی صاحب ممدوح نے ان سے کسبِ علم کیا۔ بعد ازاں "مراوعہ" گئے، وہاں سید حسن بن عبدالباری اہدل کا غلغلۂ درس بلند تھا، اس میں شریک ہوئے، عرصۂ دراز تک ان کی صحبت میں رہے اور بہت سے علوم کی تحصیل کی۔ یہاں تک کہ علمِ فقہ اور علمِ نحو میں ممتاز قرار پائے اور اللہ نے ان کے لیے علومِ مختلفہ میں مہارت اور فتح وکامرانی کے دروازے کھول دیے۔ کثیر المطالعہ عالم تھے اور شب وروزان کا یہی مشغلہ تھا۔ کثرتِ مطالعہ اور علوم میں انتہائی رغبت وتعلق کی بنا پر ہر شعبۂ فن پر حاوی ہوگئے تھے اور ہر موضوع سے متعلق ان کی رائے کو قطعی اور حتمی قرار دیا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ریاست بھوپال کے مدار المہام منشی جمال الدین صدیقی دہلوی تھے، جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور متدین ومتقی شخص تھے۔ جب وہ حج بیت اللہ کے لیے گئے تو "حدیدہ" پہنچے۔ قاضی زین العابدین سے ملاقات ہوئی، وہ اس وقت صرف انیس سال کے نوجوان تھے، لیکن نہایت ذہین اور صاحبِ علم ومطالعہ تھے۔ مدار المہام موصوف ان کی صلاحیت وقابلیت سے متاثر ہوکر انھیں اپنے ساتھ بھوپال لے آئے اور اپنے ایک عزیز --- خیرالدین --- کی بیٹی کا عقد ان سے کر دیا، اور بھوپال کے نائب قاضی کا منصب عطا کیا --- ایک مدت تک وہ اس منصب پر متمکن

رہے۔ پھر انھیں بھوپال کا قاضی مقرر کر دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد سید محمد صدیق حسن خاں بھی بھوپال تشریف لے آئے اور دونوں کے درمیان ذہنی موافقت پیدا ہو گئی۔ سید محمد صدیق حسن خاں نے قاضی زین العابدین سے صحاح ستہ پڑھی اور قاضی زین العابدین نے ان سے فارسی ادبیات و انشا کی کتابیں پڑھیں۔

بعد ازاں سید محمد صدیق حسن خاں نے بھوپال میں سکونت اختیار کر لی اور قاضی زین العابدین یمانی نے بھی اسی شہر کو اپنا مسکن ٹھہرالیا۔ قاضی صاحب ممدوح کے خاندان کے مختلف افراد نے ہندوستان میں بہت علمی کام کیا، علامہ خلیل عرب بھی جو ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان آگئے تھے اور کراچی میں اقامت اختیار کر لی تھی، اسی خاندان کے رکنِ رکین تھے۔ ہندوستان کے شہر بھوپال میں اب بھی اس خاندان کے علمی آثار باقی ہیں۔

بہر حال قاضی زین العابدین یمانی تیرھویں صدی ہجری کے محدث و فقیہ اور عالمِ کبیر تھے۔ نحو، لغت، انشا اور دیگر علوم و فنون میں دسترس رکھتے تھے۔ شرح المناسک اور مختلف فقہی مسائل سے متعلق فتاوے کا ایک ضخیم و مستند مجموعہ ان کی تصنیفی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اور عنوانات پر بھی انھوں نے رسائل تحریر کیے۔ ۲ ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ کو بھوپال میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔[۱]

اور فقہائے برصغیر

حرف ز کے ضمن میں تیرھویں صدی ہجری میں برصغیر پاک و ہند میں چند اور فقہائے کرام کے اسمائے گرامی بھی تذکرہ و رجال کی بعض کتابوں میں مرقوم ہیں۔ لیکن دو دو چار چار سطروں سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ نہیں ملتا۔ ان میں دو حضرات یہ ہیں:

۱۔ مولانا زبیر رام پوری: شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ زبیر افغانی رام پوری کہلاتے تھے۔ والد کا اسم گرامی ابوزبیر تھا۔ اپنے زمانے کے لائق فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۹۰، ۱۹۱

جزئیاتِ فقہ پر عبور حاصل تھا اور استخراجِ مسائل میں مرجع علما تھے۔

۲- سید زین العابدین حسینی کاظمی : کبار، علما و فقہا میں سے تھے۔ ولادت اور نشو و نما شہر "کڑھ" میں ہوئی۔ اپنے عہد کے فحول علما سے اکتساب علم کیا، یہاں تک کہ تمام فضائلِ علمی سے بہرہ اندوز ہوئے اور مسندِ درس و افادہ کو رونق بخشی۔ کڑھ سے الہ آباد تشریف لے آئے تھے اور درس و افادہ میں منہمک و مصروف رہتے تھے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ علاقہ اودھ میں شہرت و ناموری رکھتے تھے۔

# س

## ۴۷۔ مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری

جون پور، ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر ہے۔ ۷۹۶ھ سے لے کر ۸۸۱ھ تک تقریباً نوّے سال "شرقی سلطنت" کے نام سے یہاں ایک مستقل حکومت قائم رہی، جس کا دار السلطنت جون پور تھا۔ نویں صدی ہجری میں ہندوستان کی علاقائی سلطنتوں میں یہ ایک مضبوط و مستحکم سلطنت تھی۔ اس کے سلاطین جہاں سیاسی قوت و استحکام اور فکر و عمل میں مشہور تھے، وہاں علم دوستی اور قدر دانیِ علما میں بھی خاص شہرت رکھتے تھے۔

جون پور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس شہر اور اس کے دیہات و قصبات میں بے شمار صوفیا و اتقیا اور فضلا و صلحا پیدا ہوئے، اور ان میں سے ہر ایک اپنے علم و کمال کی بنا پر نامور و ممتاز ہوا۔ مرکزِ اصحابِ علم اور محورِ اربابِ فضل ہونے کی بنا پر اس شہر نے "شیرازِ ہند" کا لقب پایا، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ شہر بجا طور اس لقب کا مستحق تھا۔ جون پور کی زرخیز و مردم آفرین مٹی سے جو حضرات نمایاں ہو کر اُبھرے اور مرتبۂ فضیلت کو پہنچے، ان کے اسمائے گرامی سلسلۂ فقہائے ہند کی تمام جلدوں میں مرقوم ہیں اور ان کے علمی، تصنیفی اور تدریسی کارنامے مناسب تفصیل کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں جن بزرگانِ دین اور اربابِ علم نے جون پور میں جنم لیا اور پھر پورے برصغیر کو اپنے فضائل گوناگوں سے نوازا، ان میں حضرت مولانا سخاوت علی فاروقی جون پوری کا اسمِ گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ والد کا نامِ نامی رعایت علی، دادا کا مدیش علی اور پردادا کا نذر علی تھا۔ سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں یہ

برصغیر کے فاضلِ کبیر، عالمِ جلیل، شیخِ بلند مرتبت، محدثِ عالی مقام اور فقیہِ ذی شان تھے۔

مولانا سخاوت علی فاروقی ۱۲۲۶ھ کو جون پور سے گیارہ میل بہ جانب جنوب قصبہ "منڈیاہوں" میں پیدا ہوئے۔ مختصرات مولانا قدرت علی ردولوی سے پڑھیں، متوسطات کی تحصیل مولانا احمد اللہ انامی (تلمیذ مولانا محمد اسحاق دہلوی) سے کی۔ بعض کتابوں کی تکمیل مولانا احمد علی چریاکوٹی کے حلقۂ درس میں کی، مطولات اور انتہائی درسی کتابوں کے لیے جن میں حدیث وفقہ کی امہات الکتب شامل ہیں، مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا، ان دونوں بزرگوں سے سند و اجازہ سے بھی بہرہ یاب ہوئے۔ بیعتِ تصوف و طریقت حضرت سید احمد شہید بریلوی کے دستِ حق پرست پر کی اور عرصے تک ان سے لزوم و انسلاک اختیار کیے رکھا۔ ان تمام اساتذہ اور اصحابِ کمال سے استفادہ و استفاضہ کے بعد اپنے عصر میں عالم و محدث اور فقیہ و مفتی کی حیثیت سے شہرت پائی۔ نیز ورع و تقویٰ اور عبادت و زہد میں یگانۂ روزگار ہوئے۔ جامع علم و عمل اور مرکزِ فضل و کمال تھے۔ قائم اللیل، تہجد گزار، صائب الفکر، اور نہایت متحمل مزاج تھے۔ بے مقصد گفتگو اور ناروا بات سے ہمیشہ محترز رہے۔ کسی سے لڑنا جھگڑنا اور معمولی باتوں میں اپنے رفقا سے اظہارِ اختلاف کرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ منکسر، متواضع اور حلیم الطبع تھے۔

تحصیلِ علم کے بعد اپنے وطن جون پور واپس آئے اور درس و افادۂ طلبا کے لیے کمرِ ہمت باندھی۔ وہاں کی جامع مسجد پر، جو سلاطینِ شرقیہ کی تعمیر کردہ ہے اور جس کو شاہی مسجد کہا جاتا تھا، ان دنوں شیعہ حضرات نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مولانا نے کوشش کرکے دوبارہ اس پر اہلِ سنت کا قبضہ بحال کیا، جمعہ و جماعت کا اہتمام کیا اور شعائرِ دین کی ترویج و اشاعت کے لیے فضا ہموار کی۔ اس مسجد میں "مدرسہ قرآنیہ" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں بے شمار لوگوں نے قرآنِ مجید حفظ کیا اور جون پور

اور اس کے گرد و نواح میں اس مدرسے کی وجہ سے حفظِ قرآن کا شوق پیدا ہوا۔ "تاریخ شیرازِ ہند جون پور"، میں اس مدرسے کے بارے میں لکھا ہے :

جامع مسجد جون پور میں مدرسہ قرآنیہ بامداد اکابرِ شہر قائم فرمایا اور حافظ امام الدین لاہوری کو اس مدرسے کا مدرس مقرر کیا۔ اس وقت تک وہ مدرسہ قائم ہے اور اس سے فیضِ تعلیم جاری ہے۔ طلبا ہر سال حفظِ قرآن کر کے نکلتے ہیں [1]

"تاریخ شیرازِ ہند جون پور" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا سخاوت علی کا جاری کردہ حفظِ قرآن کا یہ مدرسہ جو "مدرسہ قرآنیہ" کے نام سے موسوم ہے، آج سے بیس برس قبل ۱۹۶۳ء تک جون پور میں جاری تھا۔ امید واثق ہے، اب بھی جاری ہوگا۔ یعنی یہ مدرسہ کم و بیش ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے۔ اس کے بانی مولانا سخاوت علی کا یہ بہت بڑا صدقہ جاریہ ہے، جس کا اجر و ثواب انھیں بارگاہِ ایزدی سے برابر مل رہا ہے اور ملتا رہے گا۔

جون پور میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ ریاست باندہ کے حکمران نواب ذوالفقار علی خاں کے اصرار پر باندہ تشریف لے گئے تھے، وہاں درس و افتا کا سلسلہ جاری فرمایا۔ صرف دو سال وہاں قیام رہا۔ ان کی والدۂ ماجدہ جون پور میں مقیم تھیں اور پیرانہ سالی کے ساتھ ساتھ کمزور بھی ہوگئی تھیں، ان کی وجہ سے وطن واپس آ گئے اور طویل عرصے تک جون پور میں درس و تدریس اور افتا میں مشغول رہے۔ ان کو اللہ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ درس و تدریس اور افتا وغیرہ کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے اور فقط حسبۃ للہ یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ طلبائے علم کا تکفل بھی فرماتے تھے، نہایت فیاض تھے اور صحیح معنوں میں اسم بامسمّیٰ۔

جون پور اور اس کے اطراف و جوانب میں ان کی وجہ سے علم کا چرچا ہوا۔ دورِ گزشتہ کے علمائے جون پور جن اوصاف و کمالات سے متصف تھے، وہ سب مولانا

---

[1] تاریخ شیرازِ ہند جون پور ص ۷۵۶، ۷۵۷

سخاوت علی کی ذات میں جمع تھے۔ خلق و مروت اور ایثار و قربانی میں بے مثل تھے، ان کی وجہ سے پورب میں علم کی آبرو قائم تھی اور ان کی ذات مرجع خلائق تھی۔ فقر و درویشی ان کا امتیاز تھا۔ نہایت ذہین و فطین عالم تھے۔ جہاں معقولات و منقولات میں ماہر تھے، وہاں بہت اچھے طبیب بھی تھے اور بہترین نباض و قیافہ شناس بھی۔

۱۲۶۴ھ میں اپنے ماموں مفتی محمد غوث جون پوری کے ساتھ ارضِ حجاز کا قصد کیا اور حج و زیارت کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کے بعد ہندوستان تشریف لے آئے اور پہلے کی طرح درس و افادے میں مشغول ہو گئے۔

مولانا ممدوح بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ انتہائی متقی اور پرہیز گار عالم تھے۔ اوقاتِ نماز کا خاص طور سے اہتمام فرماتے اور اوّل وقت پر باجماعت نماز ادا کرتے۔ عصر کی نماز ایک مثل پر اور نمازِ فجر طویل قرأت کے ساتھ غلس میں پڑھتے۔ فتویٰ نہایت احتیاط سے دیتے اور اقوالِ فقہا میں سے جس قول کی تائید قرآن و حدیث سے ملتی، اسی کے مطابق فتویٰ تحریر فرماتے۔ دلائل و براہین سے اپنے موقف کی وضاحت کرتے۔

بہت اچھے واعظ اور مبلغ تھے۔ تذکیر و تلقین کا اسلوب میٹھا اور پیارا تھا۔ ردِ بدعات اور تبلیغ کتاب و سنت میں کوشاں رہتے۔ اشاعتِ حق ان کا شیوہ اور ترویجِ دین اُن کا پیشہ تھا۔ اونچے مرتبے کے مصنف تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔

۱۔ التقویم فی احادیث النبی الکریم: یہ کتاب صدیقی پریس بنارس میں شائع ہوئی۔
۲۔ رسالہ تقویٰ: رد بدعات میں ہے۔
۳۔ رسالہ اسلم: علم منطق میں ہے۔
۴۔ عقائد نامہ: عقائد سے متعلق یہ رسالہ اردو میں ہے۔
۵۔ رسالہ کلماتِ کفر: اس میں بتایا گیا ہے کہ کلماتِ کفریہ کیا ہیں۔
۶۔ رسالہ اسرار: فقر و درویشی سے متعلق ہے۔
۷۔ عرض نیک: شیعہ کے ساتھ ایک مناظرہ۔

۸۔ رسالہ عرفان الاوقات : یہ رسالہ نماز پنجگانہ کے صحیح اوقات سے متعلق ہے۔

۹۔ رسالہ فی الہیئتہ : علم ہیئت کے بارے میں ایک رسالہ۔

۱۰۔ جوابات سوالات تسعہ : یہ مولانا محمد مچھلی شہری کے نو علمی و فقہی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ ان جوابات میں حدیث ثقلتین اور مار کثیر پر عمدہ اور لطیف بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف علام نے اس مسئلے کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا ہے کہ صحیح تقلید کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

تقلید صحیح اینست کہ اتباع کند قول امام را در جائے کہ نص صریح صحیح غیر منسوخ از رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نہ یابد وعین اتباع ہمیں است کہ وقت یافتہ شدن قول رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم قول کسے را نہ شنود، ہمیں است مذہب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ و مذہب جمیع ائمہ دین رضوان اللہ علیہم اجمعین [۵۲]

تقلید صحیح یہ ہے کہ اس مقام پر کسی امام کی پیروی کرے جہاں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص صریح صحیح غیر منسوخ نہ پائے، اور عین اتباع یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول پائے جانے کے وقت کسی کی بات نہ سنے، یہی مذہب امام اعظم اور تمام ائمہ دین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے فقہی مسائل سے متعلق کئی رسالے تحریر کیے اور بہت سے فتوے جاری فرمائے۔

مولانا سخاوت علی جون پوری سے کثیر التعداد علما نے استفادہ کیا اور بے شمار لوگ ان کے چشمہ فیض سے سیراب ہوئے۔ یوپی کے مشرقی اضلاع اور بہار کے اصحاب علم نے بالخصوص ان کی شاگردی اختیار کی۔ ان میں مولانا کرامت علی جون پوری، سید خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا محمد شریف جون پوری، مولانا محمد مچھلی شہری، مولانا حب علی جون پوری، مولانا غلام محمد جگدیش پوری، مولانا محمد یعقوب دسنوی، سید مصطفیٰ شیر

---

۵۲۔ بحوالہ تراجم علمائے حدیث ہند ص ۳۷۱

دسنوی، مولانا شجاعت علی بہاری، مولانا غلام جیلانی بازید پوری، مولانا محمد عمر غازی پوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظم گڑھی اور مولانا رحیم اللہ ضلع بستی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

بہرحال مولانا سخاوت علی جون پوری، مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی بڑھانوی کے تلمیذِ خاص اور فیض یافتہ تھے۔ پورب میں توحید و سنت کے سب سے بڑے داعی اور اپنے دور میں اسلامی علوم و فنون کے بہت بڑے مدرس تھے۔ جون پور میں مسندِ درس بچھا کر بیٹھے اور سیکڑوں علمائے دین پیدا کیے۔ پھر ان کو یوپی اور بہار کے صوبوں میں اس طرح پھیلایا کہ انھوں نے اس نازک موقع پر اسلام کے دفاع اور اس کی نشرو اشاعت کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

مولانا سخاوت علی جون پوری فقہی مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث تھے اور آخر عمر میں ہندوستان سے مع اہل و عیال ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وہیں ۶ شوال ۱۲۷۴ھ (۲۰ مئی ۱۸۵۸ء) کو وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔[۵۳]

اولاد

مولانا سخاوت علی جون پوری کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام مولانا محمد جون پوری، مولانا جنید، مولانا محمد شبلی فاروقی اور مولانا حافظ ابوالخیر محمد مکی تھے۔ محمد سب سے بڑے تھے، باپ سے تحصیل علم کی، علوم عقلیہ و نقلیہ میں ماہر اور زاہد و متقی تھے۔ والد مکرم جب ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو ان کی جگہ جون پور میں مسندِ درس سنبھالی اور وعظ و نصیحت میں مشغول ہوئے۔ بہت نیک اور فاضل آدمی تھے۔ درود شریف کثرت سے پڑھتے تھے۔ عین عالمِ جوانی میں ۲ شوال ۱۲۷۴ھ کو جون پور میں فوت ہوئے۔

---

[۵۳] تذکرہ علمائے ہند ص ۶۹،۷۰ — تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۵۶،۵۷ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۲،۱۹۳ — جماعتِ مجاہدین ص ۲۹۴،۲۹۵ — تراجم علمائے حدیث ہند ص ۷۰،۳۴۳تا۳۴۷

مولانا جلید بھی صاحبِ علم وفضل تھے، انھوں نے بھی عین عالمِ شباب میں انتقال کیا۔

مولانا محمد شبلی فاروقی ۱۰ شعبان ۱۲۶۳ھ کو پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد انتقال کر گئے۔ تعلیم و تربیت کا اہتمام نانا نے کیا جن کا اسمِ گرامی ضیاء الدین تھا۔ سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر بعض اساتذہ سے فارسی اور عربی کی ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں مولانا محمد یوسف فرنگی محلی سے انتہائی درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ کتبِ حدیث کے لیے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ارشد تلامذہ میں گردانے گئے۔ نامور عالم مولانا محمد حسین بٹالوی بھی اس زمانے میں حضرت میاں صاحب کے حلقۂ درس میں شامل تھے اور مولانا محمد شبلی کے ہم درس تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں حج بیت اللہ کا عزم کیا۔ تمام مروجہ علوم وفنون میں یگانہ تھے۔ ذکاوت و فطانت میں بھی منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ علم نحو میں "وسیلۃ النحو" کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اپنے علاقے میں اوقاف کی مساجد کے متولی تھے۔

مولانا سخاوت علی کے چوتھے بیٹے مولانا حافظ ابوالخیر محمد مکی تھے۔ باپ نے ۶ شوال ۱۲۷۴ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا اور بیٹے نے ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۴ھ کو اس عالمِ فانی میں قدم رکھا۔ یعنی باپ کی وفات کے وقت صرف چار مہینے کے بچے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ماں کے ساتھ جون پور آئے۔ اوّلاً قرآنِ مجید حفظ کیا، پھر مختلف جید اساتذہ سے تحصیلِ علم کی۔ یوں تو تمام علوم میں دسترس حاصل تھی، لیکن فنونِ عقلیہ میں زیادہ ماہر تھے۔ زہد اور پرہیزگاری میں بے نظیر تھے۔ عمر بھر درس و تدریس اور پند و نصائح میں مشغول رہے۔ باپ کے جاری کردہ "مدرسۂ قرآنیہ" کے انتظام و اہتمام میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ ہندوستان کے مشہور و ممتاز عالم مولانا حافظ محمد شیث مرحوم جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم دینیات تھے، انھی کے فرزندِ رشید تھے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا سخاوت علی کے پوتے اور مولانا حافظ ابوالخیر محمد مکی جون پوری کے بیٹے، مولانا ابوبکر محمد شیث جون پوری کا تذکرہ بھی مختصر الفاظ میں کر دیا جائے۔

مولانا ابوبکر محمد شیث نے ابتدائی تعلیم گھر میں پائی، اس کے بعد مدرسہ احمدیہ آرہ کا رُخ کیا جہاں مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری کا غلغلۂ درس بلند تھا، ان سے تمام علوم کی تحصیل کی۔ پھر وطن آکر اپنے خاندانی مدرسے کا اہتمام و انتظام ہاتھ میں لیا اور ساتھ ہی ملک کے مختلف گوشوں میں جاکر ہدایت و ارشاد کا کام انجام دینا شروع کیا۔

سید سلیمان ندوی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں نے علما میں ایسا شریف، ایسا نیک باطن، ایسا دور اندیش، ایسا فیاض، ایسا سادہ مزاج، اس پر ایسا مستقل مزاج، خوش اخلاق، شیریں گفتار، باغ و بہار، ایسا خشک اور ایسا تر آدمی نہیں دیکھا۔ ایسا ہی متقی و پرہیزگار اور ساتھ ہی ایسا وسیع المشرب اور وسیع الاخلاق — وہ مذہبی تھے اور سخت مذہبی، لیکن وہ بھی ان کو مانتے تھے جو مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ وہ بے دینوں میں بھی ایسے ہی پیارے تھے، جیسے دین داروں میں، اور یہ ان کے حسنِ اخلاق کی بڑی کرامت تھی۔[۴]

سید صاحب مرحوم ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء تک پندرہ برس وہ مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں ناظم دینیات رہے۔ اس عرصے میں کئی انقلاب آئے مگر وہ اپنی جگہ پر تھے۔ ساتھ ہی ان کے جبہ و دستار کی شان میں وہ بلندی رہی کہ کوٹ پینٹ اور ہیٹ والے ان کے آگے جُھک جُھک جاتے تھے۔ مگر اس میل جول اور نرمی و نرم خوئی میں حق کے خلاف کوئی بات سُن کر چپ نہیں رہ سکتے تھے۔ غرض وہ اپنے علم و عمل میں پہاڑ اور اخلاق و کرم میں بہتے پانی کی طرح تھے۔

نئے تعلیم یافتوں بلکہ نئی تعلیم کے اصل مرکز میں مذہبی وقار کو سلامت رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ انھوں نے اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا تھا۔ ان کا فضل و کمال کسی خاص علم و فن میں محدود نہ تھا، یہاں تک کہ حدیث و فقہ و تفسیر سے آگے بڑھ کر شعر و شاعری اور ریاضیات تک سے ان کو یکساں دلچسپی تھی۔ ان کی سادگی کو دیکھ کر کسی کو ان کی اس گہرائی کا یقین نہ آتا تھا،

---

[۴] یادِ رفتگاں ص ۲۳۵

اور ان کی اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی اس سادگی پر سب کو تعجب ہوتا تھا، اس قدر سادہ اور اس قدر رنگین۔[۵۵]

ان کے مرض اور اس کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب رقم طراز ہیں:

وہ (مولانا ابوبکر محمد شیث) آکلہ (کینسر) کے مرض میں، جس سے ایک طرف کا پورا رخسار اور جبڑا آدھے منہ تک خالی ہوگیا تھا، دوڈھائی برس تک ہر قسم کی مصیبت اور ہر طرح کی تکلیف جھیلتے رہے اور اس پوری مدت میں ایک دفعہ بھی بے صبری کی آہ اور تکلیف کی کراہ ان کے منہ سے نہیں نکلی۔ کوئی نماز ترک نہیں ہوئی اور صبر و شکر کا دامن ایک لمحے کے لیے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ دیکھنے والے ان کی حالت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے اور وہ ہاتھ اور زبان کے اشاروں سے صبر و استقلال کی نصیحت کرتے تھے۔[۵۶]

مولانا محمد شیث جون پوری نے ۲۳ شعبان ۱۳۵۹ھ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۰ء) کو اپنے وطن جون پور میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اس کے متعلق سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

آہ کہ فضل و کمال کا یہ پیکر، حسنِ اخلاق اور شرافت کا یہ پتلا، دین داری اور پرہیزگاری کا یہ مرقع، تواضع اور خاک ساری کا یہ سراپا، صبر و استقلال کا یہ مجسمہ، ساٹھ برس دنیا کی نیرنگی کا تماشا دیکھ کر دنیائے رنگ و بو سے مٹ گیا۔

مرحوم کی یادگار چند اولادیں اور چند کتابیں ہیں، مگر ان سب سے بڑھ کر ان کی یادگار ان کے حسنِ اخلاق کی یاد ہے۔ مرنے والے کا مدفن تو زمین کا ایک گوشہ ہے، مگر اس یاد کا مزار ان کے دوستوں کے دل ہیں۔

بعد از وفات تربتِ ما در زمین مجو    در سینہ ہائے مردم عارف مزارِ ماست[۵۷]

---

۵۵ یادرفتگان ص ۲۳۵، ۲۳۶
۵۶ ایضاً ص ۲۳۶
۵۷ ایضاً ۲۳۷ — نیز دیکھیے تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۸۳، ۷۸۴

# ۷۵۔ مولانا سراج احمد رام پوری

رام پور کے تیرھویں صدی ہجری کے علمائے مشاہیر اور فقہائے کبار میں مولانا سراج احمد رام پوری کا نامِ نامی لائقِ ذکر ہے۔ والد کا اسمِ گرامی مولانا محمد مرشد تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے اور فاروقی النسل تھے۔ ان کا شمار اپنے وقت کے معروف اصحابِ صلاح و تقویٰ میں ہوتا تھا۔

مولانا سراج احمد فاروقی کی ولادت ۱۷ شعبان ۱۱۷۶ھ کو سرہند میں ہوئی اور اپنے والد عالی قدر کے زیرِ نگرانی تربیت پائی۔ مختلف علوم و فنون کی تحصیل بھی انہی سے کی، یہاں تک کہ علومِ حدیث و فقہ میں ممتاز مرتبے کو پہنچے۔

بالخصوص حدیث اور اس سے متعلقہ علوم سے شغف و تعلق کا یہ عالم تھا کہ بعض امہاتِ کتبِ حدیث کی شروح لکھیں، اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ شرح صحیح مسلم : یہ شرح فارسی زبان میں ہے۔
۲۔ شرح جامع ترمذی : یہ بھی فارسی میں ہے۔
۳۔ شرح سننِ ابن ماجہ : یہ شرح بھی فارسی زبان میں ہے۔
۴۔ سیر المرشدین فی انساب المجددین۔
۵۔ کحل العین فی رؤیۃ النیرین۔
۶۔ برھان التاویل فی شرح الاکلیل۔
۷۔ رسالہ در حرمتِ غنا۔
۸۔ ترجمہ البدور السافرہ۔

صحاحِ ستہ میں سے صحیح مسلم، جامع ترمذی اور سننِ ابن ماجہ کی فارسی شرحیں اور دیگر تصانیف اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور مصنفِ علام کی معرفتِ حدیث و فقہ کا بیّن ثبوت ہیں۔

مولانا سراج احمد فاروقی رام پوری نے جمعرات کے روز ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی، وہاں سے ان کی میت کو رام پور لایا گیا اور والد ماجد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔[۵۸]

## ۷۶۔ سید سراج احمد حسینی نقوی سہسوانی

سید سراج احمد حسینی نقوی سہسوانی جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے، سید آل احمد حسینی سہسوانی کے بیٹے تھے۔ یہ چار بھائی تھے۔ سب سے بڑے سید اولاد احمد، ان سے چھوٹے صاحبِ ترجمہ سید سراج احمد، ان سے چھوٹے سید نیاز احمد شہید اور سب سے چھوٹے سید نذیر احمد۔ مضمون کا ربط قائم رکھنے اور خاندانی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اختصار کے ساتھ یہاں ان سب حضرات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، البتہ سید سراج احمد کا ترجمہ قدرے تفصیل کا متقاضی ہے۔

سید آل احمد حسینی سہسوانی ایک ذی علم اور صاحب تصوف و سلوک خاندان کے فرد تھے۔ متعدد اوصاف کے حامل اور متقی و پرہیزگار تھے۔ علمی وجاہت سے مالا مال اور مجموعۂ کمالات تھے۔ دہلی گئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی انتہائی احترام و اعزاز سے پیش آئے، مسند خالی کر دی اور اصرار سے اس پر بٹھایا۔ ان کے عقیدت مند بریلی، رام پور، مراد آباد، سنبھل اور پیلی بھیت وغیرہ دور دراز بلاد و قصبات میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسّی برس عمر پا کر ۱۲۵۹ھ میں عالمِ جاودانی کو رخصت ہوئے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔

ان کے بیٹوں میں سب سے بڑے سید اولاد احمد تھے، جو ۱۲۲۸ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور سہسوان میں نشو و نما پائی۔ حصولِ علم کی غرض سے رام پور اور لکھنؤ وغیرہ گئے اور مفتی شرف الدین رام پوری، مولانا تراب علی لکھنوی اور

---

۵۸ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۵۴۔ بحوالہ ہدیہ احمدی

مفتی محمد اسماعیل لکھنوی لندنی[۹] ایسے اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ قرآن مجید کے حافظ تھے اور نہایت ذہین و فطین عالم تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، عرصے تک مصروف درس و افادہ رہے۔ ۱۲۸۱ھ میں فوت ہوئے۔

دوسرے سید سراج احمد تھے، جن کا تذکرہ آئندہ سطور میں کیا جا رہا ہے۔

تیسرے سید نیاز احمد شہید تھے۔ یہ ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم درسیہ کی تکمیل لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ سے کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی میں چند سال خدمت درس بھی انجام دیتے رہے۔ زیور صلاح و سعادت سے آراستہ اور حلیۂ زہد و تقویٰ سے پیراستہ تھے۔ فن حدیث اور فقہ سے خاص مناسبت تھی۔ فنون سپہ گری، تیر اندازی اور شمشیر زنی و شہسواری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ بعض بزرگان دین کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ حریت میں شریک ہوئے۔ ۱۸۵۸ء (۱۲۷۴ھ) کو اپنے وطن سہسوان میں شربت شہادت نوش فرمایا۔ اس وقت انتالیس

---

[۹] تذکرہ و رجال کی کتابوں میں مفتی محمد اسماعیل لندنی کا نام بار بار آتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصر الفاظ میں ان کا تعارف کرا دیا جائے۔ مفتی اسماعیل اصلاً مرادآباد کے باشندے تھے، اس لیے مرادآبادی مشہور ہوئے۔ والد کا نام مفتی وجیہ الدین مرادآبادی تھا۔ اسماعیل عالم طفولیت میں لکھنؤ آ گئے تھے، وہیں مختلف اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ شاہان اودھ کا زمانہ تھا، لکھنؤ کے محکمۂ عدل و قضا پر مامور ہوئے۔ ذہین اور صاحب فہم آدمی تھے۔ اودھ کے حکمران نصیر الدین حیدر نے ان کو اپنے ملک کا سفیر مقرر کر کے لندن بھیج دیا۔ طویل مدت تک وہاں رہے، لہٰذا لندنی کی نسبت سے شہرت پائی۔ وہیں ایک یورپین عورت سے شادی کر لی تھی۔ لندن میں عرصۂ دراز تک مقیم رہنے کی وجہ سے وہاں کے حالات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسلام سے متعلق عقیدے میں خلل پیدا ہو گیا تھا۔ کتابوں میں مرقوم ہے کہ لندن سے ہندوستان کو واپسی کے وقت عدن پہنچے تو ان کی یورپین بیوی نے حجاز مقدس جانے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن یہ نہیں مانے اور کہا، میں پتھر کی ان دیواروں پر یقین نہیں رکھتا۔ فنون حکمیہ اور ادبیات عربیہ میں عبور رکھتے تھے۔ ۱۲۵۳ھ میں فوت ہوئے۔

سال کی عمر تھی۔

ان کے بیٹے سید غفور احمد تھے، جو فنِ ریاضی میں بالخصوص ماہر تھے۔ ریاست بھوپال میں بلقیس گنج کے مقام پر تحصیل دار رہے۔ صرف بینتیس برس کی عمر میں وہیں انتقال کیا۔

سید آل احمد سہسوانی کے چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے حکیم سید نذیر احمد سہسوانی تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۴۳ھ میں ہوئی۔ والد مرحوم کی وفات کے وقت سولہ سال کی عمر تھی اور حصولِ علم میں مشغول تھے۔ بعض کتابیں اپنے بھائیوں سے پڑھیں۔ مولانا احمد حسن مراد آبادی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ علم طب کی بھی باقاعدہ تحصیل کی۔ چھیاسٹھ برس عمر پاکر ربیع الاوّل ۱۳۰۹ھ کو بعارضۂ استسقا، اس دنیائے فانی سے عالمِ بقا کو رخصت ہوئے۔

آیئے اب چند ساعتیں سید آل احمد سہسوانی کے دوسرے فرزند گرامی سید سراج احمد حسینی سہسوانی کی صحبتِ با برکت میں گزارنے کی سعادت حاصل کریں۔

سید سراج احمد اپنے بڑے بھائی سید اولاد احمد سے تین یا ساڑھے تین سال چھوٹے تھے۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ طلب علم کے لیے دونوں مراد آباد گئے، وہاں سے رام پور پہنچے اور اکثر کتبِ درسیہ جو فقہ و اصول اور ادب و منطق وغیرہ پر مشتمل ہیں، مفتی شرف الدین رام پوری کے حلقۂ درس میں پڑھیں۔ پھر لکھنؤ گئے، وہاں مولانا تراب علی لکھنوی اور مولانا مفتی محمد اسماعیل مراد آبادی لندنی سے تمام درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ دونوں بھائی ذہنِ درّاک اور طبع غواص رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ہر فن کے اصول و فروع پر حاوی ہو گئے۔ سید اولاد احمد کو حکومتِ اودھ کی طرف سے سلطان پور کا تحصیل دار مقرر کیا گیا۔ چند روز بعد عدالتِ دیوانی و منصفی کے حاکمِ اعلیٰ بنائے گئے۔ نہایت قابلیت سے یہ فرائض انجام دیے اور بہترین فیصلے کیے۔ اس کے بعد ملازمت سے استعفا دے کر وطن واپس آ گئے تھے اور

یک سوئی کے ساتھ عبادت الٰہی اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے تھے۔

لیکن سید سراج احمد مزید حصولِ علم کی غرض سے لکھنؤ سے دہلی چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں وہاں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کا سلسلۂ درس زوروں پر تھا، اس میں شامل ہو گئے اور حضرت ممدوح سے صحاح ستہ قراءتاً و سماعاً پڑھی اور سند و اجازہ سے بہرہ اندوز ہوئے۔ جامع ترمذی مکرر حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کو سنائی اور سند حاصل کی۔ شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد تھے اور سید سراج احمد سے رابطۂ خلّت و مودّت پہلے سے مستحکم تھا۔

سید سراج احمد نہایت ذہین تھے، ان کی سرعتِ فہم اور فطانتِ طبع کے سلسلے میں متعدد روایات مشہور ہیں، جن میں ایک یہ ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں یہ دونوں بھائی —— سید اولاد احمد اور سید سراج احمد —— ایک ہی استاد کے درس میں شامل تھے۔ کسی صاحب نے سید سراج احمد سے بغرضِ امتحان ایک صیغہ پوچھا، انھوں نے بتا دیا، پھر دریافت کیا کہ یہ کس باب سے ہے؟ اس کے جواب میں وہ کچھ متامل ہوئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی دوسری طرف بیٹھے استاد کے پاؤں داب رہے تھے۔ وہ ان کی باتیں سن تو رہے تھے لیکن دیکھ نہیں سکتے تھے۔ استاد بھی سب باتیں سن رہے تھے۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو جواب میں متامل پاکر استاد کے پاؤں دابتے ہوئے زور سے ہاتھ مارا، جس کی آواز ان کے کان تک پہنچی، یہ ایک کنایۂ لطیفہ تھا۔ اس سے ذہنِ رسا نے فوراً سائل کا جواب پا لیا اور کہا یہ صیغہ باب ضَرَبَ یَضرِبُ سے ہے۔ حضرت استاد جو سب باتیں سُن رہے تھے، اس کنایہ سے نہایت خوش ہوئے اور دونوں بھائیوں کی ذکاوتِ طبع اور جودتِ ذہن کی تحسین فرمائی۔

سید سراج احمد ذہانت و فطانت کے ساتھ ساتھ جسارت و حق گوئی میں بھی بے مثال تھے۔ ایک مرتبہ اودھ کے وزیرِ سلطنت کے دربار میں تشریف فرما تھے، ارکانِ

امرائے حکومت کے علاوہ علما و مجتہدینِ شیعہ بھی موجود تھے۔ مسئلہ یہ درپیش تھا کہ شیعہ سنی نزاع اوّلاً تو ختم ہونا چاہیے اور اگر یہ نہ ہوسکے تو اس میں کمی ضرور ہونی چاہیے۔ اس اثنا میں ایک شیعہ مجتہد نے فرمایا کہ اصحابِ ثلاثہ کی نسبت شیعہ حضرات جو مطاعن و الزامات بیان کرتے ہیں، کلیتہً ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی عمارت بے بنیاد بلند نہیں ہوتی۔ وہ واقعات جو ان سے متعلق مشہور ہیں، اگر سب کے سب صحیح نہیں ہیں، تو کچھ نہ کچھ لازماً صحیح ہوں گے۔ سب کا غلط ہونا ممکن نہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اتنی باتیں ہرگز نہیں بناتے۔ بقول شاعر:

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

شیعہ مجتہد کی یہ تقریر سب کو پسند آئی اور امرائے دربار اور حضارِ مجلس نے اس کی خوب تحسین کی، خود وزیر سلطنت نے مجتہد صاحب کو دل کھول کر داد دی اور فرمایا کوئی بات ضرور ہے، جس نے اتنی شہرت حاصل کی ہے۔ سید سراج احمد سہسوانی بھی شریکِ مجلس تھے، محفل کا یہ رنگ دیکھ کر ان سے نہ رہا گیا، کھڑے ہوئے اور کہا کہ مجتہد صاحب کا اگر یہ فرمان صحیح ہے اور اگر اس کو قاعدہ کلیہ بنا لیا جائے کہ خواہ مخواہ کوئی چیز مشہور نہیں ہوتی، اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور کار فرما ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مشرکین نے اللہ کے جو ہزاروں شریک و سہیم مقرر کر رکھے ہیں، ان سب کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کی کچھ اصل تو (العیاذ باللہ) ضرور ہے۔

بقول شاعر: تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

یہود و نصاریٰ نے اللہ وحدہٗ لاشریک کے بیٹے اور بیٹیاں ثابت کیے، یہ اگر نہیں تو (معاذ اللہ) بھانجے بھتیجے تو ضرور ہوں گے، ہر ایک سے انکار ممکن نہیں،

بقول شاعر: تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفوں نے ساحر اور کاہن کہا، اگر یہ صحیح نہیں تو (نعوذ باللہ) شعبدہ باز تو ضرور ہوں گے۔ بقول شاعر:

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خارجیوں نے ایسی ایسی باتیں کہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ یہ سب اگر صحیح نہیں تو (نعوذ باللہ) کچھ تو صحیح ہوں گی۔ بقول شاعر:
تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا۔

سید صاحب ممدوح کی اس تقریر سے محفل میں سناٹا چھا گیا اور سب خاموش ہو گئے۔ اودھ کے وزیر سلطنت علی نقی خاں بہادر نے ان کو بالخصوص داد دی اور ان کی فصاحت و بلاغت، زورِ کلام، حاضر جوابی اور قوتِ استدلال کی تعریف کی۔ اس کو ماننا پڑا کہ شیعہ مجتہد کا یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں کہ خواہ مخواہ کوئی چیز مشہور نہیں ہو جاتی، اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہوتی ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی علومِ حکمیہ کے بہت بڑے فاضل اور زبردست منطقی تھے۔ سید سراج احمد کے قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں لکھنؤ تشریف لائے تو ان سے ملاقاتیں ہوئیں اور علمِ منطق کے بارے میں ہلکی پھلکی بحثیں بھی ہوئیں، جس کے نتیجے میں مولانا خیر آبادی نے ان کی ذہانت اور حاضر جوابی کی بہت تعریف فرمائی۔

مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا سید سراج احمد سہسوانی کے درمیان بعض مسائل میں شدید اختلاف تھا اور دونوں کے نقطہ ہائے نظر الگ الگ تھے۔ مثلاً مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا فضل حق خیر آبادی چند اہم مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف آرا رکھتے تھے، ان میں سید سراج احمد، مولانا شہید کو حق بہ جانب قرار دیتے تھے۔ پھر ان کی شہادت کے بعد مولانا سید حیدر علی ٹونکی اور مولانا خیر آبادی کے درمیان جو تحریری مباحثے ہوئے، اور مولانا ٹونکی نے پُرزور دلائل سے مولانا شہید کا دفاع کیا، اس میں بھی وہ مولانا ٹونکی کی تائید کرتے اور ان کے افکار کو مبنی بر صحت ٹھہراتے تھے۔

مولانا اسماعیل شہید اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے اختلافِ آرا کے سلسلے میں صاحبِ "حیات العلما" نے ایک دلچسپ لطیفہ بھی بیان کیا ہے، جس کا تعلق سید سراج احمد کی حاضر جوابی اور رسائی ذہن سے ہے۔ "مولانا خیر آبادی نے ایک

جلسے میں فرمایا کہ مولانا محمد اسماعیل جس چیز کو حلال کہیں، اس کو میں حرام اور جس کو وہ حرام کہیں، اس کو میں حلال ثابت کر سکتا ہوں۔ آپ (سید سراج احمد) اس موقع پر تشریف فرما تھے۔ فرمایا کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے ماں بیٹی کو حرام اور زوجہ کو حلال فرمایا ہے، آپ ایسے موقع پر کیا کیجیے گا؟[1]

جدل وکلام میں سید صاحب ممدوح کو مہارت حاصل تھی اور میدانِ بحث ومناظرہ میں وہ ہمیشہ غالب وفاتح رہے۔ مولانا فضل رسول بدایونی کا شمار ان حضرات علما میں ہوتا ہے جو مولانا اسماعیل شہید سے سخت اختلاف رکھتے تھے۔ انھوں نے مولانا شہید کی کتاب "تقویۃ الایمان" کی تردید "احقاق الحق" کے نام سے لکھ کر شائع کی۔ اس زمانے میں سید سراج احمد لکھنؤ میں تھے، ان کی نظر سے یہ کتاب گزری تو بعض حضرات کی فرمائش پر ایک ہی نشست میں اس کا جواب لکھ دیا، اس کا نام "سراج الایمان" رکھا اور بیت السلطنت لکھنؤ میں اسے طبع کرایا۔

سلطنت اودھ کے بعض ارکان وامرا کے اصرار پر سید صاحب ممدوح سلکِ ملازمت میں منسلک ہوئے تو انھیں اعمالِ لکھنؤ میں موضع کاکوری میں تحصیل دار مقرر کیا گیا۔ پانچ چھ سال اس منصب پر مامور رہے اور نہایت دیانت وقابلیت کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔ مقدمات کو سمجھنے، قانونی پیچیدگیوں کو حل کرنے اور اصل واقعات کی تہہ تک پہنچنے میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ اصابتِ رائے اور فہم وفراست میں عدیم المثال تھے۔ جب کوئی فقہی نوعیت کا مقدمہ پیش ہوتا اور اس میں ائمۂ فقہ کی آرا مختلف ہوتیں تو اس کی نہایت عمدہ توجیہ فرماتے اور جو رائے کتاب وسنت کے موافق یا اس سے قریب تر ہوتی، اس کو ترجیح دیتے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔

سیاسی گتھیوں کو سلجھانے اور لاینحل امور کی عقدہ کشائی میں کوئی ان کا مدِمقابل نہ تھا۔ جب سلطنتِ اودھ اور انگریزی حکومت کے درمیان عہد نامے کی تجدید کا

---

[1] حیات العلما ص ۹۴

مسئلہ سامنے آیا اور حدودِ ملک کے تعین اور بعض علاقوں کے الحاق سے متعلق فریقین میں اختلاف پیدا ہوا، تو اودھ کے وزیرِ سلطنت نے سید سراج احمد کو نائب وکیلِ سلطنت مقرر کیا اور یہ عہدہ و منصب صرف انہی کے لیے قائم کیا گیا، اس سے پہلے یہ عہدہ نہیں تھا۔ انھوں نے انگریزی حکومت کے اربابِ بست وکشاد سے گفتگو شروع کی اور چند روز کی باہمی بات چیت کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ یہ نزاعی صورت حال ختم ہوئی بلکہ یہ پیچیدہ اور نازک ترین مسئلہ اس طرح حل ہو گیا کہ دونوں فریق مطمئن ہو گئے، حکومتِ اودھ کی پریشانی رفع ہو گئی اور کچھ زائد حصۂ ملک بھی اس کے قبضے میں آگیا۔ اس حسنِ کارگزاری کے صلے میں ان کو خلعت اور پالکی کے اعزاز سے ممتاز کیا گیا اور ترقیِ منصب کے مسئلے پر غور ہوا۔

لیکن زمانۂ تحصیل داری میں انھوں نے عوام پر حکام کے مظالم اور سوئے انتظام سے حکومت کو بار بار مطلع کیا تھا اور جدید نظام کے نفاذ اور نئی اصلاحات کی طرف کئی مرتبہ توجہ دلائی تھی، جس پر کوئی عمل نہیں ہوا تھا، بلکہ بدنظمی اور ابتری میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس سے بددل اور مایوس ہو کر وہ ۱۲۷۲ھ میں ملازمت کی ذمے داریوں سے سبک دوش ہو گئے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ کاکوری کے رئیس مفتی محمد عباس نے جو ان کا بہت احترام کرتے تھے اور جنھوں نے اپنا مکان اور دیوان خانہ سکونت کے لیے ان کے سپرد کر دیا تھا، اصرار کیا کہ وہ کاکوری میں مقیم رہیں۔ ان کے علاوہ کاکوری کے عام باشندے بھی ان کے قیامِ کاکوری پر مصر ہوئے، جس کی وجہ سے انھیں وہیں رکنا پڑا۔ بعد ازاں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے اور پورے ملک میں آتشِ فساد بھڑک اٹھی۔ پھر جب امن بحال ہوا تو ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۸ء) میں وطن (سہسوان) تشریف لائے۔

سہسوان میں ان دنوں ایک انگریز عہدۂ ججی پر فائز تھا، وہ سید صاحب کے علم و قابلیت سے واقف تھا، اس نے ان کو وکالت کرنے کا مشورہ دیا اور سندِ وکالت بھی عطا کی۔ تقریباً دو سال یہ مشغلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں انھوں نے الوانِ عدل و انصاف

میں عوام کی بہت مدد اور خدمت کی۔ دیانت داری سے مقدمہ پیش کرتے اور لوگوں کو سچ بولنے اور صداقت پر قائم رہنے کی تلقین فرماتے۔ مدعی، مدعیٰ علیہ اور عدالت کے لیے کتاب و سنت اور کتبِ فقہ میں جو اصول و احکام مقرر ہیں، ان کی دل نشین انداز میں وضاحت کرتے۔ جھوٹا اور خلافِ حقیقت کوئی مقدمہ نہ لیتے۔ اس وجہ سے عدالت طبقۂ وکلا اور عوام میں ان کو بہت احترام حاصل تھا اور ان کی بات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

دو سال وکالت کی، اس کے بعد یہ پیشہ ترک کر دیا اور عزلت گزینی اختیار کر لی۔ تھوڑی سی آبائی و موروثی جائداد تھی، اس کو اور معمولی سی تجارت کو رزقِ حلال کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ زیادہ وقت عبادت، وعظ و تذکیر اور درس و تدریس میں صرف ہوتا۔ نہایت موثر اور دل نشین وعظ کہتے۔ شرک و بدعت کا رد اور توحید و سنت کی تبلیغ و اشاعت ان کا اصل موضوع تھا۔

ارضِ ہند کے اس جلیل القدر عالم نے ۱۹ شوال ۱۲۷۹ھ کو سینتالیس۴۷، اڑتالیس۴۸ برس کی عمر پا کر اپنے وطن سہسوان میں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرمائی اور اپنے جدِ امجد اور والدِ گرامی قدر کے پہلو میں دفن ہوئے[۱۱۵]

سید سراج احمد سہسوانی کے دو بیٹے تھے، جو علم و فضل میں یگانہ تھے۔ ایک کا اسم گرامی مولانا سید عبدالباری سہسوانی اور دوسرے کا مولانا سید عبدالباقی سہسوانی ہے۔ اوّل الذکر ۱۲۶۶ھ کو پیدا اور ۱۳۰۳ھ کو فوت ہوئے۔ ثانی الذکر کا سال ولادت ۱۲۷۳ھ اور سالِ وفات ۱۳۵۴ھ ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ چودھویں صدی ہجری کے فقہا کے ضمن میں بیان ہوگی۔

## ۷۷۔ قاضی سراج الدین موہانی

قاضی سراج الدین موہانی تیرھویں صدی ہجری کے نامور شیخ اور مشہور فقیہ تھے۔ مولد

---

۱۱۵ حیات العلما ص ۴۳ تا ۵۲ — نیز دیکھیے نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۹۴، ۱۹۵

منشا یوپی کا شہر موہان ہے۔ ہوش سنبھالا تو لکھنؤ گئے اور وہاں کے اساتذۂ کرام سے اکتسابِ علم کیا۔ پھر مرشد آباد کے لیے رختِ سفر باندھا اور عرصے تک وہاں اقامت گزیں رہے۔ مرشد آباد سے عازمِ کلکتہ ہوئے اور اپنے علم و فضل اور قابلیت وصلاحیت کی بنا پر وہاں کے منصبِ قضا پر متعین کیے گئے۔ مدت تک اس خدمت پر مامور رہے۔ پھر جب ان کے جوہر مزید چمکے اور فضیلت و کمال کے مختلف گوشے نکھر کر سامنے آئے تو ہندوستان کا منصبِ قضاءِ اکبر ان کے سپرد کر دیا گیا۔ اس منصب کی ذمے داریوں کو انھوں نے خوب نبھایا اور اس کی نزاکتوں کو ہمیشہ سامنے رکھا۔

طبعاً نہایت متین، متحمل مزاج اور متواضع و منکسر تھے۔ ہمیشہ نرمی سے بات کرتے اور اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کے باوجود چھوٹے بڑے سب سے لینت و عذوبت سے پیش آتے۔ شیریں گفتار اور نرم خو تھے۔

ان کا بہت بڑا کمال یہ تھا کہ عدل و قضا میں انتہائی مصروف ہونے کے باوجود مطالعۂ کتب جاری رکھتے اور طلبا کو مختلف علوم کا درس بھی ضرور دیتے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا، چنانچہ مسائلِ فقہ سے متعلق کئی رسالے تحریر کیے۔ انھوں نے اپنے اوقات شب و روز کو مختلف کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا اور کسی کام کی انجام دہی میں حرج نہیں واقع ہوتا تھا۔

عبدالقادر رام پوری اپنی کتاب "روزنامہ" میں لکھتے ہیں کہ قاضی سراج احمد موہانی فاضل بزرگ تھے، طبیب بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔ قلیل العمل تھے۔ ان کا مسلکی و مذہبی عقیدہ لوگوں کی نگاہوں سے مستور تھا۔ لیکن ان کے مزاج میں اس قدر نرمی اور طبیعت میں اس درجے لچک تھی کہ اہل سنت انھیں سُنّی کہتے اور شیعہ انھیں شیعہ قرار دیتے تھے۔ وہ اپنے بارے میں بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔

مذہبم عشق است و من واقفِ زادیاں نیستم ہندو و نصرانی و گبر و مسلماں نیستم

ان کے اس نقطۂ نظر اور مسلکی نرمی کو قرینِ صحت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ رواداری نہیں، احساسِ کم تری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ فقہی اختلاف کے اظہار میں سختی سے کام

نہیں لینا چاہیے اور اپنی مسلکی رائے سے اتفاق نہ کرنے والوں کو بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود اپنی کوئی رائے نہ ہو اور جیسا آدمی دیکھو، اسی کے مطابق ہو جاؤ۔ اس کو رواداری سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، یہ اپنے مذہب و مسلک پر عدم یقین کا اظہار ہے۔

قاضی سراج احمد موہانی نے ۱۲۳۸ھ میں وفات پائی[۱]

## ۷۸۔ مفتی سعد اللہ مراد آبادی

مفتی سعد اللہ بن نظام الدین مراد آبادی مسلکاً حنفی تھے۔ شیخ اجل، فاضلِ کبیر اور نحو و لغت کے بالخصوص نامور عالم تھے۔ ۱۲۱۹ھ کو مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ بڑے بھائی نے تعلیم و تربیت دینا شروع کی تو کسی بات پر بھاوج سے ناراض ہو کر گھر سے نکلے اور مفقود الخبر ہو گئے۔ اوائل عمر ہی میں رام پور پہنچے اور وہاں کے علما و معلمین سے مختصرات اور درسِ نظامیہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر نجیب آباد گئے، وہاں مولانا عبدالرحمٰن کوہستانی سے شرح جامی وغیرہ کتابوں کا درس لیا۔ اس کے علاوہ علمِ نحو اور علمِ صرف کی بعض اور کتابوں کی تحصیل بھی ان سے کی۔ جب ان علوم میں مکمل استعداد پیدا ہو گئی تو دہلی کا رُخ کیا، وہاں علوم مروجہ کی بعض کتابیں مولانا شیر محمد قندھاری اور مولانا محمد حیات پنجابی سے اور اکثر کتابیں مفتی صدر الدین دہلوی کے حلقۂ درس میں پڑھیں۔

اب وہ چوبیس برس کے جوان رعنا تھے اور ۱۲۴۳ھ کا آغاز ہو گیا تھا، مختلف علوم و فنون کی تقریباً تمام کتابیں مکمل کر چکے تھے، لیکن علم کی پیاس کب بجھتی ہے، اس کی تو یہ کیفیت ہے کہ ہر جرعۂ علم جو حلق سے نیچے اترتا ہے، مزید تشنگی کا باعث بنتا ہے۔ سعد اللہ جو مزید طلبِ علم کے لیے بے تاب ہوئے تو دہلی کو خیرباد کہا اور لکھنؤ

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۱۹۶، ۱۹۷

جا پہنچے۔ لکھنؤ کو اس زمانے میں مہدِ علم وفضل اور مرکز علما وفضلا کی حیثیت حاصل تھی اور مولانا محمد اشرف لکھنوی، مولانا محمد اسماعیل مرادآبادی لندنی، مرزا حسن علی محدث اور مفتی ظہور اللہ لکھنوی کی درس وتدریس کی مسندیں آراستہ تھیں اور ان میں سے ہر شخص اپنے وقت اور موضوع کا فاضلِ اجل تھا۔ سعد اللہ فیض کے ان تمام سرچشموں سے سیراب ہوئے اور سب سے استفادہ کیا۔ ۱۲۴۳ھ میں لکھنؤ پہنچ کر ہی گھر میں اپنا پتا دیا، ورنہ اس سے پہلے کسی عزیز کو معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں اور کس عالم میں ہیں۔

جب فارغ التحصیل ہو چکے تو شادی کی اور پھر لکھنؤ کے مدرسۂ شاہی کی مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔ مدت تک اس خدمت پر مامور رہے اور بے شمار لوگوں کو مستفید فرمایا۔ پھر تصنیف وتالیف کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی اور "تاج اللغات" ترجمۂ قاموس کی بعض جلدیں مکمل کیں۔ جب فضیلت وکمال کا شہرہ عام ہو گیا تو انھیں کو توالی میں منصبِ افتا پر متعین کیا گیا۔ یہ ایک اہم فقہی منصب تھا جس پر یہ پورے انتیس ۲۹ برس مامور رہے۔

۱۲۷۰ھ میں سفرِ حج پر روانہ ہوئے اور شیخ حرم شیخ جمال حنفی سے سندِ حدیث حاصل کی۔ حج بیت اللہ کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور لکھنؤ میں تین سال منصبِ افتا پر متعین رہے۔

جب نواب واجد علی شاہ کو اودھ کی حکومت سے معزول کر دیا گیا تو رام پور کے حکمران نواب یوسف علی خاں کی دعوت پر جو اُن کا شاگرد تھا، رام پور تشریف لے گئے، وہاں مسندِ افتا ان کے سپرد کی گئی اور پھر عمر بھر یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ رام پور میں محکمۂ قضا اور مرافعہ وغیرہ کی ذمے داریاں بھی ان کے سپرد تھیں۔

بلا شبہ مفتی سعد اللہ مرادآبادی بہت بڑے عالم، مصنف اور فقیہ تھے لیکن "تذکرہ علمائے ہند" کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ خشک مزاج تھے اور چھوٹے کو کم ہی قابلِ اعتنا گردانتے تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

مسوّدِ اوراق در ۱۲۶۴ھ بمقام لکھنؤ کہ جہتِ طلبِ علم دراں جا وارد بود،

صاحبِ ترجمہ را دید خشک مزاج یافت و با اصاغر کم توجہ می نمود[۱۳]

یعنی راقم الحروف (رحمان علی) نے ۱۲۶۴ھ میں جب کہ وہ حصولِ علم کی غرض سے لکھنؤ میں مقیم تھا، صاحبِ ترجمہ (مفتی سعد اللہ) کو وہاں دیکھا، خشک مزاج تھے اور چھوٹوں کو کم ہی لائقِ توجہ ٹھہراتے تھے۔

مفتی سعد اللہ مراد آبادی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ القول المانوس فی صفات القاموس۔
۲۔ نور الایضاح فی اغلاط الصراح۔
۳۔ نوادر الاصول فی شرح الفصول: علم صرف سے متعلق۔
۴۔ القول الفصل فی تحقیق همزة الوصل: علم صرف میں ہے۔
۵۔ مفید الطلاب فی خاصیات الابواب: یہ کتاب علم صرف میں ہے۔
۶۔ غایة البیان فی تحقیق السبحان۔
۷۔ میزان الافکار فی شرح معیار الاشعار۔
۸۔ محصل العروض۔
۹۔ رسالة التشبیه والاستعارہ۔ یہ علم بیان میں ہے۔
۱۰۔ دو رسالے در تحقیق "ال" تعریف۔
۱۱۔ شرح خطبہ قطبی۔
۱۲۔ شرح علی ضابطة التهذیب۔
۱۳۔ حاشیہ علی شرح سلّم از حمد اللہ سندیلوی۔
۱۴۔ حاشیہ علی شرح چغمینی۔
۱۵۔ رسالہ فی القوس والقزح۔

---

۱۳؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۷۴

۱۶۔ رسالۃ فی تحقیق علم الواجب تعالیٰ۔

۱۷۔ رسالہ سبع عرض شعیرہ موسومہ مفید البصیرہ۔

۱۸۔ شرح چغمینی۔

۱۹۔ رسالہ فی التناسخ۔

۲۰۔ رسالہ فی الطھر المتخلل۔

۲۱۔ تاج اللغات ترجمہ قاموس اللغات (چند جلدیں)

۲۲۔ ترجمہ فقہ اکبر۔

۲۳۔ وصیت نامہ امام ابو حنیفہؒ۔

۲۴۔ ترجمہ حقیقۃ الاسلام۔

۲۵۔ ھدایۃ النور فیما یتعلق بالاظفار والشعور۔

۲۶۔ زاد السبیل الیٰ دار الخلیل۔ علم فقہ میں۔

۲۷۔ حواشی مالا بدّ منہ۔ علمِ فقہ میں

۲۸۔ میزان الافکار شرح معیار الاشعار۔

۲۹۔ قصیدہ لامیہ۔

۳۰۔ عقود الاجیاد فی مجھول اختار والانقاد۔

۳۱۔ نوادر البیان فی علم القرآن۔

بعض معاملات میں وہ عام علما سے مختلف رائے رکھتے تھے اور دلائل سے اپنے صحتِ موقف کی وضاحت کرتے تھے۔ شیخ امیر علی امیٹھوی شہید نے ۱۲۷۳ھ کو اجودھیا میں ہنومان گڑھی کی مسجد پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں ہندوؤں سے جہاد کا اعلان کیا تو مفتی سعد اللہ مراد آبادی نے اس کی مخالفت کی اور ان کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔

اسی طرح جب ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (مصنف "ہمارے ہندوستانی مسلمان") کی تحریک پر خان بہادر عبد اللطیف (رئیس کلکتہ و سیکرٹری اسلامی مجلسِ مذاکرہ کلکتہ) نے جہاد اور دار الحرب کے مسئلے کے متعلق مفتی صاحب موصوف سے فتویٰ طلب کیا تو

اس وقت بھی مفتی صاحب نے حسبِ سابق انگریزوں کے حق میں مفصل فتویٰ تحریر فرمایا۔
مفتی سعد اللہ مرادآبادی شاعر بھی تھے اور آشفتہ تخلص کرتے تھے۔
ہندوستان کے اس عالم و فقیہ اور مفتی نے ۱۴ رمضان ۱۲۹۴ھ کو وفات پائی۔[۱۴]

## ۷۹۔ سیّد سعید الدین بریلوی

برصغیر کے علمائے مشاہیر اور فقہائے عظام میں ایک بزرگ سید سعید الدین حسنی بریلوی تھے، والد کا اسم گرامی سیّد غلام جیلانی تھا اور حضرت سید علم اللہ حسنی نقشبندی کی اولاد سے تھے۔ رائے بریلی میں زاویۂ سید علم اللہ میں پیدا ہوئے اور علوم مروجہ کی ابتدائی کتابیں اپنے شہر کے اساتذہ سے پڑھیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو لکھنؤ کا سفر اختیار کیا، وہاں حکیم حیات لکھنوی اور دیگر علمائے کرام سے تحصیل کی، اور اپنے دور کے جیّد اصحابِ علم میں گردانے گئے۔

حصولِ علومِ متداولہ سے فارغ ہو چکے تو حیدرآباد کا قصد کیا اور عرصے تک اس نواح میں فروکش رہے۔ بعدازاں وطن واپس آئے تو کلکتے چلے گئے۔ وہاں ان کی خدمات راجہ رام موہن رائے نے حاصل کر لیں۔ کچھ عرصہ وہاں قیام رہا، لیکن جب راجہ رام موہن رائے دہلی آیا تو انھیں بھی ساتھ لیتا آیا۔ اس اثنا میں وہ دو سال مغل حکمران اکبر شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد پھر عازمِ کلکتہ ہوئے اور وہاں انگریزی زبان سیکھی۔ اس مرتبہ انھیں بعض اہم مناصب پر فائز کیا گیا اور اٹھارہ سال مظفرپور قیام رہا۔ پھر حکومت کے مناصبِ عالیہ سے علیحدہ ہو گئے۔

---

[۱۴] تذکرہ علمائے ہند ص ۷۴، ۷۵ —— حدائق الحنفیہ ص ۴۸۸، ۴۸۹ —— تذکرہ کاملانِ رام پور ص ۱۵۱ تا ۱۵۴ —— ابجد العلوم ص ۹۲۵، ۹۲۶ —— نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۱۹۸ تا ۲۰۰ —— مظہر العلما ص ۸۲، ۸۳ —— حدیقۂ شہدا ص ۴۳، ۴۴ —— اسلامی مجلس مذاکرۂ علمیہ کلکتہ سال ہشتم ص ۱۳، ۳۳، ۴۰ —— تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ) ص ۲۱۴ تا ۲۱۶

سید سعید الدین حسنی بریلوی اپنے عہد اور علاقہ، اودھ کے جلیل القدر عالم، رفیع المرتبت فقیہ، نہایت متقی، متدین، پاک باز، صداقت شعار، عفت مآب، پیکر سخا اور مجسمۂ جود و کرم تھے۔ حسنِ معاملت اور صدق و صفا میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ ریا و سمعہ، فخر و غرور اور کبر و تعلّی سے سخت متنفّر تھے۔ نیکی، پرہیزگاری اور سعادت و صلاحیت کے ان تمام اوصاف سے موصوف تھے جو ان کے آبا و اجداد میں پائے جاتے تھے۔ محنت، جفاکشی اور صبر و ضبط کا عمدہ ترین نمونہ تھے۔ شیریں بیان اور صادق القول تھے۔ اپنے زمانے کے حالات اور واقعات کے نشیب و فراز پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔

رائے بریلی کا یہ نامور عالم و فقیہ ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ کو سفر آخرت پر روانہ ہوا[۱۵]

## ۸۰۔ مولانا سلام اللہ محدّث دہلوی رام پوری

مولانا سلام اللہ بن شیخ الاسلام بن حافظ فخر الدین دہلوی، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد سے تھے۔ کئی پشتوں سے یہ خاندان فضل و کمال اور رفعتِ علمی میں ممتاز چلا آرہا تھا۔ اس کے اصحابِ علم کی شہرت فقط ہندوستان تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل گئی تھی اور پڑھے لکھے لوگ ان سے حصولِ فیض پر فخر کرتے تھے۔ مولانا سلام اللہ دہلوی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ وہ تیرھویں صدی ہجری کے نامور مفسّر، ممتاز محدث اور صاحبِ نظر فقیہ تھے۔ علومِ متعارفہ کی تحصیل اپنے والدِ ماجد شیخ الاسلام سے کی، جنھوں نے صحیح بخاری کی فارسی میں شرح سپردِ قلم کی، رسالہ طرد الاوہام عن اثر الامام الہمام لکھا اور کشف الغطا عما لزم للموتیٰ عن الاحیاء تصنیف کی۔ سندِ حدیث بھی والدِ مکرم سے حاصل کی۔

---

[۱۵] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۰

مولانا سلام اللہ کے جدِ امجد حافظ فخر الدین بھی عالم دین، علامۂ عصر اور مصنفِ شہیر تھے، جن کے والد شیخ محب اللہ نے فارسی میں صحیح مسلم کی شرح منبع العلم کے نام سے لکھی تھی، لیکن وہ غیر مرتب تھی، حافظ فخر الدین نے باپ کی اس شرح کو مرتب کیا اور پھر انہی کے نام سے معروف ہوگئی۔ عین العلم کی شرح بھی حافظ فخر الدین نے مکمل کی اور حصن حصین کی شرح بھی تحریر فرمائی۔

بہر حال مولانا سلام اللہ دہلوی نے اپنے اسلاف کرام سے فیض حاصل کیا جو علم و فضل میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ چوں کہ اصلاً دہلی کے رہنے والے تھے اور یہی بلدۂ علم ان کا مولد و منشا تھا، اس لیے دہلوی کہلائے۔ پھر جب حصولِ علم سے فارغ ہو چکے تو رام پور کے حکمران نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں رام پور چلے گئے تھے، لہٰذا رام پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ رام پور میں انھوں نے خوب تدریسی و تصنیفی خدمات انجام دیں اور لوگوں کو بے حد فیض پہنچایا، اسی بنا پر نواب رام پور نے ان کو انتہائی عزت و احترام کا مستحق ٹھہرایا اور انعامات و عطایا سے سرفراز کیا۔

مولانا سلام اللہ دہلوی نے مندرجہ ذیل شروح و تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔

۱۔ الکمالین حاشیہ علی جلالین: یہ قرآن مجید کی مشہور تفسیر جلالین پر حاشیہ ہے۔

۲۔ المحلّٰی شرح مؤطا: یہ حدیث کی معروف کتاب موطا کی شرح ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں تحریر کی۔

۳۔ شرح شمائل ترمذی: جامع ترمذی کے کتاب الشمائل کی شرح فارسی زبان میں ہے۔

۴۔ خلاصۃ المناقب: اس میں اہل بیت کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں۔

۵۔ ترجمہ صحیح بخاری: فارسی زبان میں۔

۶۔ رسالہ اصول حدیث: یہ رسالہ عربی میں ہے اور اصولِ حدیث کے متعلق ہے۔

۷۔ رسالہ فی الاشارۃ بالسبابۃ عند التشہد فی الصلوٰۃ: اس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ نماز میں حالتِ تشہد میں رفع سبابہ کرنا چاہیے۔

مولانا سلام اللہ دہلوی نے جمادی الاخریٰ ۱۲۲۹ھ میں اور ایک روایت کے مطابق ۱۲۳۳ھ میں رحلت فرمائی [۱۶]

## ۸۱ - مولانا سلامت اللہ کان پوری

مولانا سلامت اللہ بن برکت اللہ صدیقی کان پوری برصغیر پاک و ہند میں تیرھویں صدی ہجری کے ممتاز و مشہور علما میں سے تھے، رئیس بدایوں تھے، تمام علوم میں دسترس تھی اور ستاروں میں آفتاب کی مانند تھے۔ ان کی ذاتِ گرامی تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ اصلاً بدایوں کے رہنے والے تھے، ولادت و نشو و نما بدایوں ہی میں ہوئی۔ صرف و نحو کی کتابیں مولانا ابو المعالی بدایونی سے پڑھیں۔ فلسفہ و منطق کے بعض رسائل کی تکمیل مولانا ولی اللہ بدایونی سے کی جو مولانا باب اللہ جون پوری کے تلمیذ تھے۔ اس کے بعد بریلی میں سید مجد الدین شاہ جہان پوری (عرف مولوی مدن) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے باقی کتبِ درسیہ کی تحصیل کی۔ بعد ازاں دہلی گئے۔ وہاں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور ان کے برادرِ صغیر شاہ رفیع الدین دہلوی سے استفاضہ کیا۔ تفسیر و حدیث کی کتابیں ان سے قراءۃً و سماعۃً پڑھیں اور سند و اجازہ سے مفتخر ہوئے۔ تصوف و طریقت کا درس سید آل احمد حسینی مارہروی سے لیا۔

تحصیلِ علم کے بعد لکھنؤ گئے اور درس و افادۂ طلبا کا سلسلہ شروع کیا۔ مناظرہ و مباحثہ میں نہایت تیز تھے۔ کتبِ شیعہ پر عمیق نگاہ تھی اور ان کے اعتراضات و ایرادات کا مدلل جواب دیتے تھے۔ شیعہ کے نامور اور مشہور مجتہد بھی مناظرے میں ان کا مقابلہ نہ کر پاتے اور جواب سے عاجز آجاتے۔ شیعہ علما و مجتہدین نے تنگ آکر ان کی شدید مخالفت شروع

---

[۱۶] تذکرہ علمائے ہند ص ۷۶، ۷۷ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۰۱، ۲۰۲ — حدائق الحنفیہ ص ۴۶۸ — تذکرہ کاملانِ رام پور ص ۱۵۸، ۱۵۹ — ابجد العلوم ص ۹۲۷ — علم و عمل ج ۱ ص ۷۷، ۷۸ — تذکرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۳۱ تا ۲۳۳

کردی اور پھر حکومت اودھ نے انھیں لکھنؤ سے نکال دیا اور یہ کان پور چلے گئے۔ کان پور شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے کان پوری کی نسبت سے شہرت پائی۔

مولانا سلامت اللہ نسباً صدیقی، مولداً بدایونی، مذہباً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔ ہندوستان کے ممتاز فضلا اور معروف فقہا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام اور تصوف وغیرہ تمام علوم میں ماہرانہ نظر تھی۔ جامع المنقول والمعقول تھے۔ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور کشفی تخلص تھا۔ فارسی میں ان کا مجموعۂ اشعار بھی ہے جو "دیوانِ کشفی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

تصوف و سلوک اور فقہ وغیرہ میں متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

۱۔ تحفۃ الاحباب: یہ کتاب شیعہ کی تردید اور اہلِ سنت کی تائید میں ہے۔
۲۔ معرکۃ الآرا: اس کا موضوع بھی ردِ شیعیت ہے۔
۳۔ برقِ خاطف: یہ کتاب اہلِ سنت اور شیعہ کے درمیان مناظرے کے سلسلے میں ہے۔
۴۔ تحریر الشہادتین شرح سر الشہادتین: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں ہے۔
۵۔ خدا کی رحمت: یہ دو کتابیں ہیں، ایک چھوٹی اور ایک بڑی۔ یہ میلاد سے متعلق ہیں۔
۶۔ رسالہ شہاب ثاقب در سقوطِ کواکب:
۷۔ اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام۔
۸۔ حقائق احمدیہ: علمِ حقائق کے بارے میں ہے۔
۹۔ بحر التوحید: اولیاء اللہ کی شطحیات کے بیان میں۔
۱۰۔ اسرار العاشقین: اس میں عربی و فارسی اقوال و اشعار کو صوفیا کے طریق پر حل کیا گیا ہے۔

۱۱- رسالہ کشفیہ : یہ ان اعتراضات کے جواب میں ہے جو بعض لوگ نادانی کی بنا پر حافظ شیرازی کی ان اصطلاحات پر وارد کرتے ہیں، جو انھوں نے اشعار میں استعمال کی ہیں۔

۱۲- محی الدین ابن عربی کے ایک رسالے کا ترجمہ جو لطائف موسومہ معائنات صوفیا کے بیان میں ہے۔

۱۳- رسالہ نفحات حالات۔

۱۴- رقعات کشفی۔

۱۵- شرح مثنوی گل کشتی۔

۱۶- رسالہ الوان در بیان جواز و عدم جواز الوان۔

۱۷- رسالہ در تحقیق جواز مصافحہ و معانقہ عیدین۔

۱۸- مجموعہ فتاوی۔

۱۹- مجموعہ کلام۔

۱۲۶۷ھ کو انھوں نے کان پور میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی، اسی میں درس و تدریس کا معرکہ گرم رہتا تھا اور اسی مسجد میں لوگوں سے ملتے اور فقہی نوعیت کے فتوے تحریر فرماتے تھے۔ بے شمار علما و طلبا کو اس مسجد میں تعلیم دی۔ "تذکرہ علمائے ہند" کے مصنف مولوی رحمان علی بھی کچھ عرصہ ان سے مصروفِ استفادہ رہے۔

۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں شرکت کے لیے لوگوں کو تیار کیا اور اس میں سرگرم عمل رہے تھے۔ کان پور پر انگریزوں کے قبضے کے بعد یہ ریاست کدورہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں بعض دیگر حضرات بھی پناہ گزیں تھے، جن میں ایک عالمِ دین مولانا عبدالحق کان پوری بھی تھے جو وہاں کے سربرآوردہ حضرات میں سے تھے۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد مولانا سلامت اللہ دوبارہ کان پور آگئے تھے۔

اس عالم و فقیہ اور مصنفِ نامدار نے ہفتے کے روز ۳۰ رجب ۱۲۸۱ھ کو کان پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے[۱۷]۔

(نوٹ) حاشیہ نمبر ۱۷ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔

# ۸۲۔ مفتی سلطان حسن عثمانی بریلوی

مفتی سلطان حسن بن احمد حسن عثمانی بریلوی، اپنے دور کے فاضل اور شیخ تھے۔ مولد و منشا بریلی ہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی سے جو اپنے عہد کے فحول و مشاہیر علمائے ہند میں سے تھے، حصول علم کیا، دیگر علمائے وقت سے بھی مستفید ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کے لیے ترقی کے دروازے کھل گئے اور ایوانِ حکومت میں خوب قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ سب سے پہلے مسند افتا کو زینت بخشی۔ پھر بہ تدریج مناصبِ عالیہ پر فائز ہوتے گئے، یہاں تک کہ گورکھپور شہر کے عہدۂ صدارت پر مامور ہوئے۔ عدل و قضا کی بھاری بھر کم اور نازک ذمے داریاں بھی ان کے سپرد ہوئیں اور یہ مردِ جلیل اور عالم کبیر دیانت و امانت کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہوا۔ کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا، ہر کام صدق و وفا کے ساتھ انجام دیا۔

ان امورِ ہمہ کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی بہ دستور جاری رکھا۔ ان میں سے ہر کام اپنی جگہ انتہائی اہم اور کامل توجہ کا محتاج ہے، لیکن دیارِ ہند کے یہ فاضل اس طریقے سے ان سب امور میں مشغول رہے کہ کوئی کام دوسرے کام کی انجام دہی میں رکاوٹ نہیں بنا۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا جو انتہائی محنت اور کامل توجہ کا متقاضی ہے۔ ان کی ایک تصنیف غایۃ التقریب فی ضابطۃ

---

۱۷۵ تذکرہ علمائے ہند ص ۷۷ تا ۸۰ — الیانع الجنی ص ۷۹ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۲، ۲۰۳ — قاموس المشاہیر ج ۱ ص ۲۹۶ ج ۲ ص ۱۵۳ — ابجد العلوم ص ۹۱۸ مظہر العلما ص ۸۴، ۸۵ — شمع انجمن ص ۴۰۵، ۴۰۶ — تذکرۃ الواصلین ص ۲۶، ۲۶۲ —

التہذیب ہے، جس میں مفتی سعد اللہ مراد آبادی، شیخ عبد الحلیم لکھنوی اور دیگر علما پر تعاقب کیا اور بعض مسائل حکمیہ میں ان کے نقطۂ فکر سے اظہارِ اختلاف کیا ہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی پر بعض حضرات نے جو اعتراض کیے ہیں، چند رسائل میں ان کا دفاع کیا ہے۔

بریلی کے اس عالمِ اجل اور فاضل فقیہ نے ۱۲۹۸ھ میں وفات پائی [۱۸]

## ۸۳: مولانا سناء الدین عثمانی بدایونی

مولانا سناء الدین بن محمد شفیع بن عبد الحمید عثمانی بدایونی، فقہ و اصول کے علمائے ماہرین میں سے تھے۔ ۱۲۱۹ھ میں ولادت ہوئی، عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو مولانا فضل امام خیر آبادی اور دیگر علمائے عصر سے استفادہ کیا۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے بھی مستفیض ہوئے اور ان سے علومِ تفسیر و حدیث کی تحصیل کی اور تیرھویں صدی ہجری کے جیّد فقہائے ہند میں گردانے گئے۔ علوم مروّجہ سے فراغت کے بعد اپنے شہر بدایوں میں خود مسندِ تدریس بچھائی اور بے شمار تشنگانِ علوم کو فیض پہنچایا۔

کئی کتابوں کے مصنف اور محشّی تھے۔ مثلاً علمِ نحو کی بعض درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیں۔ لغت کی مشہور کتاب قاموس پر حاشیہ لکھا۔ عربی میں متعدد تالیفات اپنی یادگار چھوڑیں۔

بدایوں کے اس عالم و فقیہ نے ماہ محرم ۱۲۷۸ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا [۱۹]

### دیگر فقہائے کرام

ردیف س میں ان حضرات کے علاوہ مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی

---

[۱۸] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۰۳

[۱۹] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۱ —— نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۰۴

بھی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں "فہرستِ فقہا" میں درج ہیں :

۱۔ سید سجاد علی حسینی جائسی : شیعہ تھے اور بریلی کے رہنے والے تھے۔ فقہ و اصول میں ماہر تھے۔ مولد و منشا "جائس" ہے۔ سید دلدار علی نصیر آبادی کے شاگرد تھے۔ انہی سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ شعر و انشا سے لگاؤ تھا۔ مصنف و مترجم بھی تھے۔

۲۔ مفتی سخاوت علی بنارسی : والد کا نامِ نامی مفتی ابراہیم اور جدِ امجد کا عمر تھا۔ حنفی المسلک تھے۔ صلحا و اتقیا میں سے تھے۔ ۱۲۱۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والدِ گرامی سے لکھنؤ میں حصولِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بہرائچ میں مفتی مقرر ہوئے۔ عرصے تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر بنارس واپس آگئے اور درس و تدریس کی زندگی اختیار کرلی۔ یہ خدمت بڑے شوق اور لگن سے انجام دی۔ فقہ میں چوں کہ عبور حاصل تھا، اس لیے محکمۂ افتا میں بھی بہت کامیاب رہے۔ ۲۹ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۱ھ کو رحلت فرمائی۔

۳۔ مولانا سراج الدین گجراتی : مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے۔ سراج الدین بن صادق بن عطاء اللہ بن عبداللطیف بن پیر محمد جانپانیری گجراتی، فقہ و اصول کے سرکردہ علما میں سے تھے اور نیکی و صالحیت میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ولادت اور نشو و نما ہندوستان کے شہر گجرات میں ہوئی اور اپنے عصر و عہد کے ممتاز اساتذہ کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس و افادۂ طلبا کو اپنا مشغلہ قرار دیا۔ بہت سے علما و فضلا ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ ۱۲۱۳ھ کو احمد آباد میں انتقال کیا۔

۴۔ مولانا سعد الدین لکھنوی : والد کا نام مفتی عبدالحکیم تھا۔ مسلکاً حنفی تھے۔ اصلاً لاہور کے رہنے والے تھے، بعد کو لکھنؤ چلے گئے تھے، اس لیے لکھنوی کہلائے۔ مشہور و نامور علما میں سے تھے۔ لکھنؤ کے مطبع مصطفویہ میں کتابوں کی تصحیح کا کام کرتے تھے۔ کئی کتابوں پر تعلیقات لکھیں۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی کتاب "مالا بدمنہ" پر حواشی تحریر کیے۔ یہ کتاب فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عجالہ نافعہ پر بھی حواشی تحریر کیے۔

# ش

## ۸۴۔ مولانا شجاع الدین علوی حیدر آبادی

مولانا شجاع الدین علوی حیدر آبادی کے والد کا نام کریم اللہ اور دادا کا قاضی محمد دائم تھا۔ ہندوستان کے ممتاز علما میں سے تھے۔ شیخ صالح اور متقی بزرگ تھے۔ ۱۱۹۱ھ میں برہان پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مولانا غلام محی الدین برہان پوری بہت نیک اور عالم آدمی تھے، ان سے بعض درسی کتابیں پڑھیں اور بعض کے لیے دیگر علمائے عصر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نانا کی وفات کے بعد ۱۲۰۶ھ میں حجاز مقدس گئے اور سعادتِ حج حاصل کی۔ حج سے واپس آئے تو حیدر آباد کا عزم کیا، وہاں مولانا عزت یار خاں حیدر آبادی فروکش تھے، ان سے صحیح بخاری کا درس لیا۔ پھر قندھار روانہ ہوئے جو اعمالِ نانڈیڑ میں ایک گاؤں تھا۔ وہاں شیخ رفیع الدین قندھاری دکنی کا سلسلۂ سلوک وطریقت جاری تھا، ان سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد پھر حیدر آباد کو مراجعت کی اور وہاں درس وتدریس کی مسند آراستہ فرمائی فقہی مسلک میں حنفی تھے۔

مولانا شجاع الدین علوی برہان پوری نے درس وتدریس کے علاوہ تصنیفی خدمات بھی انجام دیں۔ ان کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتب ورسائل شامل ہیں:

۱۔ کشف الخلاصہ: اس میں حنفی فقہ سے متعلق مسائل بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۲۶ھ میں تصنیف فرمائی۔

۲۔ جوہر النظام: یہ بھی مسائلِ فقہ پر مشتمل ہے اور عربی نظم میں ہے۔

۳۔ رسالہ فی القراءۃ۔

۴۔ رسالہ فی بحث رویۃ اللہ عز وجل۔

۵۔ رسالہ فی فضل الجماعۃ۔

۶- رسالہ فی الجبر والقدر۔

۷- رسالہ فی بحث سماع۔

علاوہ ازیں سلوک و تصوف کے موضوع پر بھی بعض رسائل تصنیف کیے۔ کچھ مکتوبات، خطبے اور عربی و فارسی قصائد بھی ان کی یادگار ہیں۔

مولانا شجاع الدین ممدوح نے جمعہ کے روز ۴ محرم ۱۲۶۵ھ کو حیدر آباد میں وفات پائی۔[۱]

## ۸۵- مولانا شرف الدین ہاشمی پھلواروی

ہندوستان کے شہر پھلواری میں بے شمار علما و فقہا اور صوفیا و اولیا پیدا ہوئے۔ ان بزرگانِ عالی قدر میں مولانا شرف الدین پھلواروی کا نامِ نامی بھی شامل ہے۔ ان کے والد کا نام ہادی اور دادا کا احمدی تھا۔ نسلاً ہاشمی جعفری تھے۔ اپنے زمانے کے فاضل اور شیخ تھے۔ فقہ اور تصوف میں دسترس حاصل تھی۔

مولانا شرف الدین پھلواروی ۵ رجب ۱۲۳۵ھ کو پھلواری میں پیدا ہوئے۔ شعور کی آنکھ کھولی تو گھر میں علم و فضل کی نہر جاری تھی۔ اپنے ماموں محمد حسین سے، جو شیخ احمدی کے تلمیذ تھے، حصولِ علم کیا اور ۱۲۶۴ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

انھوں نے تہذیب المنطق کی بسیط و مفصل شرح سپردِ قلم کی۔ بہت سے لوگوں کو مستفید فرمایا، فقہی فتوے لکھے اور درس و تدریس کے ذریعے خدمتِ دین انجام دی۔ پھلواری میں، جس کو کئی سو سال سے علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے، مولانا شرف الدین کی خدماتِ نوع بنوع کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

اس عالمِ دین نے چون برس عمر پائی اور ۳ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ کو انتقال کیا۔[۲]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۵، ۲۰۶ بحوالہ تاریخ برہان پور

[۲] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۷

# ۸۶۔ مفتی شرف الدین رام پوری

مفتی شرف الدین رام پوری ہندوستان کے عالمِ کبیر، شیخ نام دار اور فاضلِ اجل تھے۔ حنفی المسلک تھے اور رام پور کی مسندِ تدریس و افتا پر فائز تھے۔ اس نواح میں علم و فضل اور فقہ و اصول میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ پورے علاقے میں ان کی تحقیق و کاوش کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ فتوے کے لیے لوگ انھی سے رجوع کرتے اور ان کی بات کو حرفِ آخر قرار دیتے تھے۔ ان کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا، جن حضراتِ علما نے ان سے استفادہ کیا، ان میں مولانا ابوسعید دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا محمد علی رام پوری، مولانا محمد حسن بریلوی، مولانا عبدالقادر رام پوری اور خلقِ کثیر شامل ہے۔ انھوں نے رام پور میں جو تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں ان میں اس علاقے اور عہد کا کوئی عالم و مدرس اور مفتی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

مفتی شرف الدین اصلاً پنجاب کے رہنے والے تھے۔ رام پور گئے تو نواب احمد علی خاں کے عہدِ حکمرانی میں ان کو عہدۂ قضا پر مامور کیا گیا۔ ان کی خدماتِ علمی کی بنا پر بعض گاؤں ان کو بطور معافی عطا کیے گئے تھے۔ لیکن انھوں نے رام پور کی سیاست میں حصہ لیا تو اس سے ان کی بہت تذلیل و تشہیر ہوئی اور معتوب قرار پائے۔ بعض اہلِ علم نے ان پر سخت الفاظ میں تنقید کی ہے اور ان کے فکری رجحانات کی شدید مخالفت کی ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اپنے دور کے نامور عالم اور ممتاز فاضل تھے۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ "علوم فلسفہ و منطق میں بہت مشہور تھے۔ ۱۲۵۶ھ میں جب وہ کلکتے سے رام پور جا رہے تھے تو راستے میں فتح پور ہسوہ کے مقام پر اپنے داماد محمد سعید کی قبر پر جو سید راجی کی درگاہ میں تھی، فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لائے۔ اس اثنا میں میرے بڑے بھائی حکیم احسان علی کے مکان پر بھی آئے۔ میں اس زمانے میں کم عمر تھا، لیکن ان کا حلیہ اب تک میرے ذہن میں

مرتسم ہے۔ میانہ قد، سیاہ رنگ، سفید ریش، کمزور جسم اور ضعیف القویٰ۔“

سید نواب محمد صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم میں مفتی صاحب ممدوح کا تذکرہ کیا ہے اور ان پر تنقید کرتے ہوئے انھیں ”شراً فی الدین“ لکھا ہے۔”تذکرہ علمائے ہند“ کے اردو مترجم ڈاکٹر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ ”اس ریمارک میں نواب صدیق حسن خاں کا عدم تقلید کا جذبہ کارفرما ہے۔“ ڈاکٹر صاحب ممدوح کا نواب صاحب کے بارے یہ محض سوئے ظن ہے۔ انھوں نے مفتی صاحب کو ”شرافی الدین“ اس لیے لکھا ہے کہ انھوں نے اتنا بڑا عالم ہونے کے باوجود بعض بدعات و محدثات کی تائید کی اور ان کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں ہوئے۔ اس میں ”عدمِ تقلید کا جذبہ“ ہرگز ”کارفرما“ نہیں ہے۔ نواب صاحب نے ابجد العلوم، تقصار، اتحاف النبلا اور التاج المکلل وغیرہ متعدد کتابوں میں ہندی اور غیر ہندی علما و زعما اور محدثین و فقہا کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں، ان میں اصحابِ تقلید کی تعداد، غیر مقلدین سے کہیں زیادہ ہے، اگر نواب صاحب میں ”عدمِ تقلید کا جذبہ کارفرما“ ہوتا تو ہر جگہ اصحابِ تقلید کا ذکر کسی اور انداز سے کیا جاتا۔ لیکن انھوں نے ایک دیانت دار تذکرہ نگار کی حیثیت سے یہ فرض انجام دیا ہے اور اہلِ حق کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے۔

بہر حال مفتی شرف الدین رام پوری پر انھوں نے جو تنقید کی ہے، اس میں ”عدمِ تقلید کا جذبہ کارفرما“ نہیں بلکہ مفتی صاحب کی بدعات و محدثات ہیں، اور بدعات و محدثات کی تنہا نواب صدیق حسن خاں ہی تردید نہیں کرتے، یقیناً مقلدین بھی اس کی سخت تردید کرتے ہیں۔

بلاشبہ ہر صاحبِ قلم کسی خاص فکر و عقیدے کا حامل ہوتا ہے، لیکن ہر صاحبِ قلم ہر شخص کا ذکر اپنے ہی فکر و عقیدے کی روشنی میں نہیں کرتا۔ وہ حقائق و واقعات کی روشنی میں قلم کو حرکت دیتا اور آگے قدم بڑھاتا ہے۔ اس لیے کسی صاحبِ قلم کی نیت کو زیرِ بحث لانے سے پہلے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ بالخصوص نواب صدیق حسن

خاں جیسے مصنف کے بارے میں گفتگو کرتے وقت تو انتہائی غور و فکر سے کام لینا چاہیے، جنھوں نے بلا امتیاز مذہب و مسلک ہزاروں اربابِ فضل و کمال سے اہلِ تحقیق کو روشناس کرایا، اور ان کی تحریر مستقل حوالہ قرار پا گئی۔

مفتی شرف الدین رام پوری بہت اچھے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سراج المیزان : علمِ منطق میں ہے۔
۲۔ شرح سلّم : الی لا یحد و لا یتصور۔
۳۔ فقہی فتوے۔
۴۔ ایک رسالہ جس میں ثابت کیا ہے کہ قارض کے لیے مقروض سے منافع لینا جائز ہے۔

علاوہ ازیں اور بھی متعدد رسالے ان کی تصانیف ہیں۔

مفتی شرف الدین موصوف نے ۵ شعبان ۱۲۶۸ھ کو وفات پائی[۵۳]

## ۸۷۔ مولانا شمس الدین حیدر آبادی

مولانا شمس الدین بن امیر الدین بن رحمت اللہ دہلوی حیدر آبادی، معقول و منقول میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۲۰۴ھ کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۱۹۵ھ کو علاقہ برار کے شہر ایلچ پور میں ولادت ہوئی اور عالمِ طفولیت ہی میں اپنے والد امیر الدین کے ساتھ حیدر آباد آئے۔ وہاں قرآنِ مجید حفظ کیا اور مختلف علمائے عظام سے تحصیلِ علم کی۔ بعد ازاں خود معرکہ آرائے

---

۵۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۸۴، ۸۵ ——— تذکرہ کاملانِ رام پور ص ۱۷۰، ۱۷۱ ——— ابجد العلوم ص ۹۲۸ ——— نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۰۷، ۲۰۸ ——— علم و عمل ج ۱ ص ۸۰ تا ۸۲

تدریس ہوئے اور بہت سے علما وطلبا کو فیض پہنچایا۔ علمِ فقہ اور دیگر علومِ متداولہ میں یگانۂ روزگار تھے۔

اس عالمِ اجل نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں مندرجہ ذیل تصانیف لائقِ تذکرہ ہیں:

۱۔ طریق الفیض
۲۔ شمس النحو
۳۔ شمس التصریف
۴۔ شرح کلمۃ الحق
۵۔ خزانۃ الامثال
۶۔ جدول در تحقیق نصف النہار
۷۔ علمِ بلاغت کے بارے میں ایک رسالہ
۸۔ مجموعہ اشعار فارسی و اردو

مولانا شمس الدین حیدر آبادی نے ۱۴ رجب ۱۲۸۳ھ کو حیدر آباد میں رحلت پائی۔ [۵۴]

## ۸۸۔ مولانا شبیر محمد افغانی دہلوی

عالمِ باعمل اور فاضلِ اجل مولانا شبیر محمد افغانی دہلوی اوصافِ گوناگوں میں عدیم المثال تھے۔ مسلکاً حنفی تھے اور اصلاً افغانستان کے باشندے تھے۔ تحصیلِ علم کے لیے وارد ہند ہوئے اور ملک کے جیّد اساتذہ سے فیض حاصل کرتے اور مختلف بلاد و امصار کی خاک چھانتے ہوئے دہلی آئے۔ اس زمانے میں دہلی شہر مرکزِ فضل و کمال تھا اور اس میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہوئے اور علوم حدیث و فقہ میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ مولانا

---

۵۴ تزکِ محبوبی —— نزہتہ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۲ ——

محمد اسماعیل شہید دہلوی ان کے ہم درس تھے جو قناعت و توکل کا پیکرِ حسین تھے۔

مولانا شیر محمد افغانی دہلی میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں حکیم غلام حسن کے مکان پر سکونت پذیر تھے۔ اس شہر کو انھوں نے اپنا مسکن قرار دے لیا تھا اور نہایت انہماک و توجہ سے حصولِ علم میں مشغول رہتے تھے۔

جب علوم ظاہری سے فارغ ہو چکے تو معرفت و تصوف کو مرکزِ التفات ٹھہرایا اور حضرت شاہ غلام علی علوی کی خدمت میں پہنچے جو مرجعِ اصحابِ زہد و اتقا تھے اور جن کے سلوک و عرفان کا شہرہ دور دور تک پہنچ چکا تھا، ان سے خوب فیض پایا۔

علومِ ظاہری و باطنی سے فراغت کے بعد خود مسندِ درس بچھائی اور افادۂ طلبا کو مقصدِ زندگی قرار دیا۔ اس اثنا میں بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا اور معرفت و ادراک سے مالا مال ہوئے۔

مولانا شیر محمد افغانی نہایت ذکی فطین اور انتہائی ذہین تھے۔ ساتھ ہی بے حد قانع، متوکل علی اللہ اور عابد و زاہد تھے۔ طلبا کو شوق اور دلچسپی سے تعلیم دیتے تھے۔

دورِ آخر میں ہندوستان کے حالات سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر ارادۂ ہجرت اور ادائے حج بیت اللہ کے لیے دہلی سے نکلے اور حجازِ مقدس کو روانہ ہوئے۔ لیکن اثنائے راہ میں ۲۹ صفر ۱۲۵۷ھ کو بیت اللہ پہنچنے کے بجائے دربارِ خداوندی میں پہنچ گئے۔ حضرت مرحوم بہت سے اوصاف و کمالات کے مالک تھے۔[۵]

## چند اور فقہائے کرام

حرفِ ش کے ضمن میں تذکرہ نگاروں نے تیرھویں صدی ہجری کے چند اور فقہائے کرام کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن ان کی تصنیفی اور فقہی سرگرمیوں کا زیادہ ذکر نہیں ملتا۔

---

۵ آثار الصنادید ص ۲۹۳ —— واقعات دار الحکومت دہلی ج ۲ ص ۴۱۶ —— نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۱۵

۱۔ سیّد شاکر علی حسینی لکھنوی : شیعہ امامیہ تھے اور جماعتِ شیعہ میں اپنے دور کے شیخ، فاضل اور فقیہ تھے۔ اپنے عہد کے اساتذہ سے علم حاصل کیا، فقہ کی کتابیں نامور شیعہ مجتہد سید دلدار علی نقوی نصیر آبادی سے پڑھیں اور عرصۂ دراز تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہے، یہاں تک کہ فروع و اصول میں اپنے اقران و معاصرین میں ممتاز گردانے گئے۔

۲۔ سیّد شرف الدین حسینی سورتی : والد کا اسمِ گرامی عبد الحق تھا۔ فقہ و اصول میں ماہر تھے۔ علاقۂ گجرات کے مشہور شہر سورت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ متعدد مشہور علما کی شاگردی اختیار کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسندِ مشیخت پر بیٹھے۔ ۱۱ ربیع الاوّل ۱۲۴۶ھ کو سورت میں وفات پائی۔

۳۔ مولانا شریعت اللہ صدیقی مراد آبادی : اصلاً گڑھ مکتیسر کے باشندے تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی صاحب "مراد آباد" آئے اور پھر وہیں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے۔ فقہ و اصول اور منطق و فلسفہ وغیرہ تمام علوم میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔ بعد میں مراد آباد سے کلکتے منتقل ہو گئے تھے اور ہندوستان کی انگریزی حکومت کی طرف سے کوئی اہم منصب انھیں تفویض کر دیا گیا تھا۔

۴۔ سیّد شیخ گجراتی : ان کا مختصر سلسلۂ نسب یہ ہے : شیخ بن محمد بن عبد اللہ بن علی بن محمد سورتی گجراتی۔ ولادت و نشو و نما گجرات کے شہر سورت میں ہوئی شافعی المسلک فقیہ تھے۔ مشائخ عیدروسیہ میں سے تھے۔ ان کے والد مولانا محمد سورتی عالم و فاضل بزرگ تھے۔ بیٹے نے انہی سے اخذِ علم کیا اور باپ کی وفات کے بعد ۱۲۵۶ھ میں مسندِ مشیخت کو زینت بخشی۔ ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۶۸ھ کو سورت میں انتقال کیا۔

# ص

## ۸۹- سیّد صادق نقوی لکھنوی

دیارِ ہند کے مشاہیر شیعہ علما و فقہا میں سیّد صادق نقوی نصیر آبادی لکھنوی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ یہ سیّد محمد نقوی کے بیٹے اور سید دلدار علی نقوی کے پوتے تھے۔ ولادت اور نشوونما لکھنو میں ہوئی۔ اپنے والد سیّد محمد نقوی، اپنے بھائیوں اور دیگر علمائے وقت سے تحصیلِ علم کی، اور تیرھویں صدی ہجری کے ان ہندی فقہا میں گردانے گئے، جو شیعیت سے وابستگی و انسلاک میں ممتاز تھے۔

اس خاندان کے تمام افراد اصحابِ علم و فضل تھے، ان حضرات نے اپنے مذہب کی جو تدریسی و تصنیفی خدمت انجام دی، وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ خود صاحبِ ترجمہ سید صادق نقوی مدرس اور مصنف تھے۔ ان کی تصانیف کو شیعہ مطبوعات میں خاص وقعت حاصل ہے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

۱- تایید المسلمین فی اثبات نبوۃ خاتم النبیین والرد علی المسیحیین۔

۲- قاطع الاذناب۔

۳- قامع النصاب بفص فصل الخطاب فی توجیہ الجواب۔

اس کے علاوہ اور بھی متعدد کتب و رسائل اپنی یادگار چھوڑیں۔

سید صادق نقوی عین عالمِ شباب میں ۴ رجب ۱۲۵۸ھ کو اس دنیائے فانی سے عالم بقا کو رخصت ہوئے [۱]

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۱۷، ۲۱۸

# ۹۰ - مولانا صالح سورتی

مولانا صالح بن خیر الدین بن محمد زاہد ہاشمی سورتی، تیرھویں صدی ہجری میں علاقہ گجرات میں شہر سورت کے شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ دونوں علوم میں یکساں عبور تھا۔ مولد و منشا سورت ہے۔ ان کے والدِ گرامی مولانا خیر الدین سورتی بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ لائق بیٹے نے انہی سے علم حاصل کیا اور طویل عرصے تک ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سورت کے منصبِ قضا پر متمکن ہوئے اور تمام عمر یہ خدمت انجام دی۔ محکمۂ افتا بہت اہم اور نازک محکمہ ہے، دورِ گزشتہ میں یہ محکمہ اسی شخص کو تفویض کیا جاتا تھا جو مسائلِ فقہ پر گہری نظر رکھتا اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ مولانا صالح کو اللہ نے اس مرتبۂ بلند سے خوب نوازا تھا اور وہ ان نزاکتوں کو جو اس ضمن میں پیش آتی ہیں، کماحقہ سمجھتے تھے۔

سورت کے اس عالمِ حدیث و فقہ نے ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۳۴ھ کو انتقال کیا۔[۵۲]

# ۹۱ - قاضی صبغۃ اللہ مدراسی

ہندوستان کے شہر "مدراس" کو کسی زمانے میں اصحابِ فضیلت اور اربابِ کمال کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اسلامی عہد میں بے شمار علما و فضلا نے یہاں سکونت اختیار کی اور لاتعداد لوگوں کو فیض پہنچایا۔ اس شہر کے ممتاز اہلِ علم میں قاضی صبغت اللہ بن محمد غوث بن ناصر الدین بن نظام الدین بن عبد اللہ شہید مدراسی کا اسمِ گرامی لائق تذکرہ ہے۔

قاضی صبغت اللہ ۵ محرم ۱۲۱۱ھ کو مدراس میں پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے

---

۵۲ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۱۸

قرآنِ مجید حفظ کیا، اس کے بعد علومِ مروّجہ کی تحصیل میں مشغول ہوئے۔ اس زمانے میں بحر العلوم مولانا عبد العلی لکھنوی مدراس میں فروکش تھے، قاضی صبغت اللہ نے جو طلبِ علم کے بالکل ابتدائی دور میں تھے، بحر العلوم سے تبرکاً میزان الصرف کے دو یا تین سبق پڑھے۔ یعنی ان کے شرفِ تلمذ سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد مختلف اساتذہ ۔۔ کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا، جن میں مولانا جعفر حسین مدراسی، مولانا علاء الدین لکھنوی، سید علی بن عبد اللہ حموی اور خود ان کے والدِ ماجد مولانا محمد غوث کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضراتِ علما سے تمام کتبِ درسیہ پڑھیں اور مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ طریقۂ نقشبندیہ کے مطابق سید عبد الغفار نقشبندی سے اخذِ طریقت کیا۔

قاضی صبغت اللہ مسلکاً شافعی تھے اور تحقیق و تدقیق کے اونچے درجے پر فائز تھے۔ قابلیت و صلاحیت اور حدیث و فقہ میں عبور کی بنا پر ۱۲۳۸ھ میں انھیں نائکود کا منصبِ صدارت تفویض ہوا۔ اس کے ایک سال بعد مسندِ افتا عطا کی گئی اور ۱۲۶۰ھ میں عہدۂ قضا سے سرفراز ہوئے۔ ۱۲۶۶ھ میں سعادتِ حج بیت اللہ حاصل کی اور شیخ محمد جان کے حلقۂ طریقت و سلوک میں داخل ہوئے۔

جب مدراس کی اسلامی حکومت ختم ہوگئی اور انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو انگریزی حکومت نے قاضی صاحب ممدوح کی معاش کا انتظام کر دیا اور وہ اپنے گھر کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گئے۔ اب انھوں نے اپنے آپ کو درس و افادۂ طلبا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ تشنگانِ علوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہ کامل توجہ اور انہماک سے ان کو درس دیتے۔ اس طرح بے شمار علما و طلبا نے ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کی سعادت حاصل کی۔

قاضی صبغت اللہ بہت اچھے مصنف تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

۱۔ ھدایۃ السالک الیٰ موطا امام مالک۔

۲۔ نور العینین فی مناقب الحسنین۔

۳- الاربعین فی معجزات سیّد المرسلین۔

۴- رشق السہام الی من ضعّف کل مسکر حرام۔

۵- ازالۃ الغمّۃ فی اختلاف الامّۃ۔

۶- عمدۃ الرائض فی فن الفرائض۔

۷- المطالع البدریہ فی شرح الکواکب الدریہ۔

۸- مناھج الرشاد شرح زواجر الارشاد۔

۹- ذیل علی القول المسدد فی الذب عن مسند الامام احمد۔

۱۰- فہرس احادیث معجم الصغیر۔

۱۱- تعلیقات علی حاشیہ شرح المواقف۔

۱۲- تعلیقات علی صحیح مسلم۔

۱۳- تعلیقات علی المنتقی ابن الجارود۔

۱۴- تعلیقات سنن الترمذی۔

۱۵- تعلیقات شمائل الترمذی۔

ان تصنیفات و تعلیقات اور حواشی کے علاوہ انھوں نے اور بھی متعدد کتب و رسائل تحریر کیے۔

بہر حال قاضی صبغت اللہ مدراسی اپنے دور میں ہندوستان کے فحول علما اور جلیل القدر فقہا میں سے تھے۔ دوشنبہ کے روز ۲۵ محرم ۱۲۸۰ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے[۵۳]

## ۹۲- مفتی صدر الدین دہلوی

صدر الصدور حضرت مولانا مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کا شمار برصغیر پاک و ہند

---

[۵۳] نزہۃ الخواطر ۷، ص ۲۱۹، ۲۲۰۔ بحوالہ تاریخ احمدی

کے جلیل القدر فقہا اور فحول علما میں ہوتا ہے۔ والد کا اسمِ گرامی مولانا لطف اللہ تھا اور اصلاً کشمیر کے رہنے والے تھے، اس لیے لطف اللہ کشمیری کہلاتے تھے۔ کسی زمانے میں ان کے آبا و اجداد دہلی چلے آئے تھے اور پھر اسی بلدۂ علم اور مرکزِ علما و فضلا کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ صدر الدین اسی خانوادۂ فضل و صلاح کے فردِ فرید تھے، جو ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹) کو دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ یہ وہ دور تھا جب دہلی میں مشاہیر اصحابِ کمال اور ممتاز اربابِ علم کی درس و تدریس کی محفلیں آراستہ تھیں اور دور دراز سے تشنگانِ علوم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی علمی تشنگی بجھاتے اور ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ صاحبِ ترجمہ مولانا صدر الدین نے بھی ان سے جی بھر کر استفادہ و استفاضہ کیا۔ مولانا فضل امام خیر آبادی سے علومِ حکمیہ و منطق کی کتابیں پڑھیں، شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین دہلوی سے فقہ و اصول اور دیگر علومِ شرعیہ کی تکمیل کی اور خوب استفادہ کیا، مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حلقۂ درس میں بھی شامل رہے اور ان سے سندِ حدیث حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علم و فضل کی دنیا میں ممتاز و نامور ہوئے اور مسندِ درس و تدریس کو زینت بخشی، دہلی کے صدر الصدور مقرر کیے گئے اور قبلہ گاہِ اصحابِ فضیلت قرار پائے۔

اس عہد میں ہندوستان کی مغل حکومت دم توڑ رہی تھی، اگرچہ بادشاہ تختِ ہند پر متمکن تھے، مگر برائے نام۔ دراصل کاروبارِ حکومت اور ملک کے سیاسی نظم و نسق کی باگ ڈور کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھی، اور مولانا صدر الدین کو اس میں نمایاں حیثیت حاصل تھی، وہ کمپنی کی طرف سے مفتیِ وقت تھے، صدر الصدور کے منصبِ بلند پر فائز تھے اور عدل و انصاف کا محکمہ ان کو تفویض کیا گیا تھا۔

## علوم میں عبور و استحضار

مفتی صاحب ہر فن میں کامل اور ہر گوشۂ علم میں ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ مسلکاً حنفی تھے۔ قرآن و حدیث کا کوئی پہلو زیرِ بحث آتا تو اس نہج سے اس کی وضاحت کرتے کہ معلوم ہوتا اس کے تمام گوشوں پر عبور حاصل ہے، اس کے سوا کسی فن

سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ یہی ان کا مرکزِ تحقیق اور ہدفِ فکر ہے۔ اگر فقہ و اصول سے متعلق زبان کو حرکت دیتے تو اس اسلوب سے اس کے نکات بیان فرماتے اور مسائل کی اس طرح صراحت کرتے کہ سننے والے حیران ہو ہو جاتے۔ اگر فلسفہ و منطق کے بارے میں گفتگو ہوتی تو اس کے باریک و نازک پہلوؤں کی زلفِ گرہ گیر کو اس انداز سے سلجھاتے کہ حاضرینِ مجلس ان کی وسعتِ مطالعہ سے نہایت متعجب و متحیر ہوتے۔ اگر سلسلۂ کلام کا رُخ شعر و سخن کی طرف مڑ جاتا تو اس میں بھی ان کی رائے حتمی اور قطعی قرار پاتی۔

بہرحال وہ یگانۂ روزگار عالم اور نادرۂ عصر فاضل تھے۔ ہر علمی معاملے میں ان کے نقطۂ نظر کو خاص اہمیت دی جاتی تھی، جو بات کرتے، دلائل کی روشنی میں کرتے، پختگی، قطعیت اور اپنے موقف کی تائید میں دلائل کی بھرمار ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اپنے دور میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا اور وہ مرجعِ خلائق تھے۔

## تذکرہ نگاروں کا نذرانۂ عقیدت

نواب صدیق حسن خاں نہایت احترام سے ان کا ذکر کرتے ہیں، اتحاف النبلا میں ان سے متعلق جو الفاظ تحریر کیے ہیں، ان میں سے بعض الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

صدر الصدور مفتی صدر الدین خاں بہادر دہلوی حنفی، اپنے عہد کے نامور فقیہ اور دہلی کے دورِ آخر کے ممتاز فضلا میں سے تھے۔ بالخصوص معقولات کی درس و تدریس میں بڑی شہرت و اہمیت رکھتے تھے۔ ہندوستان اور دار السلطنت دہلی میں ان کا فتویٰ جاری تھا اور وہ منصبِ افتا پر متمکن تھے۔ مدارس کے امتحانات اور حکومت کے دیوانی مقدمات کی صدارت ایسے اہم مناصب ان کے سپرد تھے۔ تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، صرف و نحو، منطق و فلسفہ، ریاضی و حساب، معانی و بیان اور ادب و انشا میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا اور ان تمام علوم کا باقاعدہ طلبا کو درس دیتے تھے۔ دہلی میں صاحبِ وجاہت و حشمت تھے۔ بجز بادشاہِ دہلی کے ہر حلقے کے لوگ ان کے مکان پر آتے اور اپنی حاجات و ضروریات ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ شہر دہلی اور اس کے گرد و نواح کے امرا و حکام، علما و زعما،

اعیان و اکابر، رؤسا و فضلا، غرض ہر طبقے کے لوگوں کی ان کے ہاں آمد و رفت تھی۔ اہلِ دنیا دنیوی معاملات میں اور اہلِ دین دینی امور میں ان سے مشورہ کرتے۔ شعرا، اصلاحِ شعر کے لیے اور انشا پرداز اپنی تحریریں درست کرانے کے لیے حاضرِ خدمت ہوتے۔ مشاعروں میں شرکت فرماتے اور داد پاتے۔ قوتِ حافظہ نہایت تیز تھی، متانت، سنجیدگی، مروت، حسنِ اخلاق اور رفعتِ کردار میں اپنی مثال آپ تھے۔ اونچے مرتبے کے مدرس اور مفرر تھے۔ فصاحتِ بیان اور بلاغتِ کلام میں مشہور تھے[۴]

سرسید نے آثار الصنادید میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور آغازِ گفتگو میں یہ شعر درج فرمایا ہے:

ہزار بار بشویم دہن زِ مشک و گلاب — ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبیست

اس کے بعد لکھتے ہیں:

قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصافِ حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامدِ پسندیدہ سے ایک لفظ کہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس زبدۂ جہان و جہانیاں کی صفات کا احصا محالات سے اور کمالات کا حصر مرتبۂ متعسرات سے ہے، جس وقت قلم چاہتا بھی ہے کہ کوئی صفت صفات میں سے لکھے یا زبان ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے، جو کہ ہر صفت قابلیت اوّل لکھنے کی اور ہر مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے، مدت تک یہی عقدہ بندِ زبانِ تحریر اور گرہ لسانِ تقریر رہتا ہے کہ کون سی صفت سے اور کون سی مدح سے ابتدا کرے۔

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ما ہمچناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم

بے شائبۂ تکلف و بے آمیزشِ مبالغہ، ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنونِ شتّٰی اور مستجمع علومِ بے منتہا ہو، اب سوا اس گروہِ علمائے روزگار کے بساطِ عالم پر جلوہ گر نہیں[۵]

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

---

[۴] اتحاف النبلا ص ۲۶۰

[۵] آثار الصنادید ص ۲۵۳

مفتی صدر الدین اپنے کمالاتِ علمی کی بنا پر فائق الاقران تھے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے دہلی میں صدر الصدور کے عہدے پر متمکن اور مفتیِ دہلی کے منصب سے سربلند تھے۔ مروت و احسان میں بے مثل تھے۔ دہلی کی جامع مسجد کے پہلو میں مدرسہ دار البقا میں طلبا کو درس دیتے اور ان میں سے اکثر کو طعام و لباس عطا فرماتے تھے ... کثیر الدرس عالم تھے اور دور دراز سے بے شمار علما و طلبا حصولِ علم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔[۵۶]

نزہۃ الخواطر میں سید عبدالحی حسنی لکھنوی تحریر فرماتے ہیں:

مفتی صاحب نادرۂ دہر عالم تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد گھر میں گوشہ نشین ہو گئے تھے اور درس و افادۂ طلبا کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد کے عقب میں مدرسہ دار البقا کے پندرہ طلبائے علم کو اپنی گرہ سے وظیفہ دیتے تھے۔ ان سے نہایت مروت کا برتاؤ کرتے، ان کے کھانے پینے کی کفالت فرماتے، ان کی دل جوئی کرتے، ان کی مجلس میں بیٹھتے اور انھیں متعدد علوم کا درس دیتے۔[۵۷]

مولانا محمد میاں لکھتے ہیں:

مفتی صاحب کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہنگامۂ ۱۸۵۷ کے بعد دہلی کی جامع مسجد کو انگریزوں کے قبضے سے نکالا۔ رقم فرماتے ہیں:

جامع مسجد غدر میں انگریزی قبضے میں آگئی تھی۔ یہ مقدس عمارت تقریباً دو سال تک فوجی استعمال میں رہی۔ مسلمانانِ دہلی فریضۂ نماز کی ادائیگی سے محروم تھے۔ جب دہلی میں امن چین ہو گئی تو مفتی صاحب نے عمائد شہر کی ہم نوائی میں مسجد کی واگزاشت کی سعی کی۔ آپ کے شرکا میں شاہی خاندان کے مرزا الٰہی بخش بھی تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کی اور مسلمان اکابرِ شہر کی ایک مختصر سی جماعت کی انتظامیہ کمیٹی بنا کر مسجد اس کو تفویض کی۔ اس

---

[۵۶] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۳

[۵۷] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۱

منتظمہ جماعت میں مفتی صاحب اور مولوی اکرام اللہ خاں وغیرہ تھے[۵۸]

مولوی فقیر محمد جہلمی حدائق الحنفیہ میں رقم فرماتے ہیں:

مفتی محمد صدر الدین خاں صدر الصدور دہلوی، تمام علوم صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشا، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔ آبا و اجداد آپ کے کشمیر کے اہلِ بیتِ علم و صلاح سے تھے۔ مگر آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ علوم نقلیہ فقہ و حدیث وغیرہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں، اور فنونِ عقلیہ کو مولوی فضل امام والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا، اور شیخ محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔ آپ بڑے صاحبِ وجاہت و ریاست اور اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے۔ ریاستِ درس و تدریس خصوصاً افتائے ممالکِ محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی اور امتحانِ مدارس و صدارت حکومت دیوانی کی آپ پر منتہی ہوئی۔ بجز شاہِ دہلی کے تمام اعیان و اکابر اور علما و فضلا خاص دہلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ طلبا تو واسطے تحصیلِ علم اور اہلِ دنیا واسطے مشورتِ معاملات اور منشی لوگ بغرضِ اصلاح انشا اور شعرا واسطے مشاعرہ کے آتے تھے۔ اس اخیر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیت اور قوتِ حافظہ و حسنِ تحریر و متانتِ تقریر اور فصاحتِ بیان اور بلاغتِ معانی کے صاحبِ مروّت و اخلاق اور احسان دیکھا نہیں گیا[۵۹]

## شاہ عبد العزیز کا ایک سفارشی خط

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ان کے استاد تھے اور بلند مرتبت استاد کے نزدیک شاگردِ رشید کے علم و فضل کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ مولانا صدر الدین کے اسلاف بھی اربابِ فضیلت میں سے تھے اور ان کے جدِّ امجد حضرت

---

۵۸ علمائے ہند کا شان دار ماضی ج ۴ ص ۲۳۰

۵۹ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱

شاہ ولی اللہ دہلوی کے تلمیذ تھے۔ اس کا پتا اس واقعہ سے چلتا ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں مولانا صدرالدین دہلوی طلبِ معاش کے سلسلے میں عازمِ کلکتہ ہوئے۔ ان کا مقصد وہاں کے ایک مدرسے میں ملازمت اختیار کرنا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے مدرسے کے مہتمم کے نام جنھیں مولوی امین اللہ کہا جاتا تھا، مولانا صدرالدین کو ایک سفارشی خط لکھ کر دیا، اس کا خلاصہ نواب صدیق حسن خاں نے اتحاف النبلا میں درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ خط جس پر شاہ صاحب کی مہر اور ان کے دستخط ثبت ہیں، انھوں نے دیکھا ہے۔ اس خط میں شاہ صاحب مولوی امین اللہ کو لکھتے ہیں:

مولوی صدرالدین صاحب دہلی کے فضلائے نامدار میں سے ہیں۔ عربی کے اکثر علومِ عقلی و نقلی میں، جن میں ادب، اصول، فقہ، کلام شامل ہیں اور فنونِ فارسی میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ تحقیقِ مسائل کے لیے اکثر مجھ ہی سے مراجعت کرتے ہیں اور میرے شاگرد ہیں۔ علاوہ ازیں مجھ سے تعلقِ ارادت بھی رکھتے ہیں اور ہمارے ساتھ تعلقات و مراسم کا یہ سلسلہ ان کے آبا و اجداد سے جاری ہے۔ ان کے دادا معروف و مستند فضلا میں سے تھے اور والدِ ماجد (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کے مخلص ترین احباب و تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اب یہ بعض معاملات کے لیے عازمِ کلکتہ ہوئے ہیں اور آپ سے ملاقات کریں گے۔ جہاں تک ممکن ہو، ہر لحاظ سے ان کے ساتھ اعزاز و اکرام کا برتاؤ کریں اور ان سے پورا تعاون فرمائیں۔ والسلام [۱]

مدرسہ دارالبقا کا انتظام و انصرام

مغل بادشاہ شاہ جہان نے دہلی میں جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس کے دائیں بائیں روحانی اور جسمانی امراض کے علاج کے ادارے بھی قائم کیے۔ یعنی ایک طرف مدرسہ دارالبقا

---

[۱] اتحاف النبلا ص ۲۶۱

اور دوسری جانب شفاخانہ دارالشفا تعمیر کرایا۔ مدرسہ دارالبقا میں مختلف اوقات میں بے شمار جید اساتذہ نے تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے اور لاتعداد طلبا اس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں مدرسہ دارالبقا کے منتظم و منصرم مولانا مفتی صدرالدین تھے اور یہ مدرسہ ہر اعتبار سے کامیاب تھا۔ استفادہ کرنے والوں کا ایک ہجوم اس میں رہتا تھا اور مفتی صاحب ممدوح خود درس دیتے تھے، متعدد طلبا کی کفالت بھی خود ہی کرتے تھے اور ان کے اخراجات کی ذمے داری انہی کے سپرد تھی۔

## تلامذہ

مفتی صاحب کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی متعدد اہم شخصیتوں نے ان سے علم حاصل کیا، آگے چل کر جن میں سے ہر شخص نے ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کر لی اور فضل و کمال میں بے حد شہرت حاصل کی۔ ان میں نواب صدیق حسن خاں، سرسید احمد خاں، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولوی سمیع اللہ خاں دہلوی، مفتی سعد اللہ مرادآبادی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولوی فقیر محمد جہلمی اور نواب یوسف خاں والیِ رام پور قابلِ ذکر ہیں اور یہ مفتی صاحب ممدوح کے وہ شاگرد ہیں جنھوں نے تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور دیگر ذرائع سے ملک و ملت کی انتہائی خدمت کی اور اسی وجہ سے ان کو ہند اور بیرونِ ہند میں بدرجۂ غایت احترام و اکرام کے مستحق گردانا گیا۔

## نواب صدیق حسن خاں سے تعلقِ خاطر اور سند

نواب صدیق حسن خاں ان کی بہ درجۂ غایت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ علم و فضل کے لحاظ سے بھی اور حسنِ اخلاق کے اعتبار سے بھی نہایت بلند مرتبے کے حامل تھے۔ نواب صاحب تقریباً دو سال ان کی خدمت میں رہے، اس اثنا میں انھوں نے ان سے بہت استفادہ کیا اور ہر جہت سے ان کو اونچے درجے

پر پایا۔ وہ ان سے انتہائی تلطف و مہربانی کا سلوک روا رکھتے اور انھیں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ نظام الدین اور دیگر بزرگانِ دہلی کے مزارات و مقابر پر لے جاتے، ان کی معیت میں انھوں نے شہر کے علما و مشائخ اور فضلا و صلحا کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کیا، شعرائے نام دار سے ملاقاتیں کیں اور ان کی مجالس میں شریک ہوئے اور بہت سی اہم شخصیتوں کو دیکھا[۱۱]

نواب صدیق حسن خاں نے ۱۲۷۱ھ میں ان سے سندِ فراغ حاصل کی، جس میں مندرجہ ذیل الفاظ مرقوم ہیں۔

مولوی سید صدیق حسن صاحب ذہنِ سلیم و قوتِ حافظہ و فہم درست و مناسبتِ تمام باکتاب و مطالعۂ صحیح و استعدادِ تام دارند۔ جملہ کتبِ معقول رسمیہ از منطق و حکمت و از علمِ دین اکثر از بخاری و چیزی از تفسیر بیضاوی و فقہ و اصول و عقائد و کلام و عربیت از فقیر اکتساب نمودند و مستعدانہ فہمیدہ خواندند، و باوجود آں بسعادت و رشد و صلاح و نیک نہادی و صفائے طینت و غربت و اہلیت و شرم و حیا در اقران و اماثلِ خود ممتاز اند۔[۱۲]

یعنی مولوی سید صدیق حسن صاحب ذہن کی سلامتی، قوتِ حافظہ اور اصابتِ فہم کے اوصاف سے متصف ہیں۔ کتابوں کے ساتھ پوری مناسبت اور دلچسپی رکھتے ہیں، مطالعۂ صحیح اور استعدادِ فکر کے جوہر سے آراستہ ہیں۔ معقول کی تمام مروّجہ کتابیں جو منطق و فلسفہ پر مشتمل ہیں، مجھ سے پڑھیں۔ علمِ دینی میں سے صحیح بخاری کے اکثر حصے، تفسیر بیضاوی کے بعض حصے اور فقہ و اصول، عقائد و کلام اور علومِ عربیہ کی تحصیل کی اور خوب سمجھ کر پڑھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خیر و سعادت اور رشد و صلاح کی دولت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ نیک طبیعت اور صاف طینت ہیں۔ اہلیت و صلاحیت اور شرم و حیا میں اپنے تمام اقران و اماثل سے ممتاز ہیں۔

---

[۱۱] اتحاف النبلاء ص ۲۶۱

[۱۲] اتحاف النبلاء ص ۲۶۲

## عزت واکرام

مفتی صاحب ممدوح انگریزی حکومت میں نہایت عزت واکرام کے مالک تھے۔ صدر الصدور اور مفتی کے اہم عہدوں پر فائز تھے۔ جنرل آکٹر لونی جب راجپوتانہ کا رزیڈنٹ مقرر ہوا تو اس کے ہمراہ رہے۔ آکٹر لونی ان پر بہت اعتماد کرتا تھا اور ان کی عقل و دانش کا مداح تھا۔ اس زمانے میں ان کو چار سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور باشندگانِ دہلی میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ طلبا کو گھر پر درس دیتے۔ مدرسۂ دار البقا کو جو عرصے سے بند تھا ازسرِ نو جاری کیا۔ طلبا کے جملہ مصارف کے خود ہی کفیل تھے۔

## فتوئ جہاد

۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) میں ہندوستان کے طول و عرض میں حصولِ آزادی کا غلغلہ بلند ہوا۔ یہ نہایت نازک موقع تھا، جس میں بلاشبہ غیر مسلموں نے بھی حصہ لیا اور مال و جان کی قربانی پیش کی لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی بالخصوص بہت بڑی تعداد انگریزوں کے خلاف میدانِ محاربہ میں نکل آئی تھی اور اجنبی اقتدار کے مقابلے میں صف آرا ہوگئی تھی۔ علمائے ہند نے اس کو جہاد قرار دیا اور چونتیس مشہور و ممتاز علما نے فتویٰ جہاد پر دستخط کیے، جن میں صدر الصدور حضرت مولانا مفتی صدر الدین دہلوی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ ان کے مکان اور مدرسے میں ہر وقت مجاہدین کا جمگھٹا رہتا تھا اور اس اہم مسئلے کے تمام پہلو زیرِ بحث آتے تھے۔ لیکن جب یہ تحریکِ جہاد ناکام ہوگئی اور ملک پر انگریزوں نے مکمل قبضہ کر لیا تو انگریزوں کی مخالفت میں جو لوگ گرفتار ہوئے اور مستحقِ سزا ٹھہرے ان میں مفتی صدر الدین کا نام نامی بھی شامل تھا۔

## مصائب و آلام

۱۸۵۷ء کے بعد مفتی صاحب کو شدید زخم چشم پہنچا۔ ملازمت بھی ختم ہوئی، اور تیس سال کی مدتِ ملازمت میں جو کچھ کمایا تھا وہ بھی بحقِ سرکار ضبط ہوا اور

منقولہ و غیر منقولہ تمام جائداد چھین لی گئی، بلکہ فتوی جہاد پر دستخط کے سلسلے میں چند مہینے نظر بند بھی رہے۔ کتب خانہ جو مختلف علوم و فنون کی بہت سی قیمتی اور نایاب کتابوں پر مشتمل تھا اور تین لاکھ روپے کی مالیت کا تھا، انگریزوں کے قبضے میں آیا اور پھر نیلام ہوا۔ مفتی صاحب کو سب سے زیادہ افسوس اس کتب خانے کا تھا۔

جب حالات کچھ اعتدال پر آئے تو جائداد کی واپسی کے سلسلے میں مفتی صاحب لاہور تشریف لائے۔ اس زمانے میں پنجاب کا چیف کمشنر لارڈ جان لارنس تھا۔ وہ دہلی رہ چکا تھا اور مفتی صاحب ممدوح سے بہت تعلق رکھتا تھا۔ لاہور آنے کا مقصد جائداد کی واپسی کے بارے میں جان لارنس سے گفتگو کرنا اور اس سے مدد لینا تھا۔ لیکن جائداد منقولہ نیلام ہو چکی تھی، لہٰذا اس کی واپسی ممکن نہ تھی۔ البتہ غیر منقولہ جائداد جو انگریزی حکومت نے ضبط کر لی تھی، واگزار ہو گئی۔

لاہور سے دہلی واپس گئے تو کچھ عرصہ بستی نظام الدین اولیا میں رہے۔ اس کے بعد اپنی حویلی میں تشریف لے گئے۔ اب تمام علائقِ دنیوی سے منقطع ہو کر وظائف و عبادات اور علومِ دینیہ کی تدریس کو اپنا وظیفۂ حیات قرار دے لیا تھا اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ مدارِ معاش مکان کا کرایہ تھا۔

۱۲۷۶ھ میں جب وہ بستی نظام الدین میں اقامت گزیں تھے، حدائق الحنفیہ کے مصنفِ شہیر مولوی فقیر محمد جہلمی ان کی خدمت میں گئے تھے اور تیرہ مہینے ان کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے مفتی صاحب سے علومِ عقلیہ و نقلیہ کی بعض کتابیں پڑھیں اور ان سے استفادہ کیا۔ یہ مفتی صاحب کا بڑھاپے کا دور تھا اور وہ بہتّر سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ مگر ذوقِ شعر و سخن پورے شباب پر تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں عمدہ شعر کہتے تھے[۱۳]

## حج بیت اللہ اور کتبِ دینیہ کی خواہش

شوال ۱۲۷۶ھ میں اپنے تلمیذِ رشید نواب صدیق حسن خاں کو ایک مکتوب ارسال

---

[۱۳] حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲

کیا، جس میں لکھتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے، ابھی تک سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے اور زندہ ہوں۔ اس کی رضا پر راضی اور جس طرح گزر رہی ہے، اس پر خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے اس کی اطاعت کا خواہاں اور اس کے احکام پر عمل کا متمنی ہوں۔ ہر حال میں صابر و شاکر ہوں، جادۂ صواب اور طریقِ مستقیم پر چلنے کی التجا کرتا ہوں۔ نواہی سے اجتناب اور معروف کے مطابق زندگی بسر ہو تو اس سے بہتر کوئی شی نہیں۔ دل میں دو چیزوں کی شدید خواہش رکھتا ہوں، ایک حج بیت اللہ کی کہ اللہ اس کی توفیق عطا فرمائے، دوسرے کتبِ دینیہ، یعنی تفسیر اور حدیث کی کہ یہی علمِ نافع ہے اور اسی میں احکامِ دین پوشیدہ ہیں۔ باقی سب لغو اور فضول چیزیں ہیں۔ اوقاتِ خاصہ میں میرے لیے حسنِ خاتمہ اور انجامِ خیر کی دعا کرتے رہیے[۱۱۵]

اس زمانے میں حج بیت اللہ نہایت مشکل تھا، ہزاروں میں کسی ایک خوش قسمت کو یہ سعادت نصیب ہوتی تھی۔ راستے بہت تکلیف دِہ اور سفر انتہائی صبر آزما۔ بری اور بحری دونوں ذرائع سفر مشکلات و موانع سے پُر تھے۔ موجودہ زمانے کا طریقِ سفر اس سے قطعی مختلف ہے۔ ہوائی جہاز سے انسان دو چار گھنٹے میں ارضِ حجاز پر جا اترتا ہے۔ سمندری جہاز سے بھی زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں مسافت طے ہو جاتی ہے۔ لیکن گزشتہ زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ افسوس ہے گوناگوں مشکلات آڑے آئیں اور مفتی صاحب سخت تمنا کے باوجود حج نہیں کر سکے۔

## شعر و شاعری

مفتی صاحب عربی، فارسی اور اردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور آزردہ تخلص کرتے تھے۔ یعنی مفتی صدرالدین آزردہ۔ مولوی فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں: فرطِ عشق اور ولولۂ محبت سے ہمیشہ آزردہ خاطر، افسردہ طبع، دیدۂ گریاں اور سینۂ بریاں رہتے

---

۱۱۵ اتحاف النبلاص ۲۶۱

تھے۔ شعر پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز، لحنِ حزیں اور صوتِ درد انگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپ کی زبان سے سخنِ موزوں سنا ہے وہی اس کیفیت کو جانتا ہے کہ کیا انشا و شعر تھا یا ایجادِ سحر۔ غالبؔ، حسرتیؔ، مومنؔ اور دیگر شعرائے دہلی سے آپ کے بہت اچھے تعلقات تھے، سب لوگ آپ کو لائق احترام گردانتے اور آپ کی تعریف کرتے تھے[۱۵]

اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرزا غالبؔ اپنے ایک شاگرد مولوی عبدالرزاق شاکرؔ کے نام ایک خط میں مفتی صاحب کا ذکر بھی کرتے ہیں اور نہایت تعریف کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے لیے انتہائی عزت کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں، لکھتے ہیں:

مخمس بعد اصلاح بھیجا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ شعر آپ کہتے ہیں اور حظ میں اٹھاتا ہوں۔ حسنِ اتفاق سے اصلاحِ خمسہ کے وقت دوستِ غم گسار، یارِ وفا شعار، علامۂ روزگار، ختم العلماء المتبحرین مولوی صدرالدین خاں صاحب بہادر صدر الصدور سابق دہلی المتخلص بہ آزردہ دام بقاءہ وزاد علاءہ مجھ سے ملنے کو غم خانہ پر تشریف لائے ہوئے، موجود تھے۔ خمسہ کو دیکھ کر پسند فرمایا[۱۶]

ذیل میں مفتی صاحب کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔ پہلے عربی شعر ملاحظہ ہوں:

وکنا کغصنی بانۃ قد تالفا — علی دوحۃ حتی استطالا و اینعا
یغنیہما صدح الحمام مرجعا — ویسقیہما کاس السحائب مترعا
سلیمین من خطب الزمان اذا سطا — خلیین من قول الحسد واذا اسعا
ففارقنی من غیر ذنب جنیتہ — والقی بقلبی حرقۃ و توجعا
عفا اللہ عنہ ما جناہ فاننی — حفظت لہ العہد القدیم وضیعا

فارسی شاعری میں ایسا بلند مقام رکھتے تھے کہ صہبائی نے اس سے متاثر ہو کر کہا تھا:

---

[۱۵] حدائق الحنفیہ ص ۴۸۲ — نیز دیکھیے اتحاف النبلاص ۲۶۲

[۱۶] اردوئے معلیٰ حصہ اوّل جلد اوّل ص ۴۲۵

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاک ایرانم نمی آید

ذیل میں ان کے چند فارسی شعر پڑھیے :

خواہم دم دعا بدعا ناگریستن
شد بسکہ بے اثر بدعا ہا گریستن

سوز دلم نمود دو بالا گریستن
ایں درد را نگشتہ مداوا گریستن

دل قطرہ قطرہ خوں شدہ از چشم بر چکید
تاراج داد مشغلۂ ما گریستن

اے دل بیا کہ خاک کنم ابر و برق را
از تو بخوں تپیدن و از ما گریستن

اشعار تر دریں غزل آمد کہ ربط داشت
چوں چشم من قوافی آں با گریستن

آزردہ خیز کامدہ طرفے و طالبا
از تو قصیدہ خوانم و زینہا گریستن

اب اردو کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے ،

نالوں سے کب مرے تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمیں و زمیں آسماں نہیں

مجھ سا بھی کوئی عشق میں ہے بدگماں نہیں
کیا رشک دیکھ کر مجھے رنگِ خزاں نہیں

جانے ہے دل فلک کا مری سچ کہانیاں
ان ناتوانیوں کو پہونچتی تواں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں

بے وقت آئی دیر میں کیا شور شیں کریں
ہم پیر دیر میکدہ بھی نوجواں نہیں

آزردہ نے پڑھی غزل اک میکدہ میں کل
وہ صاف تر کہ سینۂ پیرِ مغاں نہیں

---

شب جوش گریہ تھا مجھے یاد شراب میں
تھا غرق میں تصورِ آتش سے آب میں

کیا جانو جو اثر ہے دم شعلہ تاب میں
یہ وہ ہے برق آگ لگا دے نقاب میں

قسمت تو دیکھ کھولی گرہ کچھ تو رہ گئے
ناخن ہمارے ٹوٹ گئے بند نقاب میں

مے اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

انوارِ فکر سے نہ ہوا کچھ بھی انکشاف
جتنا پڑھے ہم اور پڑے جا حجاب میں

یہ عمر اور عشق، ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہدِ شباب میں

حسن کی شان سے ہے یہ رہے مستور نہیں
ورنہ ہوتا کبھی یوں جلوہ سرِ طور نہیں

چارہ اب کیا ہو جو ہو نشتر و مرہم یکساں — کون سا داغ ہے سینے میں جو ناسور نہیں
محتسب کو کیا بے کار تری آنکھوں نے — ایک میخانہ بھی اس دور میں معمور نہیں
دامن اس کا تو بھلا دور ہے، ہاں دستِ جنوں — کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں
میں ہوں اور گوشۂ یثرب یہ تمنا ہے اب — خواہشِ سلطنتِ قیصر و فغفور نہیں
مدد اے پرتو وصف نبوی کوئی عمل — شمع تنہائی ظلمت کدۂ گور نہیں
ہوں ادا نظم میں کس طرح مناقب تیرے — سلسلہ یہ متناہی ہے وہ محصور نہیں
ترکِ روئے خوش آزردہ محالات سے ہے — یوں خدا کی تو خدائی سے ہے کچھ دور نہیں

---

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ — اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں

---

کامل اس خرقۂ زہاد میں اٹھا نہ کوئی — کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

---

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

---

مکھڑا وہ غضب، زلفِ سیہ فام یہ کافر — کیا خاک جیے کوئی شب ایسی، سحر ایسی

## انصاف دوست عالم

مفتی صدر الدین آزردہ معتدل مزاج اور انصاف دوست عالم تھے۔ خواہ مخواہ جھگڑتے رہنا اور دوسروں پر کفر کے فتوے لگانا ان کا شیوہ نہ تھا۔ مولانا اسماعیل شہید سے اختلاف کے باوجود ان کی بہت تعریف کرتے۔ نواب صدیق حسن خاں رقم فرماتے ہیں۔

باوجود تعصبِ مذہب انصاف دوست بود، بارہا از زبانش ثنا و صفت مولانا محمد اسماعیل شہید و مولوی اسحاق دہلوی نزیلِ مکۂ مکرمہ شنیدہ شدہ [۱۲]

یعنی اپنے مذہب (حنفیت) میں تعصب کی حد تک متشدد ہونے کے باوصف انصاف دوست اور روادار تھے۔ بارہا ان کی زبانِ مبارک سے مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی کے بارے میں صفت و ثنا کے کلمات سنے گئے

---

[۱۲] اتحاف النبلاص ۲۶۰

کثرتِ علم اور فراوانیِ فضل و کمال کی وجہ سے علما و طلبا ان کی طرف رجوع کرنے میں فخر محسوس کرتے اور ان سے سند و اجازہ کو بہت بڑا اعزاز قرار دیتے تھے۔ بعض لوگ مختلف بلاد و امصار کے نامور اساتذہ سے علومِ مروجہ اور فنونِ متداولہ کی باقاعدہ تحصیل کر کے بھی ان کی خدمت میں آتے اور ان سے چند اسباق یا کوئی چھوٹی سی کتاب پڑھ کر ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرتے تھے[۵۱۸]

## تصنیفات

مفتی صاحب ممدوح کا زیادہ وقت اور عمر کا اکثر حصہ درس و تدریس اور افتا نویسی وغیرہ کے اہم کام میں گزرا۔ تصنیف و تالیف کا انھیں بہت کم موقع ملا۔ تاہم کچھ کتابیں ان سے یادگار ہیں اور وہ یہ ہیں :

۱۔ منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال : اس میں انھوں نے امام ابن حزم، امام ابن تیمیہ اور ان دیگر محدثین و فقہا کا رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث لا تشد الرحال الا الی ثلاث مساجد کی رو سے قبور انبیا و اولیا کی زیارت کو جانا جائز نہیں۔

۲۔ الدر المنضود فی حکم امرأۃ المفقود : اس میں بتایا گیا ہے کہ جس عورت کا شوہر مفقود الخبر ہو، وہ کتنا عرصہ انتظار کرے۔

۳۔ بہت سے فقہی فتوے جو انھوں نے مختلف لوگوں کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے۔

۴۔ تذکرۂ آزردہ : کچھ عرصہ پہلے تک "تذکرۂ آزردہ" کے وجود سے متعلق شبہ کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ اس کا کوئی نسخہ سامنے نہیں آیا تھا۔ لیکن اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی، اس لیے کہ آزردہ کے تذکرے کا ایک قلمی نسخہ آکسفورڈ

---

۵۱۸ اتحاف النبلاص ۲۶۲

میں دست یاب ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا بیان ہے کہ "مفتی صدر الدین آزردہ کے اس تذکرے کا واحد نسخہ آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔ یہ ناقص الآخر ہے اور ردیف نون پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس میں انشا کا ترجمہ ان کے عالمِ دیوانگی ۱۲۲۶ھ اور ۱۲۳۳ھ کے مابین داخل کیا گیا ہے۔ غالباً یہی اس کا زمانۂ تالیف ہے۔ اس کا ایک عکس ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (علی گڑھ) کے پاس ہے۔ دوسرا عکس جو ہلکے مٹیالے رنگ کے کاغذ پر ہے اور اصل مخطوطے کے سائز پر تیار کیا گیا ہے، اکبر علی خاں (رام پور) کے پاس ہے[۱۹]۔"

مفتی صاحب کے فقہی نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور ان کی تحقیق میں گفتگو کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ تیرھویں صدی ہجری میں دیارِ ہند کے جلیل القدر عالم اور عظیم فقیہ تھے۔ انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں وہ اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ فتویٰ نویسی، درس و تدریس اور شعر و شاعری میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اللہ نے ان کو جن متنوع خوبیوں سے نوازا تھا، وہ کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔

## نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام ایک خط

مئی جون ۱۹۲۱ء کے "معارف" (اعظم گڑھ) میں مفتی صاحب ممدوح کا ایک خط شائع ہوا ہے، جو انھوں نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط اردو میں ہے اور ۱۸۵۷ کے بعد کا ہے۔ اس خط سے ان کے بہت سے کوائف کا پتا چلتا ہے۔ خط کے اندراج سے پہلے ان کا مختصر سا تعارف کرایا گیا ہے، جو یہ ہے:

مفتی صاحب موصوف غدر کے پس و پیش زمانے میں دلّی کے سربرآوردہ علما میں سے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ شعر و سخن کے لحاظ سے غالب کے ہم نشینوں اور حریفوں میں تھے۔ دلّی میں اونچے درجے کے

---

[۱۹] اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۲۵۰، ۲۵۱

طلبا کو بے مزد و اجرت علمائے سلف کے طریقے پر درس دیتے تھے، منصب کے لحاظ سے انگریزوں کی طرف سے دلّی کے صدرالصدور تھے۔ اس وقت تک عام مسلمان اور خصوصاً علما انگریزوں کی نوکری کو حرام اور کم از کم تقوے کے خلاف جانتے تھے، جس کی شہادت اس زمانے کے بزرگوں کے خطوط میں بکثرت ملتی ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے اس منصب کی آمدنی سے اپنی ذاتی جائداد بہت پیدا کرلی تھی، لیکن غدر کے طوفان میں ان پر بھی انگریزوں نے بے وفائی کا الزام قائم کیا، اور ان کی جائداد ضبطی میں آگئی اور منصبِ صدارت سے بھی الگ کر دیے گئے۔

ذیل کا خط اسی زمانے کا ہے، اس خط سے مفتی صاحب کے اندرونی خیالات کا پتا لگے گا اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ دہلی کی تباہی پر ان کا دل کیسا کڑھتا تھا۔ اس عہد میں خط و کتابت کی زبان فارسی تھی مگر غالب کی جرأت آموزی نے دوسرے ادیبانِ ہند کو بھی اس کی ہمت دلادی تھی کہ وہ بے تکلّف اور رواں اردو میں اظہارِ مطلب کریں، چنانچہ اس خط سے معلوم ہوگا کہ غالب کے علاوہ اور ان کے معاصر انشا پردازوں کی طرزِ تحریر بھی کیسی بے تکلف، سادہ اور رواں تھی۔

یہ خط ہم کو مفتی صاحب کے شاگردِ رشید نواب صدیق حسن خان مرحوم کی ایک نا تمام قلمی "تاریخ قنوج" میں دست یاب ہوا ہے، جو اب ان کے خلف الصدق صفی الدولہ نواب علی حسن خان کے پاس ہے — (خط مندرجہ ذیل ہے)

"شکر ہے اُس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا، نکالا، کیسے علائق میں جکڑبند تھا کہ نکلنا اوس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا، مقدماتِ اصلی کا فیصل کرنا، منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتویٰ دینا، کمیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبا۔ مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزارہا کاغذ کا دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علموں کا پڑھانا اور اطراف و جوانب کے سوالاتِ شرعی کا لکھنا، وہابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم

ہونا، مجالسِ شادی اور غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا، الفتون[۲۰] کو ساتھ لے جانا اور اون کی دعوت کا اہتمام کرنا، یہ اشغال ایسے تھے کہ رات دن اسی میں غلطان پیچان تھا اور جان کو ایک دم آرام نہ تھا۔ نہ کھانے کی حلاوت، نہ سونے کا مزہ، نہ طاعت کا لطف، نماز پنج گانہ بھی حسبِ عادت ادا ہوتی تھی۔ وجوہِ فیصلہ لکھتے لکھتے ظہر کا وقت اکثر آجاتا تو وجوہ ڈگری و ڈسمس کے عین نماز میں وسوسہ انداز ہوتے۔ تنخواہ اور آمدنی رجسٹری کی جب آتی تو ریوڑیوں کی طرح بٹ جاتی۔ اگرچہ لوگوں کو میرے ہونے سے اس کام پر نفع تھا مگر میری ذات کو کچھ فائدہ اور تمتع دنیا کا نہ تھا، اور آخرت کا حال یہ ہے کہ یہ نوکری یعنی فصل خصومات موافق قوانین انگریزی کے اور یہ فتوی نویسی برعایت قواعد شرع ہو ہرگز جائز نہ تھی، گو دباؤ سے ہمارے علم و وجاہت کے کوئی بول نہ سکتا تھا اور استکراہ ہمیشہ اس سے رہا مگر کبھی چھوڑا نہیں۔ اس چالیس[۲۱] برس کی نوکری میں ہزار ہا کو جتایا اور ہزار ہا کو ہرایا، سیکڑوں لیسوہ داریاں ہمارے حکم سے نیلام ہوئیں، صدہا آدمیوں کے قتل کا فتویٰ دیا اور صدہا قید ہوئے، سوائے اس کے اور گناہ بہتیرے ہیں جن کو میں جانتا ہوں، اور جو علمِ الٰہی میں ہیں، اس کا کچھ حساب نہیں۔ ساری عمر صرفِ افعال بہیمی و حیوانی ہوئی اور اگر انسان ہوئے تو شیطان ہوئے۔ اسی کی مغفرت پر بھروسہ ہے، والا مواخذہ ہو تو کچھ ٹھکانا نہیں۔ حقوق اللہ وہ اپنے فضلِ عمیم سے بخشے گا، حقوق العباد بھی اس کے کرم سے بخشے جائیں گے۔ اللّٰھم مغفرتك اوسع من ذنوبي و رحمتك ارجی عندی من عملی جب حال یہ ہے تو کیسا انعام و احسان اس کا ہے کہ ایسے گرفتارِ علائق کو ان بلیات سے ایسا الگ کر دیا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں، اور اگر اسی حال میں موت آجاتی تو نفس اسی آفات میں مبتلا رہتا جیسا کہ کما تعیشون تموتون کما

---

[۲۰] یہ خاص دلی کا لفظ ہے جس کے معنی "بیکار لوگوں" کے ہیں۔

تمونون تحتشرون - اور کس وقت میں علیحدہ کیا کہ جب عمر ستر کو پہنچی اور پھر نجات کس مصیبت سے دی کہ کوئی مصیبت دنیا کی اس سے بڑھ کر نہ تھی اور رزق کا ڈھنگ ایسا پیدا کر دیا کہ اس کی حلت میں کچھ شبہ نہیں - املاک متروکۂ پدری اس میں کم تھیں اور اکثر زر خرید اسی مالِ مشتبہ سے تھی، وہ بالکل مشروع ہو گئی اور پھر سرکار سے مجدداً عطا ہوئی خواہ وہ آدھی ہو یا ساری ہو واسطے معاش کے کافی ہے، خیر الذکر الذکر الخفی وخیر الرزق ما یکفی - اور نہ وہ کتابیں رہیں جن کا پڑھنا پڑھانا محض لغو و لاطائل تھا، کلام اللہ و منتخب احادیث بخاری و مسلم و حصن حصین و حزب الاعظم اور ادعیہ ماثورہ کہ ہر وقت اور ہر جگہ بہم پہونچتے ہیں، اگر بعد فراغ حوائج انسانی اور ادائے نمازِ پنج گانہ کے کل اوقات اس کی تلاوت اور ذکر الٰہی میں صرف ہوں اور یہی شعار اور یہی دثار ہو تو کیا خوش طالعی اور کیسی خوش نصیبی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں حاصل ہیں، ایسی آسودگی اور فارغ البالی کہ یک ذرہ بھی لگاؤ دنیا اور اہل دنیا سے نہ رہا، مجھ جیسے آلودۂ علائقِ دنیا کو کہاں میسر تھی اور پھر اس وقت میں کوئی دنیا کی حسرت باقی نہیں رہی، اور آفتابِ عمر قریبِ غروب ہے اور اب تک حواس قائم اور عقل درست اور تندرستی ہے - توبہ و انابت و استغفار و طاعت و عبادت پروردگار کی اب تک باقی ہے، اگر یہ بقیۂ انفاس اسی میں گزر جاویں اور خاتمہ ایمان پر ہو تو نعمت دو جہانی حاصل ہے - امید احبابِ باصفا اور عزیزانِ بے ریا سے یہ ہے کہ یہی دعا میرے حق میں کریں - بعض حمقا اہلِ دنیا سے جب میرے واسطے یہ دعا کرتے ہیں کہ ابھی پھر وہی حکم حاصل ہو، اور وہی اوج موج اور وہی ڈنکا بجے یا بعضے سفہا یہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہی حکمرانی ہو جاوے، پھر اختیار ہے چند روز بعد چھوڑ دینے کا، تو میں بہت ہنستا ہوں ان کی خفت پر، کوئی حسنِ عاقبت کی دعا نہیں کرتا -

اللّٰھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا و اجرنا من خزی الدنیا وعذاب الاخرۃ - اللّٰھم اقسم لنا من الیقین ما تھون علینا مصائب الدنیا - اللّٰھم کما رزقتنی مما احب فاجعلہ قوۃ لی فیما تحب -

خداوندا! ہمارے تمام کاموں کا انجام اچھا کر، اور ہم کو دنیا کی ذلت اور عذاب آخرت سے نجات دے، خداوندا! ہم کو ایسا یقین دے جس سے مصائب دنیوی آسان ہو جائیں، خداوندا! جس طرح تو نے مجھ کو محبوب چیزیں عطا فرمائی ہیں اسی طرح اوس کو ان کاموں کے لیے ایک قوت بنا جو تجھ کو محبوب ہیں۔

عمل بر آن کما حقہ نشود آن وقت از دست رفت

اللّٰھم وما ذویت عنی مما احب فاجعلہ فراغاً لی فیما تحب۔

خداوندا! تو نے میری جن محبوب چیزوں کو مجھ سے دور کر دیا ہے ان کی جگہ وہ چیزیں عطا کر جن کو تو محبوب رکھتا ہے۔

حالا وقت آنست کہ امیدوار استجابت آن باشم

قال تعالیٰ: وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۝ (القصص: ۵۸)

اور کتنے گانوں جن کی زندگی فخر و غرور کی زندگی بن گئی تھی، ہم نے ان کو برباد کر دیا، پس ان کے یہ مکانات ہیں جن میں ان کے بعد بہت کم سکونت اختیار کی گئی، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔

یہ حال ہوا دہلی کا اور اہل دہلی کا:

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (النحل: ۱۱۲)

اور خدا نے ایک گاؤں کی یہ مثل بیان کی ہے، جو نہایت پُر امن تھا، اور جس میں ہر طرف سے رزق بافراط آتا تھا، لیکن جب اس نے کفران نعمت کیا تو خدا نے اس کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، یہ ان اعمال کے عوض میں تھا جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے[۲۱]

---

[۲۱] منقول از "معارف" اعظم گڑھ بابت ماہ مئی جون ۱۹۲۱ - ص ۴۴۶ تا ۴۵۰

## مفتی صاحب کا مکان اور ان کا حلیہ

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی تصنیف "دلی کی آخری شمع" میں مفتی صاحب کے مکان کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے اور ان کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

چیتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدر الدین کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک میٹا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے تھے۔ مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے۔ انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترہ ہے۔ چبوترہ کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی چھپن [۵۶] سال کی تھی۔ گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، بھری ہوئی داڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی تھے۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ بدن میں سفید ایک بر کا انگرکھا، سفید پاجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ تھا[۲۲]

## وفات

آخر عمر میں مرضِ فالج میں مبتلا ہو گئے تھے اور تمام علمی و تدریسی سرگرمیاں معطل ہو گئی تھیں۔ ایک یا دو سال اس مرض میں گرفتار رہے اور اسی حالت میں پنج شنبہ کے روز ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ (۱۱ دسمبر ۱۸۷۲ء) کو اس جہانِ فانی سے عالمِ آخرت کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اکاسی سال عمر پائی۔ اولاد سے محروم تھے[۲۳]

---

۲۲ علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۴ ص ۲۲۳ (حاشیہ)۔ بحوالہ "دلی کی آخری شمع"

۲۳ مفتی صدر الدین آزردہ کے حالات کے لیے یہ کتابیں دیکھیے: آثار الصنادید ص ۲۵۲ تا ۲۶۳ ــــ الیانع الجنی ص ۷۷ ــــ ابجد العلوم ص ۹۱۷ ــــ گلشن بے خار ص ۱۰، ۱۱ ــــ اتحاف النبلاء ص ۲۶۰ تا ۲۶۳ ــــ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱ تا ۴۸۴ ــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۹۳، ۹۴

# ۹۳- سیّد صفدر کشمیری

سید صفدر بن صالح حسینی رضوی کشمیری، شیخ و فاضل بزرگ تھے۔ شیعہ مسلک کے تھے اور مشاہیر علمائے شیعہ میں گردانے جاتے تھے۔ مولد و منشا ان کا کشمیر ہے، اس نواح کے نامور و ممتاز فقیہ تھے۔ مولانا محمد مقیم کشمیری کے شاگرد تھے۔ طویل مدت تک ان سے منسلک اور وابستہ رہے۔ فقہ و کلام اور نجوم و جفر وغیرہ علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ کبر سنی کے دور میں فرخ آباد گئے، بعد کو لکھنؤ کا عزم کیا اور لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔ زاہد و عفیف اور عبادت گزار تھے۔ کم گو اور کم خور تھے۔ "مجموع" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو تین جلدوں میں ہے اور مختلف فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔ مسائل پر عبور تھا اور اسلوب کلام موثر اور میٹھا تھا۔ تحریر میں بھی پختہ تھے اور بہتر انداز میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی کتاب "مجموع" اس کا ثبوت ہے۔

سید صفدر کشمیری نے جمعرات کے دن ۱۷ رجب ۱۲۵۵ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔[۵۲۴]

## چند اور فقہائے کرام

ص کی ردیف میں ان کے علاوہ چند اور فقہائے کرام کا ذکر بھی تذکرہ و رجال کی کتابوں میں مرقوم ہے۔

۱- شیخ صدیق بڑودھوی: یہ علاقہ گجرات کے شہر بڑودہ کے رہنے والے تھے، ولادت و تربیت اسی شہر میں ہوئی۔ شیخ و فاضل اور عالم و فقیہ تھے۔ والد کا اسم گرامی

---

نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۰، ۲۲۱ ــــ تذکرہ علمائے ہند اردو ترجمہ ص ۲۴۷ تا ۲۴۹ ــــ علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۴ ص ۲۱۹ تا ۲۳۱ ــــ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۹۵ ــــ علم و عمل ج ۱ ص ۲۷۴، ۲۷۵ ــــ گل رعنا ص ۳۲۷، ۳۲۸ (حاشیہ) ــــ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۲۵۰، ۲۵۱

۵۲۴ نجوم السماص نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۳

ابو صدیق تھا۔ گجرات کے معروف اساتذہ سے علم حاصل کیا اور فضل و صلاح میں ممتاز ہوئے۔ ارضِ حجاز بھی گئے اور حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ قیام مدینہ منورہ کے زمانے میں مولانا رفیع الدین مرادآبادی سے ملاقات ہوئی۔

۲۔ قاضی صدیق مارہروی: ان کے والد کا نام بزرگ علی تھا۔ فقہ اور اصول کے ماہرین میں سے تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ اپنے والدِ گرامی بزرگ علی سے جو علمائے وقت میں سے تھے، اخذِ علم کیا اور شہر ٹونک کے منصبِ قضا پر متعین ہوئے۔ نیک، پرہیزگار، خاموش طبع، بلند اخلاق، معزز و باوقار اور اونچے درجے کے فقیہ تھے۔ ۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۲۹۲ھ کو ٹونک میں رحلت فرمائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

۳۔ سید صفدر علی فیض آبادی: والد کا نام نامی سید حیدر علی تھا۔ شیعہ کے مشہور علما و فقہا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ "احسن الحدائق" کے نام سے چالیس کراسوں میں سورۂ یوسف کی تفسیر لکھی۔ یہ کتاب ۱۲۵۳ھ میں تصنیف کی۔

۴۔ شیخ صفی القدر سرہندی: والد کا نام عزیز القدر تھا، حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد سے تھے۔ ہمیشہ کتبِ تفسیر، حدیث اور فقہ کے مطالعہ میں مشغول رہتے۔ جمعرات کے دن ۲۵ شعبان ۱۲۲۶ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

# ط

## ۹۴- مولانا طیبّ کشمیری

مولانا طیب بن احمد بن مصطفٰی رفیقی کشمیری، دیارِ کشمیر کے مشائخ وصوفیا اور فضلا وفقہا میں سے تھے۔ ۱۰۹۱ھ میں ولادت ہوئی، قرآن مجید مولانا خیر الدین کشمیری سے پڑھا، کتبِ درسیہ اپنے والدِ محترم، چچا اور چچا کے بیٹوں سے پڑھیں۔ اس خاندان کے سب لوگ علم وکمال میں یگانۂ روزگار تھے۔ تصوف وسلوک سے بھی انھیں بہرۂ وافر حاصل تھا۔

مولانا طیب رفیقی نے اپنی خاندانی روایت کے مطابق علم کے تمام شعبوں میں دسترس حاصل کی اور نام پایا۔ فقہی مسائل میں بھی عبور تھا اور معرفت وطریقت میں بھی منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ پارسا اور صاحبِ تقویٰ تھے۔ قائم اللیل اور صائم النہار تھے۔ زہد وعبادت میں اپنی مثال آپ تھے۔

مطالعۂ کتب ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ ہمیشہ حدیث وفقہ کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ درس وافادۂ طلبا کا سلسلہ بھی تھا اور زیادہ وقت اسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ فتویٰ نویسی اور مسائل سے آگاہی میں یکتا تھے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں اور علم کے ہر میدان میں شہرت پائی۔ کشمیر کے اس محدث وفقیہ کی نظر بہت وسیع تھی اور علمِ ظاہری وباطنی سے بہرہ ور تھے۔ پیر کے روز ۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ کو رحلت فرمائی[1]

---

[1] حدائق الحنفیہ ص ۴۷۵ — نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۴، ۲۲۵ — تذکرہ علمائے ہند ص ۹۹

# ظ

## ۹۵- مولانا ظفر احمد لکھنوی

مولانا ظفر احمد ولد قدرت علی انصاری لکھنوی کی ولادت اور تربیت لکھنؤ میں ہوئی، اپنے والدِ مکرم مولانا قدرت علی لکھنوی اور دیگر علمائے عصر سے اکتسابِ علم کیا، اور فقہ و اصول اور دیگر علوم میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ اپنے والد کی سب سے بڑی اولاد تھے۔

جو علمی و فقہی خدمات انھوں نے انجام دیں، ان کی وجہ سے اپنے علاقے اور معاصرین میں احترام و اعزاز کے مستحق گردانے گئے۔ فقہی نوعیت کی فتویٰ نویسی میں خصوصیت سے مشہور تھے۔ ان کے والد بھی عالم و فاضل بزرگ تھے اور فقہ میں درک رکھتے تھے، لائق بیٹا بھی ان سے بہت متاثر ہوا، باپ کے نقشِ قدم پر چلا اور زمانے میں نام پایا۔

جس خاندان سے یہ تعلق رکھتے تھے، اس کے تمام افراد کئی پشت سے اصحابِ علم چلے آرہے تھے۔ اللہ نے اولاد کو بھی اپنے اسلاف کی خوبیوں سے نوازا اور علم و فضل کی دولتِ بے پایاں سے سرفراز کیا۔

مولانا ظفر احمد انصاری لکھنوی نے ۱۲۶۶ھ میں انتقال کیا۔[۱]

## ۹۶- مولانا ظہور الحق فرنگی محلی

خانوادۂ فرنگی محل کے جن علما و فقہا نے شہرت و ناموری حاصل کی، ان میں مولانا ظہور الحق انصاری کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ والد کا نام مولانا ابرار الحق

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۵

انصاری لکھنوی تھا، جو علم و فضل میں ممتاز تھے۔

مولانا ظہور الحق انصاری لکھنوی کا شمار نیک اور متقی علما میں ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ قرآنِ مجید حفظ کیا اور اپنے والدِ محترم مولانا انہار الحق سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ بحر العلوم مولانا عبد العلی انصاری فرنگی محلی جو برصغیر کے جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت فقیہ تھے، ان کے نانا تھے، ان سے بھی اکتسابِ علم کیا اور علما و فقہا کی جماعت میں درجۂ امتیاز کو پہنچے۔

اخذِ علم کے بعد طلبِ معاش اور حصولِ رزق کے لیے کلکتہ، مدراس اور حیدر آباد کے طویل اور تکلیف دِہ سفر کیے۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے، حتیٰ کہ جو قرض ان کے ذمے تھا، وہ بھی ادا نہ ہوا اور لمبی چوڑی پُر مشقت مسافت کے باوجود مقروض ہی رہے۔ سخی، جواد، کریم النفس اور عمدہ خصالِ عالم تھے۔ اپنی عزتِ نفس کو ہر قیمت پر محفوظ رکھتے تھے، دین کو کبھی دنیا کی چوکھٹ پر نہیں جھکایا۔ خود دار اور بلند ہمت فقیہ تھے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ ان علومِ شرعی کے مقابلے میں یونانی علوم منطق و فلسفہ وغیرہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

تیرھویں صدی ہجری کے یہ عالم و فقیہ بہت سی خوبیوں کے مالک اور متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے اور اس پر مطمئن تھے۔ توکل اور قناعت ان کا شیوہ تھا۔ جیّد عالم تھے اور مسجدیں وقت گزرتا تھا۔[۵۲]

## ۹۷۔ مولانا ظہور الحق پھلواروی

مولانا ظہور الحق بن نور الحق بن عبد الحق بن مجیب اللہ ہاشمی جعفری پھلواروی،

---

[۵۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۹ —— تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۷۹، ۸۰
نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۶ —— احوالِ علمائے فرنگی محل ص ۳۵، ۳۶

اپنے زمانے کے صالح عالم دین اور اونچے مرتبے کے شیخ تھے۔ برصغیر کے فقہائے حنفیہ میں عزت و تکریم کے مالک تھے۔ ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور مولانا جمال الدین ڈھروی سے کسبِ علم کیا۔ پھر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں دہلی گئے اور ان سے علمِ حدیث کی سند حاصل کی۔ ان کے والدِ گرامی مولانا نور الحق پھلواروی بھی اپنے عہد کے شیخ اور عالم تھے، ان سے اخذِ طریقت کیا، اور عرصے تک ان کے فیضِ صحبت میں رہے۔

یہ خاندان اصلاً پھلواری کا رہنے والا تھا اور اس کے اکابر وہیں اقامت گزین تھے، لیکن ۱۲۳۰ھ میں مولانا ظہور الحق اپنے والدِ گرامی کو ساتھ لے کر پھلواری سے عظیم آباد (پٹنہ) منتقل ہو گئے تھے اور پھر وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

مولانا ظہور الحق پھلواروی کثیر الدرس عالم تھے اور بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ فقہ اور سلوک میں بالخصوص درک تھا۔ اس موضوع سے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اس نامور عالم و فقیہ اور ممتاز صاحبِ سلوک و طریقت بزرگ نے ۱۶ ذی قعدہ ۱۲۳۴ھ کو عظیم آباد میں انتقال کیا اور ان کی میت پھلواری منتقل کی گئی [۵۳]

## ۹۸- مولانا ظہور علی انصاری لکھنوی

مولانا ظہور علی بن حیدر انصاری لکھنوی، فقہ و اصول کے ماہرین میں سے تھے۔ لکھنؤ میں ولادت ہوئی اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے والد مولانا حیدر اور مفتی ظہور اللہ لکھنوی اور دیگر علمائے عصر کے حلقۂ شاگردی میں رہے۔ عالمِ جوانی میں قرآنِ مجید حفظ کیا اور طویل عرصے تک لکھنؤ میں درس و تدریس کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

---

۵۳ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۶ بحوالہ شجرۂ شیخ بدر الدین

ان کے والد مولانا حیدر لکھنوی حیدر آباد میں مقیم تھے، ان کی وفات کے بعد لائق بیٹے نے حیدر آباد کا عزم کیا اور پھر وہیں سکونت اختیار کرلی۔ حیدر آباد کی سرکار میں مولانا حیدر کو بہت اعزاز و اکرام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، مولانا ظہور علی بھی ان تمام صلات و جوائز کے مستحق قرار پائے، جن سے باپ بہرہ مند تھے۔

مولانا ظہور علی انصاری مصنف بھی تھے۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان سے یادگار ہیں:

۱۔ تفسیر قرآن کریم۔

۲۔ الطریقۃ الوسطیٰ فی سماع الموتیٰ۔

۳۔ معراجیہ۔

۴۔ شرح علیٰ خطبۃ شرح السلم۔

اس عالم و فقیہ نے سلخ رمضان ۱۲۷۵ھ کو حیدر آباد میں انتقال کیا۔[۵۷]

## ۹۹۔ مفتی ظہور اللہ انصاری فرنگی محلی

مفتی ظہور اللہ بن مولانا محمد ولی بن مفتی غلام مصطفیٰ انصاری فرنگی محلی، اپنے عصر کے معروف عالم تھے۔ یوں تو تمام علوم مروجہ پر عبور تھا، لیکن علمِ فقہ میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ ۱۱۴۰ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور علم و معرفت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد مولانا محمد ولی اور عمِ محترم ملا حسن سے تحصیلِ علم کی اور جلیل القدر علما میں شمار ہوئے۔ اس زمانے میں نواب سعادت علی خاں علاقۂ اودھ کا حکمران تھا، ان کی شہرتِ علمی اس کے کانوں میں پہنچی تو عہدۂ افتا پیش کیا، جو اس وقت ایک عظیم عہدہ تھا اور اسی عالم کو تفویض کیا جاتا تھا جو دیگر علوم کے علاوہ علمِ فقہ میں بھی درک رکھتا ہو۔ کچھ عرصہ اس عہدے پر متعین رہے، پھر بعض وجوہ کی بنا پر جن کا تذکرہ نگاروں نے ذکر نہیں کیا، اس عہدے سے معزول کردیے گئے۔ معزولی کے بعد نواب سعادت علی

---

[۵۷] نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۶، ۲۲۷

خاں کے نائب حکیم مہدی علی خاں کی رفاقت میں رہے اور اس کی سفارش سے نواب مذکور کی سرکار سے بیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ سعادت علی خاں کی وفات کے بعد زمامِ حکومت اس کے بیٹے غازی الدین حیدر نے ہاتھ میں لی تو مفتی ممدوح کو پھر اسی عہدے پر مامور کر دیا گیا۔

مفتی ظہور اللہ انصاری درس و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے اور حکومتِ اودھ کی طرف سے منصبِ افتا کی ذمے داریاں بھی ان کے سپرد تھیں۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا، جن میں مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا شاہ احمد سعید دہلوی، مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی، مولانا حیدر علی فیض آبادی، مولانا مسیح الدین کاکوروی، مولانا عبد المجید بدایونی، مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی اور مولانا ثابت علی پھکوی الہ آبادی ایسے بہت سے اکابر فضلا شامل ہیں۔

مفتی صاحب بہت اچھے مصنف اور شارح بھی تھے۔ متعدد درسی کتابوں پر حواشی و تعلیقات سپردِ قلم کیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

۱- حاشیہ میر زاہد
۲- حاشیہ میر زاہد ملا جلال
۳- حاشیہ میر زاہد شرح المواقف
۴- حاشیہ الدوحۃ المیادہ فی الصورۃ والمادہ — از جون پوری

مفتی ظہور اللہ اپنے عہد میں درس و تدریس، حواشی و تعلیقات اور افتا میں بہت مشہور تھے اور علما و طلبا میں قدر و منزلت رکھتے تھے۔ ۱۲۵۶ھ میں فوت ہوئے[۵]

---

[۵] تذکرہ علمائے ہند ص ۹۹، ۱۰۰ — تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۴۷ تا ۷۶ — نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۲۷، ۲۲۸ — احوال علمائے فرنگی محل ص ۳۶، ۳۷

# ۱۰۰۔ سید ظہور محمد کالپوی

سید ظہور محمد بن خیرات علی بن حسین علی حسینی ترمذی کالپوی، علمائے ربانی میں سے تھے اور نہایت نیک اور متقی بزرگ تھے۔ ۱۲۱۳ھ کو کالپی میں پیدا ہوئے اور مختصرات اپنے شہر کے اساتذہ سے پڑھیں۔ اس کے بعد عازم لکھنؤ ہوئے، وہاں مولانا ولی اللہ انصاری فرنگی محلی اور مولانا حیدر انصاری فرنگی محلی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شرکت کی اور کتب درسیہ پڑھیں۔

اس زمانے میں مرزا حسن علی شافعی لکھنوی کا شہرۂ علمی دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور وہ اپنے عہد کے بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ سید ظہور محمد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے نور الانوار، ہدایۃ الفقہ، شرح نخبۃ الفکر، اصولِ حدیث سے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ایک رسالہ، موطا امام مالک، بلوغ المرام، صحیح مسلم کا کچھ حصہ، صحیح بخاری کا کچھ حصہ اور حصن حصین کا درس لیا اور سند و اجازہ سے سرفراز ہوئے۔ مرزا حسن علی نے ۲۷ شعبان ۱۲۴۸ھ کو باندہ میں ان کو ان کتابوں کی سند و اجازہ سے متفخر فرمایا۔

اس کے بعد دہلی گئے، وہاں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی کا معرکۂ درسِ حدیث جاری تھا، اس میں شرکت کی اور سند و اجازہ سے بہرہ ور ہوئے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ۷ شوال ۱۲۳۹ھ کو اور شاہ غلام علی دہلوی نے ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ کو وفات پائی۔ ان دونوں حضرات کی وفات کے وقت سید ظہور محمد دہلی میں تھے۔

۱۲۵۰ھ کو سفرِ حجاز اختیار کیا اور حج و زیارت سے متمتع ہوئے۔ چودہ مہینے مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ اس زمانے میں وہاں مولانا محمد عابد سندھی (متوفی ۱۷ ربیع الاوّل ۱۲۵۷ھ) درس دیتے تھے، ان کی خدمت میں گئے اور ان سے صحیحین کا درس لیا۔

سید ظہور محمد کالپوی تیرھویں صدی ہجری کے جید عالم، نامور فقیہ، بلند مرتبہ شیخ اور معزز و محترم بزرگ تھے۔ ۲۷ شعبان ۱۲۸۸ھ کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے[۵۶]

---

۵۶ تقصار جیود الاحرار ص ——— نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۲۸

# مراجع ومصادر

اس کتاب کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔


۱۔ ابجد العلوم : نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقی، بھوپال - ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء

۲۔ ابقاء المنن بالقاء المحن : نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور - ۱۲۸۸ھ

۳۔ ۱۸۵۷ء : میاں محمد شفیع۔ مکتبۂ جدید، لاہور - ۱۹۵۷ء

۴۔ ۱۸۵۷ء : غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور - ۱۹۵۷ء

۵۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ : عبداللطیف۔ ترتیب وترجمہ: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء

۶۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد : غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور - ۱۹۵۷ء

۷۔ آثار الاُوَل من علماء فرنگی محل : عبدالباری فرنگی محلی۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔

۸۔ آثار الصنادید : سرسید احمد خاں۔ ترتیب وحواشی: ڈاکٹر معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی - ۱۹۶۶ء

۹۔ احوال علمائے فرنگی محل : شیخ الطاف الرحمٰن۔ مطبع مجتبائی، لکھنؤ۔

۱۰۔ اذکار الابرار : شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ، ۱۳۵۷ھ

۱۱۔ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری : ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ مجلس ترقی ادب، لاہور - ۱۹۷۲ء

۱۲۔ اردوئے معلّٰی : مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ تدوین وحواشی: سید مرتضٰی حسین فاضل۔ مجلس ترقی ادب، لاہور - ۱۹۶۹ء

۱۳۔ اسلامی مجلس مذاکرہ علمیہ کلکتہ سال ہشتم : مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۷۰ء

۱۴۔ انوار العارفین : محمد حسین مراد آبادی۔ مطبع صدیقی، بریلی - ۱۲۹۰ھ

۱۵۔ انواع بارک اللہ : حافظ بارک اللہ لکھوی۔ مطبع وکٹوریہ پریس، لاہور - ۱۸۹۱ء

۱۶- امداد المشتاق : (حالات و مکتوبات حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی) مرتبہ مولانا اشرف علی تھانوی - تھانہ بھون - ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۹ء

۱۷- ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما : انتظام اللہ شہابی - طبع دہلی - ۱۹۴۶ء

۱۸- باغی ہندوستان : عبدالشاہد خاں شروانی - مکتبۂ قادریہ لاہور - ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء

۱۹- برکات الاولیا : امام الدین گلشن آبادی - افضل المطابع، دہلی - ۱۳۲۲ھ

۲۰- بزمِ تیموریہ : صباح الدین عبدالرحمٰن - دار المصنفین، اعظم گڑھ - ۱۹۴۹ء

۲۱- بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہدِ آزادی : (۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء) عبداللہ ملک - مجلس ترقی ادب، لاہور - ۱۹۶۷ء

۲۲- بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد : رئیس احمد جعفری - کتاب منزل، لاہور

۲۳- بوستانِ اخیار : سعید احمد مارہروی - طبع آگرہ - ۱۳۳۱ھ

۲۴- پنجابی ادب دی کہانی : عبدالغفور قریشی، طبع لاہور

۲۵- پنجابی شاعراں دا تذکرہ : مولا بخش کشتہ - پاکستان پرنٹنگ پریس، لاہور - ۱۹۶۰ء

۲۶- التاج المکلل : نواب صدیق حسن خاں - طبع ثانی، ناشر، شرف الدین و اولادہ، بمبئی - ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء

۲۷- تاریخِ اودھ : حکیم نجم الغنی رام پوری - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۹۱۹

۲۸- تاریخ اولیائے دہلی : احمد سعید دہلوی - محبوب المطابع برقی پریس، دہلی - ۱۹۵۴ء

۲۹- تاریخ برہان پور : خلیل الرحمٰن - مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۱۷ھ

۳۰- تاریخ پرگنہ مکتسر و ممدوٹ : سید نثار علی - مطبوعہ وکٹوریہ پریس، لاہور - ۱۸۷۳ء

۳۱- تاریخ شاہ جہان پور : محمد صبیح الدین شاہ جہان پوری - نامی پریس، لکھنؤ - ۱۹۳۲ء

۳۲- تاریخ شیرازِ ہند جون پور : سید اقبال احمد - شیرازِ ہند پبلشنگ ہاؤس، جون پور - ۱۹۶۳ء

۳۳- تاریخ لاہور: کھنیا لال - مجلس ترقی ادب، لاہور- ۱۹۷۶ء
۳۴- تاریخ مشائخ چشت: خلیق احمد نظامی - ندوۃ المصنفین، دہلی- ۱۹۵۳ء
۳۵- تاریخی مقالات: خلیق احمد نظامی - ندوۃ المصنفین، دہلی- ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء
۳۶- تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر- عزیز المطابع، حیدر آباد (دکن)- ۱۳۲۲ھ
۳۷- تجلی نور المعروف تذکرہ مشاہیر جون پور: نور الدین زیدی- مطبع اعظم المطابع، جون پور- ۱۸۸۹ء
۳۸- تحفۂ کشمیر: منشی گنیش لال دہلوی- مطبع کوہ نور، لاہور- ۱۸۵۳ء
۳۹- تحقیقاتِ چشتی: نور احمد چشتی- پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور- ۱۹۶۴ء
۴۰- تذکرۃ الشعرا: امیر دولت شاہ- مطبع مجیدی، کان پور- ۱۳۲۶ھ
۴۱- تذکرہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی: سید احمد قادری- آزاد پریس، پٹنہ
۴۲- تذکرہ صوفیائے بنگال: اعجاز الحق قدوسی- مرکزی اردو بورڈ، لاہور- ۱۹۶۵ء
۴۳- تذکرہ علمائے اعظم گڑھ: مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی- جامعہ اسلامیہ، بنارس۔
۴۴- تذکرۃ العلما والمشائخ: محمد الدین فوق- گلزار اسٹیم پریس، لاہور- ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء
۴۵- تذکرہ علمائے پنجاب: اختر راہی- مکتبہ رحمانیہ، لاہور- ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۱ء
۴۶- تذکرہ علمائے فرنگی محل: محمد عنایت اللہ- طبع لکھنؤ- ۱۹۳۰ء
۴۷- تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی- مطبع نول کشور، لکھنؤ- ۱۹۱۴ء
۴۸- تذکرہ علمائے ہند: رحمان علی- ترجمہ و حواشی: ڈاکٹر محمد ایوب قادری- پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی- ۱۹۶۱ء
۴۹- تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر- مطبع اصح المطابع، لکھنؤ- ۱۹۲۷ء
۵۰- تراجم علمائے حدیث ہند: ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی- جیّد برقی پریس، دہلی- ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء
۵۱- تفسیر ابنِ کثیر: حافظ ابن کثیر- طبع لاہور- ۱۹۷۲ء
۵۲- تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی- اشاعت العلوم، دہلی

1993

۵۳ - تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار : نواب صدیق حسن خاں - مطبوعہ بھوپال - ۱۲۹۸ھ

۵۴ - الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند : سید عبدالحی حسنی لکھنوی - طبع دمشق - ۵۸

۵۵ - جماعتِ مجاہدین : غلام رسول مہر - کتاب منزل، لاہور - ۱۹۵۵ء

۵۶ - جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء : ڈاکٹر محمد ایوب قادری - پاک اکیڈمی حیدر آباد، کراچی - ۱۹۷۶ء

۵۷ - حدائق الحنفیہ : مولوی فقیر محمد جہلمی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

۵۸ - حدیقۃ الاولیا : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۷۷ء

۵۹ - حیاتِ شبلی : سید سلیمان ندوی - دار المصنفین، اعظم گڑھ - ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء

۶۰ - حیات العلما : سید عبدالباقی سہسوانی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء

۶۱ - حیاتِ ولی : مولانا رحیم بخش دہلوی - مکتبۂ سلفیہ، لاہور - ۱۹۵۵ء

۶۲ - خزینۃ الاصفیا : مفتی غلام سرور لاہوری - مطبع نامی گرامی موسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ - ۱۲۹۰ھ

۶۳ - رودِ کوثر : شیخ محمد اکرام - ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۵ء

۶۴ - روضۃ الابرار : محمد الدین - سراج المطابع، جہلم - ۱۳۰۲ھ

۶۵ - سید احمد شہید : غلام رسول مہر - کتاب منزل، لاہور - ۱۹۵۴ء

۶۶ - سیر المتاخرین : غلام حسین طباطبائی - نول کشور، لکھنؤ - ۱۲۸۲ھ

۶۷ - طرب الاماثل بتراجم الافاضل : مولانا عبدالحی لکھنوی - مطبع یوسفی، لکھنؤ - ۱۹۲۱ء

۶۸ - علمائے ہند کا شاندار ماضی : مولانا محمد میاں - مکتبۂ محمودیہ، لاہور - ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء

۶۹ - علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) : مرتبہ، محمد ایوب قادری - آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی - ۱۹۶۰ء

۷۰ - فتاویٰ عزیزی : شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی - ترتیب، مولانا محمد احسن نانوتوی -

مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء

۷۱۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ : مولانا عبدالحی لکھنوی۔ طبع مصر۔ ۱۳۲۴ھ

۷۲۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب : مولوی ذوالفقار احمد۔ مفید عام پریس، آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ

۷۳۔ کلماتِ طیبات : ابوالخیر بن احمد مرادآبادی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۰۹ھ

۷۴۔ گل رعنا : سید عبدالحلیم حسنی۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ طبع سوم۔ ۱۹۶۴ء

۷۵۔ مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والاجاہی : سید محمد علی حسن خاں۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۲۴ء

۷۶۔ مالا بد منہ : قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ مطبع محمدی۔

۷۷۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل : طفیل احمد منگلوری۔ طبع لاہور

۷۸۔ معارف (ماہنامہ) اعظم گڑھ۔

۷۹۔ معمولاتِ مظہریہ : مولانا نعیم اللہ علوی بہرائچی۔ مطبع محمدی، لاہور۔ ۱۳۱۰ھ

۸۰۔ مفید المفتی : مولانا عبدالاوّل جون پوری، مکتبہ غوثیہ، ملتان۔ ۱۴۰۱ء

۸۱۔ مقامات مظہری : شاہ غلام علی مجددی۔ مطبع احمدی، دہلی۔ ۱۲۶۹ھ

۸۲۔ مکمل تاریخ کشمیر : (حصہ سوم) محمد الدین فوق۔ طبع لاہور۔ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء

۸۳۔ منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء : (قلمی)۔ سید جعفر علی نقوی۔ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔

۸۴۔ نزہۃ الخواطر (جلد ہفتم) : سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد (دکن) ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء

۸۵۔ واقعات دارالحکومت دہلی : بشیرالدین احمد دہلوی۔ شمسی مشین پریس، آگرہ۔ ۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء

۸۶۔ الیانع الجنی : محمد بن یحیٰی المدعو بہ محسن تیمی بکری ترہتی۔ مطبع صدیقی، بریلی۔ ۱۲۸۷ھ

## اسی مصنف کے قلم سے

۱- فقہائے ہند (جلد اول)
۲- فقہائے ہند (جلد دوم)
۳- فقہائے ہند (جلد سوم)
۴- فقہائے ہند (جلد چہارم ، حصہ اول)
۵- فقہائے ہند (جلد چہارم ، حصہ دوم)
۶- فقہائے ہند (جلد پنجم ، حصہ اول)
۷- فقہائے ہند (جلد پنجم ، حصہ دوم)

ان تمام جلدوں پر الگ الگ مقدمہ بھی لکھا گیا ہے ، جس میں ان کے دور کے ملوک و سلاطین کے سیاسی حالات اور ان سے علما و فقہا کے تعلقات و مراسم کی وضاحت کی گئی ہے -

# ڈاکٹر شیخ محمد اکرام (مرحوم) کی تصانیف

## آبِ کوثر

اس کتاب میں سرزمینِ پاک و ہند میں اسلام کی آمد (۷۱۱ء) اور فتحِ سندھ یعنی محمد بن قاسم سے لے کر خاندان لودھی (۱۵۲۶) تک کے عہد بعہد حالات بیان کیے گئے ہیں۔ آٹھ سو سال کے اس طویل عرصے میں برِصغیر پاک و ہند میں جو علما و فقہا اور صوفیہ و اولیا پیدا ہوئے اور انھوں نے جو خدمات انجام دیں، اس کتاب میں ان کا مفصل تذکرہ ہے۔ پھر ان ادوار کے ملوک و سلاطین سے ان کے تعلقات و مراسم کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

## رودِ کوثر

اس میں عہدِ مغلیہ سے لے کر سرزمینِ برِصغیر پاک و ہند پر انگریزوں کے قابض ہونے تک کے واقعات معرضِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ ہر مغل حکمران کے عہد میں علما و مشائخ اور صوفیہ نے جو خدمات انجام دیں اور ان سے جو نتائج برآمد ہوئے، ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

## موجِ کوثر

اس میں مسلمانِ برِصغیر کی ان علمی اور فکری مساعی کو اجاگر کیا گیا ہے جو انھوں نے انگریزی حکومت کی گرفت میں آنے کے بعد مختلف انداز میں انجام دیں۔ اس سلسلے میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقائے عظام کی تحریکِ جہاد، سید احمد خان کی تعلیمی کاوشوں، جامعہ ملیہ کے قیام، ندوۃ العلما کی تاسیس اور دارالعلوم دیوبند کے علمی کارناموں کو خصوصیت سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا عبیداللہ سندھی اور دیگر علما و زعما کی علمی تگ و تاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔


مکمل فہرستِ کتب مفت طلب فرمائیے

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور